1857
برطانوی مظالم کی کہانی
محمد عبدالحکیم خاں اختر شاہجہانپوری کی زبانی

برطانوی مظالم کی کہانی

عبدالحکیم خاں اختر شاہجہانپوری کی زبانی

مشعلِ راہ

(ا)

ملنے کا پتہ

فرید بُک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور ۲

نام کتاب ——— دری کی زبانی

مصنف ——— عبدالحکیم خان اختر شاہجہانپوری مظہری

کاتب ——— محمد شریف گل

ضخامت ——— ۱۸×۲۳/۸ ، ۱۰۰۸ صفحات

اشاعت ——— بار اول

مطبع ——— جنرل پرنٹرز لاہور

ناشر ——— علامہ اختر شاہجہانپوری

قیمت ——— / روپے

——— ملنے کا پتہ ———

فرید بک سٹال ۔ اردو بازار لاہور

انتساب

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فخرِ خاندان و نادرِ روزگار نے اپنے گھر سے جب اپنے بھتیجے مولوی اسمٰعیل کے ہاتھوں فتنۂ وہابیت کا ظہور دیکھا تو بقولِ مصنف فریاد المسلمین فرمایا تھا کہ "میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو، کہ جو کتاب بھیجی ہے آئی ہے میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے اُس کے عقاید صحیح نہیں، بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں آج کل بیمار ہوں، اگر صحت ہوگئی تو میں اس کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم ابھی نوجوان بچے ہو ناحق شور و شر برپا نہ کرو۔"

موصوف کے دوسرے چچا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مولوی اشرف علی تھانوی فرمایا تھا۔ "بابا! ہم تو سمجھتے تھے کہ اسمٰعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں جانتا۔"

رئیس المبتدعین صاحب کی ابتدائی کارگزاری کے تیور دیکھتے ہی شہنشاہِ اقلیم منطق حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مرزا حیرت دہلوی فرمایا تھا۔ "اسمٰعیل ابن محمد کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔" اس کے بعد علامہ خیرآبادی نے تحقیق الفتوٰی فی ابطال الطغوٰی لکھ کر اس فتنے کو پامال کیا اور شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم نے معید الایمان اور الحجۃ العمل فی ابطال الحیل تصنیف کر کے اپنی گھر سے اٹھی ہوئی اس پُراسرار شرارت کی بیخ کنی فرمائی۔

احقر مذکورہ حضرات کی ایمانی فراست کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی ناچیز کاوش کو ان پانچوں بزرگوں سے منسوب کرتا ہے۔

اختر شاہجہانپوری مظہری عفی عنہ

فہرس

باب چہارم ۶۶۳

باب پنجم ۷۸۵

مناجات

المدد اے خدا، سب کے حاجت روا، آج ایماں کی جان خطرے میں ہے
رہزنِ دین بننے لگے رہنما، حق پرستوں کا ایمان خطرے میں ہے

یُوں تو آزاد ہیں، حکمرانی بھی ہے، یُوں تو سکّہ کی اپنے روانی بھی ہے
درحقیقت ہیں محکوم کفّار کے، اہلِ اسلام کی آن خطرے میں ہے

جن کے زیرِ نگیں ہفت کشور ہُوئے، قسمتِ اقوامِ عالم کی لکھتے رہے
آج ہیں کفر کے زیرِ فرماں وہی، قوم کی شوکت و شان خطرے میں ہے

تھے جو پیکر کبھی عدل و انصاف کے، تھے جو پُتلے کبھی حُسنِ اَخلاق کے
آج وُہ ہو گئے ننگِ انسانیت، اَوج کا ساز و سامان خطرے میں ہے

آج اپنی خلافت بنی خواب ہے، کشتیٔ شانِ مسلم ہی غرقاب ہے
خود ہی آپس میں دست و گریباں ہیں، جس سے ہر میرو سلطاں خطرے میں ہے

آہ کشمیر، قبرص، فلسطین میں یا اِری ٹیریا، رُوس اور چین میں
حق کی خاطر مسلماں کھولیں زباں، جسم خطرے میں ہے جان خطرے میں ہے

عہدِ انگریز کی سب سے لعنت بڑی، تھا جو دکٹوریہ نے بنایا نبی
اُس کے اب پیروکار اِس قدر ہو گئے، جس سے نظمِ گلستاں خطرے میں ہے

لیڈروں کے نرالے ہی اطوار ہیں، کہتے ہیں قوم کے یار و غمخوار ہیں
قومیت کو مٹاتے ہیں کُچھ اِس طرح، دین کا ہر نگہباں خطرے میں ہے

ناچ گانے غضب آج محبوب ہیں، آہ اُمّ الخبائث کے مشروب ہیں
ہو رہی ہیں امیروں میں خرمستیاں، دورِ حاضر کا انساں خطرے میں ہے

رہزنوں کا ہوا گرم بازار ہے، رہنماؤں سے اب قوم بیزار ہے
غیرتِ دین و ایماں کا بیوپار ہے، آج سچّا مسلماں خطرے میں ہے

کیسے تفسیر و تفہیم کے نام سے ، کیسے فکر و تدبر نما دام سے
یوں مطالب بتاتے ہیں آیات کے ، جس سے مفہومِ قرآں خطرے میں ہے

مصطفیٰ کے فرامین وردِ زباں ، مصطفیٰ کی اُنھیں سے کریں کسرِ شاں
کس غضب کی ہیں یہ شوخیاں الاماں ، تیرے پیارے کا فرمان خطرے میں ہے

اہلِ اسلام کو منتشر کر دیا ، اب تو ہر فرد ہے ایک فرقہ جدا
دشمنانِ نبی بن گئے اولیا ، آج سچوں کی پہچان خطرے میں ہے

ہم نے مانا کہ بیشک خطاکار ہیں ، مالکِ دوجہاں ! ہم گنہگار ہیں
اُمتی ہیں مگر تیرے محبوب کے ، اُمتِ شاہِ ذیشان خطرے میں ہے

بہرِ شاہِ اُمم ہو نگاہِ کرم ، پھر ترقی کرے قوم یہ دم بدم
شان و شوکت سے اختر بھی چمکے ترا ، ذوالمنن! آہ پاکستان خطرے میں ہے

اختر شاہجہان پوری مظہری غفرلہ
لاہور

استغاثہ

(بحضورِ سراپا نور، شافعِ یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

نگاہِ رحمت ، چشمِ عنایت ، یا رسول اللہ
پریشاں حال ہیں ہم اہلسنت ، یا رسول اللہ
اٹھا رکھا ہے سر پر حشر تخریب کاروں نے
بظاہر بن کے ہمدردانِ ملت ، یا رسول اللہ
وہ، جو ہیں صاحبانِ جبّہ و دستار کہلاتے
بہ باطن آپ سے جن کو عداوت ، یا رسول اللہ
وہ، چہرہ جن کا مومن کا مگر دل ہے ابوجہلی
ہے اُجلا جن کا تن ، گندی ہے نیت، یا رسول اللہ
زباں پر نعرۂ توحید دل ایمان سے خالی
ہے کلمہ لب پہ اور دل میں کدورت، یا رسول اللہ
وہ، جو ہیں آپ کی تعظیم اور تکریم کے منکر
وہ گستاخانِ دربارِ رسالت ، یا رسول اللہ
یہ رہزن ، راہبر بن کر نکل آئے ہیں میداں میں
کریں کس طرح ہم اپنی حفاظت ، یا رسول اللہ
ہمارے اہلِ حق باہم گریباں وگریباں ہیں
انھیں کب اپنے ہے جھگڑوں سے فرصت یا رسول اللہ
مقابل دشمنانِ دین کے جو مردِ میداں تھے
وہ ہیں شیرِ نیستانِ سیاست یا رسول اللہ

سجا تھا جن کے تن پر جامۂ اَلْفَقْرُ فخری میں
ہے اب زر کی تگ و دَو اُن کا خلعت یا رسول اللہ

کسی کو حرص ہے درکار خوشنودی امیروں کی
کسی کو حرص کرسی کی ضرورت یا رسول اللہ

انھیں میں سے نئے فیشن کے کچھ مفتی معاذ اللہ
مسائل میں بھی کر بیٹھے ہیں جدت یا رسول اللہ

ہمارے رہبرانِ دین وملت کی یہ حالت ہے
کہیں کس سے ہم اپنے دل کی حالت یا رسول اللہ

لگے ہیں دشمنانِ دیں اِدھر تخریب کاری پر
مکدر ہے فضائے دین و سنت یا رسول اللہ

درِ والا پہ اختر استغاثہ لے کر آیا ہے
حبیبِ حق ، شہنشاہِ رسالت یا رسول اللہ

مدینے سے اُٹھے پھر ابرِ رحمت یا رسول اللہ
کرم ہو پھر بشکلِ اعلیٰحضرت یا رسول اللہ

(صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم)

از اختر الحامدی الرضوی مدظلہٗ

حیدرآباد

سخن ہائے گفتنی

وہ محرکات جو اِس کتاب کی تصنیف کا باعث بنے اوّلاً اُن کا قارئین کے سامنے اظہار کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، ویسے وجوہات حسب ذیل ہیں:

۱- باری تعالیٰ شانہٗ کے فضل و کرم اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظرِ عنایت سے اِس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ سے تعلق خاطر ہے اور رشتۂ عقیدت و نیاز مندی حاصل ہے۔ اِس بنا پر نہیں کہ راقم الحروف نے اعلیٰحضرت بریلوی سے براہِ راست فیض حاصل کیا تھا، کیونکہ امام موصوف کا ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء میں وصال ہو گیا تھا اور احقر کا سنِ پیدائش ۱۹۲۵ء ہے۔ امام احمد رضا کے ساتھ دُوسرا کوئی عام رشتہ بھی نہیں ہے جبکہ آپ مولداً بریلوی، نسباً پٹھان اور مشرباً قادری تھے اور راقم مسطور مولداً شاہجہانپوری نسباً راجپوت اور مشرباً نقشبندی مجددی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگرچہ برائے نام ہی سہی۔ ہاں فاضل بریلوی کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ موصوف کو عرب و عجم کے عمائدِ دین و ملت یعنی اکابر علمائے اہلسنت نے امام تسلیم کیا اور چودھویں صدی کا مجدد بتایا تھا۔ لہٰذا اِس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی سے بھی اُسی طرح نیاز مندانہ عقیدت و محبت ہے جس طرح حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ اور دُوسرے بزرگان دین سے ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ اِس تعلق خاطر نے مجبور کیا کہ امام احمد رضا خاں بریلوی کے تجدیدی کارنامے پر جو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں لکھا جا سکے، لکھ کر اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کروں کیونکہ لکھنے والوں نے ابھی تک اِس اہم ترین عنوان پر لکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے۔

۲- دوسری وجہ اِس موضوع پر قلم اٹھانے کی یہ ہے کہ خطیب مشرق، مصنف "خون کے آنسو" علامہ مشتاق احمد نظامی مدظلہٗ مدیر پاسبان الٰہ آباد کا یہ بیان پڑھنا نصیب ہوا کہ:

"محترم مفتی ظفر علی صاحب نعمانی پرنسپل دارالعلوم امجدیہ کراچی کا مرسلہ پیکیٹ جس وقت مجھے موصول ہوا اور کتاب کے سرورق "حیاتِ اعلیٰحضرت" پر نظر پڑی تو وفورِ شوق میں اوراق گردانی کرنے لگا مگر اپنی حرماں نصیبی کہ جس عنوان کا متلاشی تھا وہ مجھے نہ مل سکا، یعنی "اعلیٰحضرت کی شانِ تجدید"۔ میرے خیال میں جلد اول کا سب سے اہم اور ضروری باب یہی تھا کہ اعلیٰحضرت کی مجددیت پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی اس کے بعد زندگی کے دوسرے گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ بعد کے دوسرے نسخوں میں حضرت ملک العلماء محمد ظفر الدین صاحب قبلہ پرنسپل جامعہ لطیفیہ کیٹھار نے اس خصوصی مسئلہ پر گفتگو فرمائی ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہوسکا تو مکتبہ کراچی کو چاہیے کہ وہ موصوف سے اس عنوان پر ایک علمی و تحقیقی مقالہ لے کر دوسری یا تیسری جلد میں شائع کر دے، ورنہ میری نگاہ میں "حیاتِ اعلیٰحضرت" ایک عالم و فاضل کی تاریخ تو کہی جائے گی لیکن کسی مجدد کی تاریخ نہ بن سکے گی۔ ضرورت ہے کہ اعلیٰحضرت کی شانِ تجدید پر محققانہ گفتگو کی جائے۔ یہ تنقید و تبصرہ نہیں بلکہ ایک ناقص رائے کا اظہار ہے۔" [۱]

شاید موصوف کی یہ آواز صدائے صحرا ہوکر ہی رہ گئی تھی کہ اس موضوع پر ابھی تک کوئی کتاب منصۂ شہود پر جلوہ گر نہ ہوسکی۔ راقم الحروف یہی کچھ لکھنے کی بفضلہٖ تعالیٰ جسارت کر بیٹھا تاکہ ایسے عظیم عنوان اور ایسے جلیل القدر امام و مجدد کے تجدیدی کارنامے پر اس سے اچھی کتاب کو دیکھ کر علمائے اہلسنت میں سے کوئی صاحب جنبش اٹھیں اور اس طرح خمخانہ میں آکر "اعلیٰحضرت کا تجدیدی کارنامہ" شایانِ شان طریقے سے عالمانہ اور محققانہ انداز میں لکھنے کی شاید زحمت گوارا فرمائیں۔

۳- تیسری وجہ مذہب اہلسنت و جماعت سے بغاوت کرنے والے اینگلو انڈین علماء اور انصاف دشمن مورخوں کی علمائے اہلسنت اور خصوصاً امام احمد رضا خاں بریلوی کے خلاف

---

[۱] محمد صابر قادری نسیم بستوی: مولانا مجدد اسلام، مطبوعہ کانپور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۰۰، ۲۰۱

معاندانہ روش ہے۔ یہ حضرات اپنے اکابر کی انگریز دوستی اور بُت پرست نوازی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے بے جا الزامات اور واہی تباہی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ مدتوں سے مستقل طور پر جاری کیے ہوئے ہیں۔ جن حضرات کے قدموں پر بھی کبھی انگریز دوستی کی گرد نہ پڑی اور جن کے خلوص و للّٰہیت، تقویٰ و طہارت اور دیانت و امانت کی فرشتے بھی قسم کھاتے ہیں، اُن علمائے کرام اور اولیائے عظام پر انگریز دوستی کا الزام نہایت بے باکی سے لگا دیتے ہیں اور اپنی اِس نازیبا حرکت، ابلیسی شرارت، اکابرِ ہند و پاک سے عداوت، تاریخ و واقعات میں خیانت کرنے پر ذرا نہیں شرماتے، آنکھیں تک نہیں جھکاتے، مثلاً پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

"دہلی میں دبیر الدولہ نواب فریدالدین (ف ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء)، مفتی زین الدین (ف ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء)، مفتی صدرالدین آزردہ (ف ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) مولوی فضل امام خیرآبادی (ف ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۸ء)، مولوی محمد صالح خیرآبادی (برادر فضل امام خیرآبادی)، مفتی فضل عظیم خیرآبادی (فرزند اکبر فضل امام خیرآبادی)، مولوی فضل حق خیرآبادی (ف ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء)۔ بدایوں میں مولوی فضل رسول (ف ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء)، مولوی علی بخش صدر الصدور (ف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵-۸۶ء)، مرادآباد میں مولوی عبدالقادر چیف رام پوری (ف ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء)، الٰہ آباد میں مولوی اسد اللہ (ف ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲-۸۳ء) و قاضی عطار رسول چریا کوٹی، کلکتہ میں قاضی نجم الدین خاں کاکوروی (ف ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۳ء) اور ان کے صاحبزادگان، قاضی سعید الدین (ف ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء)، مولوی حکیم الدین (ف ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء) اور قاضی علیم الدین (ف ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء) وغیرہ۔ مدراس میں قاضی ارتضا علی گوپاموی (ف ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳-۵۴ء) اور ناسک میں خان بہادر مولوی عبدالفتاح مفتی وغیرہ برصغیر پاک و ہند کے وہ نامور و افاضل ہیں جنہوں نے منصبِ افتاء، قضاء اور صدر الصدوری کے ذریعے سرکار کمپنی کے اقتدارِ حکومت

کو بحال اور مضبوط تر کیا۔" ؎۱

؎ گلشن کے اس اک منظر پُر خار کے ہاتھوں
سو چاک ہیں یارو مرے دامانِ نظر میں

قادری صاحب کو مذکورہ علمائے کرام کی ملازمت تو نظر آگئی اور صرف ملازمت کے پیشِ نظر مزے لے لے کر برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ کاش ! موصوف روزِ قیامت کا منظر اور وہاں کی بازپرس کو پیشِ نظر رکھتے۔ الزام تراشنے اور بہتان لگانے سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر غور فرما لیا جاتا :

۱۔ کیا ان علمائے کرام نے کسی خلافِ اسلام منصوبے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا ؟
۲۔ کیا ان اکابر نے کمپنی کے دباؤ یا ترغیب سے اسلامی عقائد و نظریات میں کوئی ترمیم و تنسیخ کی تھی ؟
۳۔ کیا ان بزرگوں نے حکومت کی حمایت کا کوئی ایسا اعلان کیا تھا جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا ؟

ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ معاندین اس قسم کا ایک بھی الزام علمائے اہلسنت پر ثابت نہیں کر سکتے۔ رہی بغض و عناد کی بات ، تو یہ راستہ ہی دوسرا ہے۔ اس راستے پر گامزن ہو کر ، جو کسی کے جی میں آئے کہتا پھرے ، کون کسی کا منہ پکڑ سکتا ہے ! مبتدعین زمانہ نے تو بغض و عناد میں شہنشاہِ دو جہاں ، سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیسے کیسے نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں ، جن کی کلمہ گو کافروں کو بھی کبھی جرأت نہ ہوئی بلکہ اس سے بھی تجاوز کر کے باری تعالیٰ شانہٗ کے سبوح و قدوس ہونے کو داغدار کرنے کی غرض سے ذات باری تعالیٰ پر امکانِ کذب کا الزام لگانے اور اُسے جھوٹا ٹھہرانے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی تھی۔ یہی حضرات اگر علمائے اہلسنت پر الزام تراشی کرتے ہیں تو کونسی عجیب بات ہے ؟ ہاں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے تاریخ دوست حضرات سے ہم اتنی گزارش

؎۱ محمد ایوب قادری ، حاشیہ مقدمہ حیات سید احمد شہید ، مطبوعہ کراچی ، ص ۱۸

دور کریں گے ؎

اں چاہتے ہیں کہنا کچھ اپنی لَے میں ہم بھی
لِلہ روک دے اب سازِ لَنْ تَرَانِیْ

اِس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ تحریر ہوا ہے اگر اُسے انصاف اور دیانت داری کے ساتھ پڑھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ علمائے اہلسنت سے عناد رکھنے والوں کے وہ صاحبانِ جُبّہ و دستار جنہیں برٹش گورنمنٹ نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر آسمانِ علم کے شمس و قمر منوانے اور تقویٰ و طہارت میں رشکِ جنید و شبلی باور کرانے کی خاطر اپنے پروپیگنڈے کی ساری مشینری کو حرکت دی ہوئی تھی اور تا حال بھی مصروفِ عمل ہے، کچھ اور ہی نظر آنے لگیں۔ معلوم نہیں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے حق کے متلاشی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کیوں علمائے اہلسنت کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے؟ ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

اسی طرح مولوی محمد سلیمان بدایونی نے سہ ماہی "العلم" کراچی، بابت مارچ ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۷ھ میں امام احمد رضا خاں بریلوی سے بغض و عناد کی بنا پر "حیاتِ اعلیٰحضرت" مصنفہ علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ کے پیشِ نظر ایک طویل اور لاطائل تنقید کی ہے جو بجائے خود محتاجِ تنقید ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اُسی تنقید کا اپنی کئی تصانیف اور تحریروں میں سہارا لیا ہوا ہے۔ گویا جب ان حضرات کے دریائے تحقیق میں جوش آتا ہے تو اتنے باریک بین ہو جاتے ہیں کہ اپنے مخالفین کی آنکھوں میں فرضی تنکے بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن جب اپنے اُن علماء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنہیں اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللہِ بنا کر اپنے دلوں اور دماغوں پر سوار کیا ہوا ہے تو آنکھیں اتنی چندھیا جاتی ہیں کہ اُن حضرات کی آنکھوں کے شہتیر بھی نظر نہیں آتے۔ یہ تحقیق ہے یا دھاندلی؟ یہ انصاف ہے یا تاریخ پر ظلم؟ یہ عامہ مسلمانوں کی رہنمائی اور خیر خواہی ہے یا تحقیق کی آڑ میں اُنہیں غلط راستے پر گامزن کرنا اور خدا کے مقبول بندوں کے خلاف صف آرا کرنا اور ہونا، حقائق آپ حضرات کے بھی سامنے ہیں۔

انصاف کی ترازو ہاتھ میں ہے، کیوں ڈنڈی مار کر دیانت و امانت کا خون سرِ بازار کیا جا رہا ہے؟ کیا قیامت نہیں آئے گی؟ ہم مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی کو مخلصانہ اور خیر خواہانہ مشورہ دیتے ہیں کہ، ؎

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو

اِس سلسلے کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض حضرات تُبغضِ معاویہ میں اِتنے دُور نکل جاتے ہیں کہ سنگین سے سنگین الزام ڈنکے کی چوٹ لگاتے ہیں لیکن اِس الزام کی پُشت پر کوئی مجبوث مُرث کی دلیل یا فرضی و جعلی شہادت تک پیش کرنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں، ثبوت خواہ زندگی بھر میسر نہ آسکے لیکن بہتان تراشی میں کوتاہی کرنا جُرم سمجھتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں "آئینۂ صداقت" نامی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ کتاب کے مُصنّف پروفیسر الحاج محمد فیروز الدین رُوحی ہیں۔ سرِورق پر لکھا ہے کہ "بریلوی اور دیوبندی مسلک کی حقیقت تاریخ کے آئینہ میں"۔ یہ سُہانا اعلان، کتاب کا پیارا پیارا نام پڑھ کر اور یہ معلوم کرکے کہ مُصنّف ماشاء اللہ اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر ہیں اور ثانیاً الحاج بھی نیز روحانیت سے تعلق رکھنے والے تخلّص سے بھی مزیّن ہیں، یہ اُمید ہو چلی تھی کہ موصوف نے ضرور تاریخی انصاف سے کام لیا ہوگا، اختلافات کی تلخی کو کم کرنے کی سعی فرمائی ہوگی اور علمی انداز میں مثبت کردار ادا کیا ہوگا، لیکن کتاب کا مطالعہ کیا تو ساری کتاب رہی ایک طرف، پہلے چند صفحات ہی نے میرے خرمنِ اُمید میں ایسی آگ لگائی کہ اُس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ شاید محترم رُوحی صاحب مثبت انداز کے تصوّر سے بھی ناآشنا ہیں اسی لیے موصوف نے پُوری کتاب میں منفی انداز کو نبھایا اور بعض مقامات پر تو اِس سے بھی نیچے چھچھلے اور گھٹیا رہے۔ چونکہ "آئینۂ صداقت" نامی کتاب کے بارے میں راقم الحروف نے اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا ہے لہٰذا اِس کا تعارف کرانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ موصوف رقم طراز ہیں:

"نہ کسی سے مناظرہ مقصود نہیں ہے، نہ کسی کو سبّ و شتم کرنے کا خیال ہے،
نہ ہی کسی کی بے جا طرفداری اپنا شعار ہے۔ ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے

موجود ہے۔ ہر شخص خدا کو حاضر و ناظر جان کر، طرف داری اور جانب داری کو
چھوڑ کر، اِس کتاب کا مطالعہ کرے گا، انشاء اللہ حقیقت اُس پر واضح
ہو جائے گی۔"[۱]

آئیے رُوحی صاحب کے مذکورہ دعاوی کا جائزہ لیتے ہیں کہ اپنی اِس تصنیف میں موصوف
نے کہاں تک اِن کا پاس لحاظ کیا ہے؛ یا محض قارئین کے دل موہ لینے کی خاطر یہ خوشنما اعلان
کیا ہے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں؛

"اِن کو کیا معلوم کہ ابنِ عابدین شامی نے حکومت کے اثر سے اِن غریبوں (وہابیوں)
کو بدنام کیا، اور اِن کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے اپنی دنیا سنبھالی۔
بُرا ہو اِس دنیا پرستی اور سنہرے سکوں کا، جس کے عوض شامی نے نجدیوں کو
دل کھول کر بدنام کیا۔ شامی نے یہ سب کچھ محمد علی پاشا کے حکم سے اُس کی دولت کے
اثر سے لکھا ہے۔"[۲]

شاید اِس گروہ نے بزرگانِ دین کی اہانت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ
نہ اور انبیائے کرام سے لے کر صحابۂ کرام تک جس کو بھی اپنے خلاف دیکھتے ہیں، اُسی کی
طرف اپنی توپوں کا رُخ پھیر کر دُھواں دھار بمباری شروع کر دیتے ہیں۔ رُوحی صاحب سے تو
کیا کہا جائے لیکن ہم انصاف پسند قارئین سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ موصوف نے علامہ
ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مسلّم عالمِ دین، اہلسنّت کے مایہ ناز فقیہ اور اپنے دور کی یگانۂ روزگار
ہستی پر جو الزامات مذکورہ عبارت میں عائد کیے ہیں، اِن کا ثبوت مصنف نے "آئینۂ صداقت"
میں کس جگہ دیا ہے؟ اگر ثبوت ہے تو کس صفحے پر؟ پورا اگر پہلے صفحے سے آخری تک ثبوت کے نام کا ایک
لفظ بھی نہ مل سکے تو "ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالے سے موجود ہے۔" یہ اعلان حقیقی دعویٰ ہی
کہلائے گا یا فراڈ؟ کیا ایسی کتاب کا نام "آئینۂ صداقت" ہی رکھنا چاہیے تھا یا اور کچھ؟ کیا

---

[۱] محمد فرید الدین روحی: آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۱۱

[۲] ایضاً، ص ۴۴

تاریخ کے آئینے میں اسی طرح فیصلہ ہُوا کرتا ہے؛ معلوم ہوتا ہے کہ روحی صاحب بھی اپنے قبیلے کے جید اساطین کی طرح تاریخ سے انتہائی خائف ہیں، ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے دلائل قارئین کی خدمت میں پیش کرتے، ثبوت ٹھوس، واضح اور وزنی ہوتے تاکہ اُن کی روشنی میں ہر انصاف پسند یہی رائے قائم کرنے پر مجبور ہوجاتا جس کا اعلان موصوف نے بغیر کسی دلیل کے کیا ہُوا ہے۔ یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ بغیر دلیل کے دعوٰی کیا جاتا ہے۔ کیا یہ تاریخ کا، دیانتداری کا، اپنی علمیت کا بلکہ خود اپنی ذات کا مذاق اُڑانا نہیں ہے؛

آئیے! قارئین کی عدالت کے بعد آپ کی سپریم کورٹ سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ یہ ہیں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر، یعنی مولوی حسین احمد صاحب ٹانڈوی (اسے گاندھوی نہ پڑھنا) سُنیے موصوف کیا فرماتے ہیں؛

"محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتداءً تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہُوا اور چونکہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اس نے اہل سنّت والجماعت[1] سے قتل و قتال کیا اور اُن کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا اور اُن کے قتل کو باعث ثواب و رحمت شمار کرتا رہا اہل حرمین کو خصوصاً اور اہل حجاز کو عموماً اس نے تکلیف شاقہ پہنچائیں۔ سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے۔ بہت سے لوگوں کو اُس کی تکلیف شدیدہ کے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے اور اُس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے الحاصل وہ ایک ظالم و باغی اور خونخوار فاسق شخص تھا۔"[2]

ہم ندوی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے محبوب نجدیوں کے مظالم اور عقائد فاسدہ بیان کیے تو وہ آں جناب کے نزدیک دنیا پرست اور

---

[1] ٹانڈوی صاحب کو چاہیے تھا کہ یہاں اہلسنت وجماعت یا اہل اسنت والجماعت۔

[2] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۲

دین فروش ٹھہر گئے لیکن صدرِ دیوبند مولوی حسین احمد ٹانڈوی کے بارے میں ارشاد فرمادیا جائے کہ جناب کے نزدیک یہ بھی دنیا پرست اور دین فروش قرار پائیں گے یا نہیں؟ اب ذرا دُوسری بڑی سرکار مولوی خلیل احمد انبیٹھوی کا فیصلہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے

"سوال؛ محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مال وآبرو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا، اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے اور کیا سلف اور اہلِ قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

جواب؛ ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے اور خوارج ایک جماعت ہے شوکت والی، جنھوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے کہ امام کو باطل یعنی کفر یا معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں، آگے فرماتے ہیں، اِن کا حکم باغیوں کا ہے.... اور علامہ شامی نے اس کے حاشیہ میں فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے زمانے میں (محمد بن) عبدالوہاب کے تابعین سے سرزد ہوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوتے، اپنے کو حنبلی مذہب بتاتے تھے، لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وُہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدے کے خلاف ہو، وُہ مشرک ہے اور اسی بنا پر اُنھوں نے اہلِ سنت اور علمائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا۔ ملخصاً۔[1]

اس کتاب المہند علی المفند پر اکابر علمائے دیوبند کی تقاریظ بھی ہیں، جن میں آپ کے شیخ الہند مولوی محمود الحسن، جناب کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی، جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ دہلوی اور دارالعلوم دیوبند کے مایۂ ناز مفتی مولوی عزیز الرحمٰن بھی

---

[1] خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: المہند علی المفند اردو، ص ۲۱، ۲۲

شامل ہیں۔ کیا روحی صاحب بتا سکیں گے کہ مولوی حسین احمد ٹانڈوی اور مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے کس کی دولت کے اثر سے نجدیوں کو برا بھلا کہا تھا؟ نیز ان حضرات کی تصدیق کرنے والے اتنے سارے علمائے دیوبند کو کہاں سے دولت ملی تھی؟ نجدیوں کو برا بھلا تو اکثر علمائے دیوبند نے بھی کہا ہے لیکن یہ منطق ہماری سمجھ بوجھ سے بالا ہے کہ علامہ شامی اگر نجدیوں کے عقائد فاسدہ کا ذکر کریں تو دین فروش اور دنیا پرست قرار دے دیئے جاتے ہیں لیکن علمائے دیوبند جب نجدیوں کے مظالم اور غلط عقائد و نظریات کی نشان دہی کرتے ہیں تو انہیں علمائے حق کہا جاتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے، اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر عالیجناب الحاج محمد فیروز الدین روحی باقاعدہ نے اپنی ماڈرن صداقت کے آئینہ میں قارئین کو تین مزید جلوے یوں دکھائے ہیں:

"احمد زینی دحلان کی حقیقت بھی سنیئے۔ یہ شخص حکومت کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا اور اس کے حکم و اشارہ پر سب کچھ کرتا تھا۔ چونکہ مفتی مکہ تھا اس لیے خوب کھل کھیلنے کے مواقع حاصل تھے۔ تفصیلات کا موقع نہیں۔" [1]

"مولوی فضل رسول بدایونی انگریز کے ایجنٹ اور تنخواہ دار تھے۔" [2]

"یہاں یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہو گی کہ مولانا (امام احمد رضا خاں بریلوی) نے جہاد کے معاملہ میں اپنے استاد (شیخ احمد بن زینی دحلان مکی) کی سنت کو پورا پورا نباہ کر انگریز کا ساتھ دیا ہے۔ جہاد کے سلسلہ میں فتاوی رضویہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔" [3]

مذکورہ تینوں حضرات پر موصوف نے الزام تو اتنا سنگین لگا دیا لیکن اس شوخی اور شرارت کی کہاں تک داد دی جائے کہ پوری کتاب میں اس امر کا ثبوت ایک بھی نہیں دیا جا سکا۔ معلوم نہیں یہ کیسی دیانتداری کا ریکارڈ قائم کیا جا رہا ہے؟ بزرگان دین پر الزام تراشی تو

---

[1] محمد فیروز الدین روحی: آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵

[2] ایضاً، ص ۵۰

[3] ایضاً، ص ۵۷

تنکے کی چوٹ کرتے جاتے ہیں لیکن ثبوت کے نام سے بھی بھکتے اور بھاگتے چلے جاتے ہیں، پکڑے جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے اور اسے اپنی صداقت کے آئینے کی زینت بناتے ہیں:

"تفصیلات کا موقع نہیں۔"[1]

"یہاں پر صرف اشاروں پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔"[2]

"یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔"[3]

"ہم صرف اشارہ دیں گے۔"[4]

اس فرضی آئینۂ صداقت میں یہ علمی دنیا کا مذاق اڑایا گیا ہے یا نہیں؟ بندۂ خدا! جب آپ کے پاس ان بزرگوں کو مطعون کرنے اور موردِ الزام ٹھہرانے کے لیے ایک دلیل بھی نہیں جسے آپ اپنے نام نہاد "آئینۂ صداقت" میں پیش کرتے تو الزام تراشی کرنے کی بجائے صاف صاف یوں لکھ دیتے کہ "علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کے بارے میں ہمیں تو کیا ہمارے بڑے بڑوں کو بھی کوئی ایک ثبوت نہیں مل سکا تھا، لیکن ہم نے اپنے اکابر کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا ہے، ان حالات میں اگر علمائے اہلسنت پر گھڑے الزامات نہ لگائیں تو اپنے أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّٰهِ کی تخریب کاری، انگریز دوستی اور بت پرست نوازی پر پردہ کس طرح ڈالیں؟ لہٰذا یہ ذلیل رستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ راہِ راست ہماری طبیعتوں کے ناموافق ہے۔ فقط والسلام"

اگر صاف صاف اس طرح لکھ دیا جاتا تو قارئین کی نظر میں اس درجہ قابلِ نفرت تو نہ ٹھہرتے کہ علمی خیانت کرنے اور بزرگانِ دین کے مخالفوں کی فہرست میں شامل ہونے کو اپنا کارنامہ ہی سمجھتے چلے جا رہے ہیں۔ رُوحی صاحب نے یہ زہر کتنے معصومانہ انداز سے اگلا ہے کہ:

۱۔ محمد فیروز الدین رُوحی، آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵، ۵۴

۲۔ ایضاً، ص ۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۴۵

۴۔ ایضاً، ص ۴۵

"جہاد کے سلسلہ میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا" بھلا اس ستم ظریفی کی داد کہاں تک دی جائے کہ صرف کتاب کا نام لکھ دیا اور جلد، عبارت اور صفحے وغیرہ کا نشان تک نہ بتایا کہ کسی نے نقل کا اصل سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا تو سرِ بازار اس صداقت کے آئینے کو چکنا چور کر دے گا۔ موصوف نے حوالہ اس طرح دیا ہے گویا یہ دس بیس صفحے کی کتاب ہے لہٰذا مکمل حوالے کی کیا ضرورت ہے ہر کوئی آسانی سے مطلوبہ بیان کو تلاش کر لے گا، حالانکہ فتاویٰ رضویہ تو دنیائے اسلام کا وہ عظیم فقہی ذخیرہ ہے جس کی چند سطریں بھی شاید رُوحی صاحب کبھی کسے سامنے بیٹھ کر نہ سنا سکیں گے۔ فتاویٰ رشیدیہ اور امداد الفتاویٰ کے سائز میں اگر فتاویٰ رضویہ کو چھپوایا جاتے تو اس کی بارہ جلدوں کے پچیس ہزار سے بھی زائد صفحات بنیں گے۔ اگر روحی صاحب کی نظر میں فتاویٰ رضویہ شریف کی کوئی ایسی عبارت ہے جو اُن کے نزدیک قابلِ اعتراض اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو اُسے پیش کر کے، فیصلہ قارئین کے سپرد کر دیتے۔ بغیر حوالہ الزام کیا ؟

موصوف کا مندرجہ ذیل بیان اور اُس کے ذریعے جو تاثر دیا گیا ہے یہ کرشمہ اُن کی مشاقی پر دلالت ہے۔ روحی صاحب نے یہاں جو چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی دکھائی وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

> "علمائے اسلام نے دہلی کے آخری بادشاہ ظفر شاہ کی برائے نام حکومت کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی اور اسلام کو سربلند کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے شدید مظالم سے مجبور ہو کر دہلی میں جہاد کا فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علمائے دہلی اور علمائے حق پرست کی مُہریں ہوئیں۔"[1]

یہ بالکل درست ہے کہ علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء میں جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ حق پرست علماء نے اس فتوے کی تصدیق و تشہیر فرمائی۔ لیکن روحی صاحب کے کمال کی داد کہاں تک دی جائے کہ اُن علمائے کرام کے اسمائے گرامی صیغۂ راز میں رکھے۔

---

[1] محمد فیروز الدین رُوحی: آئینۂ صداقت، ص ۸۹، ۹۰

اِس طرح شرمانے اور پردہ پوشی کا تکلف فرمانے کی وجہ یہی تو ہے کہ اگر وہ نام ظاہر کر دیتے تو موصوف کے محبوب علماء کسی اور ہی صف میں نظر آنے لگیں گے۔ لہٰذا بغیر اظہار کے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ علمائے دیوبند ہی تھے جو انگریزوں کے خلاف جنگ آزما ہوئے تھے اور یہی علمائے حق پرست ہیں۔ فتویٰ مرتب کرنے والے اور تصدیق و تشہیر کرنے والوں کے اسمائے گرامی اگر لکھ دیئے جاتے تو روحی صاحب کا سارا منصوبہ ہی دریا بُرد ہو جاتا۔ اسی لیے رازداری کا دامن پکڑ کر چلتے رہے۔ آگے موصوف نے اپنے محبوب علماء کی للّہیت اور انگریز دشمنی کی دلیل کیا خوب تراش کی ہوائی ہے۔ لکھتے ہیں :

"اِن مدارس (دیوبند و سہارن پور) نے نہ کبھی سرکاری امداد لینی گوارا کی اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے یہاں آنے کا موقع دیا، جو انھیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے۔" [1]

جب دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور دونوں ہی دینی درسگاہیں ہیں پھر ان کے متعلق سرکاری امداد اور ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے یا نہ آنے کے ذکر کا یہاں کوئی موقع و محل ہی نہیں تھا۔ یہ ہر تعلیم یافتہ آدمی جانتا ہے کہ سرکاری امداد کی مدارس کو ملتی ہے اور ڈپٹی انسپکٹروں سے تعلیمی اداروں میں جایا کرتے ہیں۔ چونکہ یہاں چور کی داڑھی میں تنکے والا معاملہ تھا، لہٰذا موصوف کو یہ غیر متعلق شیخی بگھارنی پڑی۔ قارئین کرام کی تسلی کے لیے ہم وہ تنکا بھی دکھا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس نے روحی صاحب کو یہ البیلا اور لاتعلق بیان داغنے پر مجبور کیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی حقیقت اور ان کے بانیوں اور کارکنوں کے مدلل اور تفصیلی خدوخال بعد شروع اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں، یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء)، مولوی مملوک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) کے شاگرد و عزیز اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ اس مدرسہ کی تاسیس میں جن حضرات کا ہاتھ تھا، اُن میں سے

---

[1] محمد فیروز الدین روحی، آئینہ صداقت، ص ۱۲۰

ایک مولوی محمود الحسن دیوبندی (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے والد مولوی ذوالفقار علی دیوبندی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) تھے جو پہلے بریلی کالج کے پروفیسر اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دوسرے مولوی شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے والد مولوی فضل الرحمٰن (المتوفی   ) تھے جو بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے ملازمت ختم ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی کے صاحبزادے تھے۔ پہلے یہ اجمیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے تھے اس کے بعد بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہی کر رہے۔ گویا مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے والے، پڑھانے والے، چلانے والے سب کے سب سرکاری آدمی تھے اور خاص طور پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہی رہے تھے۔ دریں حالات یہاں ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے کی کون سی ضرورت اور گنجائش باقی رہ گئی تھی!

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مدرس اوّل مولوی محمد مظہر نانوتوی تھے۔ موصوف دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی مملوک العلی نانوتوی کے شاگرد اور عزیز تھے۔ تمام عمر سرکاری ملازمت کی اور آگرہ کالج میں تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ریٹائر ہونے پر سہارنپور میں یہ مدرسہ قائم کر لیا۔ ان کے معاونِ خاص، موصوف کے حقیقی بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی تھے۔ یہ بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ بریلی کالج میں تعلیمی خدمات انجام دینے پر مامور رہے۔ سرکاری ملازمت ختم کرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے سہارنپور میں مدرسہ قائم کر لیا۔ یہ تھے ان مدارس کے کارندے۔ کیا حکومت ان حضرات کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی! انگریزوں کو معلوم نہیں روحی صاحب نے اتنا بے وقوف کیوں سمجھ لیا کہ وہ تحصیل حاصل کی سعی کرتے۔

الحاج فیروز الدین صاحب! ایک روز ہم سب نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ کیا "آئینۂ صداقت" جیسی کتاب لکھتے وقت آپ کو اس عظیم بارگاہ کی حاضری اور قیامت جیسے دن کی ہولناکی کا خیال تک نہ آیا؟ کسی کی خاطر اپنی عاقبت برباد کرنا کہاں کی

عقلمندی ہے؟ جن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں، اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہوں پر آپ نے سنگین بہتان لگائے اور الزام عائد کیے ہیں۔ کیا بروزِ قیامت یہ بزرگ آپ کا گریبان سے پکڑ کر باری تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ سے انصاف کے طلبگار نہ ہوں گے؟ کیا اُس روز یہ دھاندلی کام آجائے گی؟ ؎

جب سرِ محشر وہ پوچھے گا بُلا کے سامنے
کیا جواب جرم دوگے تم خدا کے سامنے

۴۔ اس کتاب کے لکھنے کی چوتھی وجہ علمائے اہلسنت کی سہل پسندی اور خوش فہمی ہے۔ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں "مرکزی مجلس رضا لاہور" نے راقم الحروف کا مقالہ "اعلیٰحضرت کا فقہی مقام" شائع کیا۔ اس مقالے کے صفحہ ۱۹ پر ایک عبارت یُوں ہے: "کسی زندہ قوم میں اس مرتبے کا کوئی عالم پیدا ہو جاتا تو وہ قوم اس کے علوم و فنون سے نہ صرف خود مستفید ہو بلکہ تمام دنیا کو اس کے افکار و نظریات پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتی"!

اس عبارت پر ہمارے ایک محترم مولوی صاحب بگڑ بیٹھے اور فرمایا کہ کیا اعلیٰحضرت قدس سرہٗ مُردہ قوم میں پیدا ہوئے تھے؟ کیا علمائے اہلسنت نے اعلیٰحضرت پر آپ کی نظر میں کوئی کام نہیں کیا؟ فلاں کتاب میں میرا ایک مقالہ، فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک موجود ہے، اُسے پڑھ کر رائے قائم کیجیے۔

گویا معاندین و مبتدعین نے جو امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لاکھوں صفحات سیاہ کیے ہوئے ہیں، ہمارے کرم فرما مولوی صاحب نے چند صفحے کا ایک مضمون لکھ کر مخالفین کا سارا کرتہ چکا دیا۔ اعلیٰحضرت اور اُن کی تعلیمات کو منظرِ عام پر لے آئے، فاضلِ بریلوی کو دوسرے امام زمانہ منوا دیا۔ اہلسنت و جماعت کے سب اگر دُور کر دیئے۔ بھلا اس خوش فہمی اور صورتِ حالات سے چشم پوشی کی کوئی حد ہے! ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

۵۔ پانچویں وجہ بعض موجودہ علمائے اہلسنت کی مستقل لا پروائی کہ امام احمد رضا خاں بریلوی —

ساتھ نادان دوستی ہے۔ ایسے بھی علمائے اہلسنت ہیں جنہوں نے اپنی صلح کلی میں یا ناقص مطالعہ وکوتاہ فہمی سے یا متجددینِ زمانہ سے مرعوب ہوکر فاضلِ بریلوی قدس سرہٗ کی بعض تحقیقات کو اس رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے جس سے رضویت کا چہرہ تقریباً مسخ ہوکر رہ جاتا ہے۔ جب چند علمائے اہلسنت سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ایسی باتوں کا سدِّباب کریں، ان حضرات کو سمجھائیں تو کشتیِ اہلسنت کے یہ ناخدا کسی طرح بھی اپنی مہرِ سکوت توڑنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ اِس افسوسناک صورتِ حال نے مجبور کیا امام احمد رضا خاں بریلوی کے علمی کارناموں کو کسی حد تک منضبط کرنے کی اپنی لبساط بھر کوشش کر دی جائے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ان وجوہات کے تحت راقم الحروف کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک بڑھیا سُوت کی انٹی لے کر شامل ہو سکتی ہے تو کیوں نہ حقائق کے پھولوں کا ایک گلدستہ تیار کر کے مجددِ دوراں کے عقیدت مندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں، شاید یہی کاوش میرے لیے کفارۂ سیئات اور نجاتِ اُخروی کا باعث بن جائے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت پیش ہی اُس وقت آتی ہے جب رہنمائی کے پردے میں رہزنی اور تخریب کاری کا بازار گرم ہو چکا ہو۔ کسی بھی مجدد کے کارناموں کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے اس کے گرد ایسے تخریب پسندوں کا جمِ غفیر نظر آئے گا جو رہبری کے پردے میں رہزنی کا کام کرتے ہوں گے اور اصلاح کے نام پر فساد کی جڑیں مضبوط کرنا اُن کا مشغلہ رہا ہوگا۔ چونکہ بدقسمتی سے ایسے لصوصِ دین بھی مسلمانوں کے سامنے قوم کے رہنما، دینی پیشوا اور روحانی مقتدا بن کر ہی آتے ہیں بایں وجہ کتنے ہی مسلمانوں کی قوتِ فیصلہ ایسے مواقع پر گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور اہلِ اسلام سے کتنے ہی بدنصیب اُن کے بعض خوشنما کاموں کو دیکھ کر بہک جاتے ہیں۔

امامِ ربانی حضرت مجدد الفِ ثانی سرہندی قدس سرہٗ کے دور میں بھی دو طبقے تخریبِ دین کا کام کرنے میں پیش پیش تھے یعنی حکومت اور نام نہاد مذہبی رہنما۔ بعینہٖ اسی صورتِ حال سے امام احمد رضا خاں بریلوی نوّر اللہ مرقدہٗ کو دوچار ہونا پڑا۔ وہاں اکبر اور جہانگیر تھے تو یہاں اسلام دشمن انگریز۔ وہ حکومت علی الاعلان اسلام کو بدلنے اور مٹانے پر مُصر تھی لیکن انگریزی حکومت نامعلوم اور پُراسرار طریقوں سے۔ اُس وقت کے فیض و فضل سے محروم علماء، جو دینِ محمدی کی جڑیں کھودنے میں مصروف تھے وہ صاف نظر آتے تھے کہ اسلام دشمن حکومت کے ارکانِ سلطنت ہیں؛

لہٰذا عوام الناس انھیں اپنا رہنما تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن برطانوی دور کے
علمائے سو نے ایسے نامعلوم طریقوں سے برٹش گورنمنٹ کے اسلام دشمنی والے منصوبے کو
پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی منحوس کوشش کی کہ ملتِ اسلامیہ کے کتنے ہی بیدار مغز حضرات تک کی
قوتِ فیصلہ ان کے کھوٹ کا سراغ لگانے سے قاصر ہو کر رہ گئی۔ مذکورہ صورتِ حال کے پیشِ نظر
ہمیں اس کتاب کی پہلی جلد کا بیشتر حصہ محض تخریب کاروں کی سراغ رسانی کے لیے وقف کرنا پڑا

چاروں جلدوں کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں :

جلد اول مجددِ مائۃ حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف ، انگریزوں کا تسلط ، ذہنیت ، لوٹ کھسوٹ
مظالم ۔ اسلام دشمنی کی صورتیں ، برٹش نواز علماء خود اپنی تاریخ کے آئینے میں ،
انھوں نے مقدس شجرِ اسلام میں کیسی کیسی غیر اسلامی قلمیں لگائیں نیز ہندوؤں کے ہاتھوں بک کر
مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں ضم کرنے کی کیسی کیسی چالیں چلیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو برملا ایک
قوم بتایا ، حتی کہ گاندھی جیسے بت پرست کو اپنا امام بنایا۔ جلد عنوانات پر دلائل کے انبار۔

جلد دوم امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کا نظم و نثر میں خاکہ ، علمائے
مبتدعین نے کن کن علمی محاذ کھولے ، سب کے ساتھ مقابلہ ، گھمسان کا رن
میدان فاضلِ بریلوی کے ہاتھ ، طرزِ استدلال کی جھلکیاں ، صاحب کا خداداد ملکۂ علمیت
نمونے ، تصانیف کا معیار اور ان کے اعداد و شمار۔

جلد سوم آپ کا جامع العلوم ہونا گوناگوں تصانیف عالیہ کی روشنی میں ، علمائے عرب و عجم
کی نظر میں آپ کا مقام ، فاضلِ بریلوی کے درجۂ امامت پر سیر حاصل اور ایمان افروز

جلد چہارم اعلیٰحضرت علیہ الرحمہ کا روحانی درجہ ، آپ کے ملفوظات و مکتوبات وغیرہ۔

یہ کام یقیناً اتنا عظیم ہے کہ اس کے لیے علمائے کرام کا ایک بورڈ مقرر ہوتا ، وہ حضرات
متعلقہ مواد کو اکٹھا کر کے ان سے اس مردِ حق آگاہ کے کارناموں کو ایک لڑی میں پروتے چلے جاتے
لیکن افسوس ! امام احمد رضا خاں بریلوی جیسے جامع العلوم ، مرکزِ دائرۂ تحقیق اور فقیہِ اعظم :
آج تک علمائے کرام نے جو کتابیں لکھی ہیں انھیں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے
شرم محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال ان چھوٹی موٹی کتابوں کا وجود بھی اس سلسلے اتفاقی اور محدود قرار

اُس کے دور میں غنیمت ہے۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں احقر کو بعض نفسِ مضمون سے خاص
مناسبت رکھنے والی کتابیں اور بھی دستیاب ہو گئیں تو مجدّدِ ماۃ حاضرہ قدس سرہٗ کا تجدیدی کارنامہ
اڑھائی تین ہزار صفحات تک پھیلتا چلا گیا اور ہنوز بعض کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کے باعث
اس میں کافی کمی محسوس کرتا ہوں۔

بہرحال سرِدست جو کچھ تیار ہوا ہے اُسے غنیمت شمار کر کے چار جلدوں میں تقسیم کر لیا ہے۔
یوں تو چار کا عدد بھی کئی وجہ سے بہت مبارک ہے لیکن ممکن ہے کہ اشاعت کی جانب سے حوصلہ افزا
حالات پیدا ہو جائیں یا اہلِ علم حضرات کے تعاون سے بعض نایاب کتابوں تک رسائی ہو گئی تو
شاید اس مقدس مجموعے کی پانچ جلدیں ہو جائیں۔ باری تعالیٰ شانہٗ اپنے عاجز بندے کو اسے
مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، علمائے کرام کو علمی معاونت کا جذبہ بخشے اور کسی خوش نصیب
پبلشر کو اسے منظرِ عام پر لانے کا حوصلہ عطا فرمائے تاکہ معتقدوں کے علاوہ اُن لوگوں کے سامنے بھی
امام زمانہ کا تذکرہ ایک شفاف آئینے کی صورت میں آ جائے جو آج تک دورِ حاضر کی اس عدیم النظیر
علمی ہستی کو محض ایک خشک مُلّا، بدعتی مولوی، جھگڑالو، پیٹ پرست اور انگریز کا ایجنٹ وغیرہ
سمجھتے رہے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے جن علماء کو اُنھوں نے وارثِ علمِ پیمبر سمجھا ہوا تھا، وہ عملاً
ـتے لصوصِ دین تھے، اُنھوں نے اپنی اسلام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی خاطر علمائے حق کو بدنام
کیا، اُن کے خلاف متعدد محاذ کھولے اور علمائے حق کی تصیبہ خوانی کرتے رہے تاکہ انھیں
بھی مسلمانوں میں سے ہمنوائی کرنے والے مل جائیں۔ اُن کے قائم کردہ فرقے کے شجرِ خبیثہ کی
جڑیں بھی دُور تک پھیل کر مضبوط ہو جائیں۔ ایسے معاندین کو خاص طور پر دکھانا ہے کہ لے دھوکا
ـسنے والا جس کا فتاویٰ جہازی سائز کے چودہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اور تمھیں بہکانے والے
ـسا جس کی بعض تصانیف کو پڑھ کر سمجھ لینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے، کیا وہ ایک خشک مُلّا تھا
ـد حیاتِ اسلام کا فقیہِ اعظم اور امامِ زمانہ جس نے برٹش گورنمنٹ کے چند ایجنٹوں اور گاندھی
شطرنج کے تمام مُہروں کو مات کر دیا، علم و فضل کے بلند بانگ دعاوی کے باوجود اُنھیں
ـہ محاذ پر شکستِ فاش ہی نہیں دی بلکہ سب کی ناک خاک میں رگڑ دی، کیا وہ ایک جھگڑالو تھا یا
ـت مجدّد الفِ ثانی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) کی طرح ایک زبردست مجاہد، حقانیت کا

مجدد اور چودھویں صدی کا مجدد تھا، جس کی کسی ایک تصنیف کا کسی مخالف سے آج تک
جواب نہ لکھا جا سکا، بلکہ اُس کی کسی ایک دلیل کو بھی شرارے آج تک دھرتی سے بیگانہ
ثابت نہ کر سکے بلکہ اُس کی ایک ہزار تصانیف میں سے کوئی ایک حوالہ بھی ایسا نہ دکھا سکے جو غلط ہو
بلکہ اُس کے متعلق کسی سے آج تک یہ دکھایا نہیں جا سکا کہ فلاں مسئلے میں وُہ اُمتِ محمدیہ کے
اکابر کی تصریحات کے خلاف ہے۔ کیا جو اوّل سے آخر تک اکابر کے دامن سے وابستہ، اُسی
مقدس اسلام کا علمبردار ہو، کسی ایک شئی میں بھی اُن سے سرِمُو اختلاف کرنا روا نہ رکھے، کسی
ایک مسئلے میں اُن کی تصریحات سے انحراف نہ کرے وُہ بدعتی مولوی ہے اور جنھوں نے برٹش گورنمنٹ
کے وظیفوں کی خیرات سے گاندھی وغیرہ عمائدینِ کانگرس کے جال میں پھنس کر برلا اور ٹاٹا کی
تجوریوں کی جھنکار سے مسحور ہو کر نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم کے لائے ہوئے مقدس
اسلام کا حلیہ بدلنے۔ اُس کی صورت کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا، آیا ایسے
اسلام دشمن عناصر کو اُن کے خوشنما نعروں، تالیفِ قلوب کے سامانوں اور محض جبہ و دستار
قال اللہ و قال رسول اللہ کی گردانوں کے باعث مسلمانوں کے خیر خواہ بلکہ رہنما بلکہ ملتِ اسلامیہ
کی کشتی کے ناخدا تسلیم کر لیا جائے؟

احقر نے مشعلِ راہ کی جلد اوّل میں یہی کٹھن اور دشوار گزار وادی طے کی ہے۔ ملک و
ملت کی خیر خواہی میں وقت کی ضرورت اور صورتِ حالات کے تحت سب سے نازک اور سب سے
اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انصاف پسند حضرات ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہم نے کسی سے ذاتی
عداوت یا دھڑے بندی کے طور پر الزام عائد نہیں کیے، بلکہ جو کچھ کہا ہے انصاف کی ترازو پہ
تول کر کہا ہے بلکہ وہی کچھ کہا ہے جو اُنھوں نے اپنی تصانیف کے اندر از خود لکھا ہے۔ ہم نے
اُن کے اپنے ہی تیار کردہ آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی ہیں۔ اگر چشمِ بینا کو واقعی وُہ چہرے
بدصورت نظر آئیں تو اس کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ وُہ چہرے ہی حقیقت میں بدنما تھے
اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جن آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام کے تمام
تلف کر دینے کے قابل ہیں۔

بدمذہبین حضرات اور اسلام دشمن طاقتوں کے پُر اسرار کارندوں کے بارے میں

راقم الحروف کا قلم اٹھانا اُن کے معتقدین کی دل آزاری کی خاطر نہیں بلکہ اِس حقیقت کی نقاب کشائی کا نازک فریضہ دو وجہ سے ادا کرنا پڑا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اِس کتاب کا نفسِ مضمون چودھویں صدی کے مجدّد امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرنا ہے اور تجدید اُس وقت تک بیان کی نہیں جا سکتی جب تک اُس دور کی تخریب کاری کا مکمل نقشہ پیش نہ کر دیا جائے۔

دُوسری وجہ مسلمانوں کی خیرخواہی اور اُن کی فلاحِ دارین کا جذبہ ہے۔ یعنی جو مدعیانِ اسلام گمراہ گروں کے پیچھے لگ کر، ان کے معتقد ہو کر گروہوں میں بٹ گئے، مسلمانوں کی چودہ سوسالہ جماعت یعنی سوادِ اعظم اہلسنت وجماعت سے علیحدہ ہو گئے ہیں، اُنھیں یہ دکھا دیا جائے کہ جن حضرات کو آپ غلط فہمی میں پیشوا اور رہنما تسلیم کر چکے ہیں، اُن کے اصلی اور حقیقی خدوخال یہ تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ہمیں بتانا پڑا کہ مسلمانوں کی جمعیت اور شیرازہ بندی کو کس نے نقصان پہنچایا؟ یہ فرقے دورِ حاضر میں کس نے بنوائے؟ کن صاحبانِ جُبّہ ودستار سے بنوائے؟ کس مقصد کی خاطر بنوائے؟ یہ بتا کر مدعیانِ اسلام سے اپیل کروں گا کہ ایسے حضرات کے پیچھے لگ کر دنیا میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا جنازہ نکالنا اور آخرت میں داخلِ جہنم ہونا زیادہ مفید ہے یا اِس کے برعکس؟ یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑوں گا۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات ہمارے اِس اقدام کو نظرِ استحسان سے نہ دیکھیں بلکہ غیر مسلموں کے پڑھائے ہُوئے سبق کے مطابق اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگ جائیں کہ کسی فرقے کے معتقدات یا اُس کے اکابر پر تنقید کرنا منفی اندازِ فکر اور فضا کو مکدّر کرنا ہے۔ ایسے تمام حضرات کی خدمت میں ہم یہ وضاحت پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مقدّس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد ونظریات کی پیوندکاری کرنے والوں اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے والوں کا تذکرہ کیوں ناگزیر سمجھا گیا؟

۱۔ جن حضرات کے ہم نے اسلام دشمنی کے پُراسرار اور حقیقی خدوخال پیش کیے ہیں، اُن میں سے اکثر آنجہانی ہو چکے اور اُن کا معاملہ چونکہ اب براہِ راست اپنے مالک سے ہے، لہٰذا اُن کے بارے میں ہمیں اب کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن بدقسمتی سے اُنھیں کتنے ہی مدعیانِ اسلام نے اپنا پیر اور پیشوا بنا لیا تھا اور اُن کی حقیقت کو

نہ سمجھنے کی بدولت کتنے ہی اسلام کا دعویٰ کرنے والے آج بھی بخوشی اسی گمراہی کے گڑھے میں لڑھکتے جا رہے ہیں جس میں اُن کے پیشوا گرے تھے۔ چونکہ اُنھیں رہنما سمجھنے والے اندھا دھند اُسی عمیق گڑھے میں گرتے جا رہے ہیں جو آنکھ کھلنے پر مکمل تب ہی نظر آ جائے گی، لہٰذا فکر آل کا پاس لحاظ کرتے ہوئے، اُنھیں اُخروی زیاں سے بچانے اور قہرِ جہنم سے نجات دلانے کی محض یہ ایک مدلل اپیل اور تفصیلی گزارش ہے اور بس۔ کیا یہ منفی اندازِ فکر ہے؟

۲۔ قرآنِ کریم ہی کو دیکھ لیجیے کہ اس نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کا بُطلان خوب شرح و بسط کے ساتھ واضح فرمایا اور اُن کے سرغنوں کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذلیل و خوار کیا، حتیٰ کہ مسلمانی کا دم بھرنے والے اُن عناصر کی خلافِ اسلام سرگرمیوں کے راز کھول کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیے اور اُن کے وجود کو ملّتِ اسلامیہ کے لیے کھلے کافروں سے زیادہ نقصان دِہ قرار دے کر وقت آنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو واشگاف لفظوں میں یوں حکم دیا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ — اے غیب کی خبریں دینے والے (نبی) کافروں

وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ[1] — اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن پر سختی فرماؤ۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مسلمانی کا دعویٰ کرنے والوں کے خلاف اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جہاد کرنے اور سختی برتنے کا حکم دیا تھا، جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے اور کافروں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں خفیہ طور پر مصروف رہتے تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو منفی اندازِ فکر کہا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اسلامی تعلیم اور مثبت اندازِ فکر یہی ہے کہ غلط مدعیانِ اسلام کا محاسبہ کرنا نہایت ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔

اب اسی ارشادِ ربانی کی روشنی میں ملاحظہ فرمایئے کہ جن لوگوں نے بخوشی گورنمنٹ

---

[1] پ ۱۰، سورۃ التوبہ، آیت ۷۳

کے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر مبنی منصوبے اور انھیں متحدہ ہندوستان میں ایک عضوِ معطل بنا دینے والی سکیم کو مسلمانوں کے رہنما، پیشوا، ناخدا، شفیقِ ملت اور مسیحائے قوم وغیرہ بن کر کامیاب کیا، یا وہ لوگ جنھوں نے بابائے جمہوریت ستارہ گاندھی جیسے ملتِ اسلامیہ کے دشمن اور ٹھیٹھ بت پرست کی کُٹیا پر رات دن ناصیہ فرسائی کی، اسلام اور ہندومت کا فرق مٹاتے، باپو کی جے مناتے رہے، مسلمانوں کا رُخ حرم سے سومنات کی جانب پھیرتے رہے، کیا ایسے لوگوں کی خلافِ اسلام، ظاہر اور پوشیدہ کارگزاریوں کو ظاہر کرنا حکمِ خداوندی کی تعمیل اور قرآنِ کریم کی تعلیم ہے یا منفی اندازِ فکر؟

۳- وقت آنے پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے منافقوں کو نام لے لے کر مسجدِ نبوی سے باہر نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے منافقوں کی تعمیر کردہ مسجدِ ضرار کو مسمار کروا دیا۔ اُن کی مسجد کو ازروئے شرع مسجد قرار نہیں دیا گیا، اُن کی نمازِ جنازہ پڑھنے اور اُن کے لیے بخشش کی دُعا کرنے سے آپ کو منع فرما دیا گیا۔ معلوم نہیں اسلامی رواداری کے نام نہاد علمبردار نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خود اللہ جل شانہٗ کے ان احکام کے بارے میں کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

۴- عہدِ رسالت کے فوراً بعد منکرینِ زکوٰۃ اور مسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی وغیرہ مدعیانِ نبوت منظرِ عام پر آئے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی برابر کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برحق خلیفۂ اوّل، امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جملہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے باتفاقِ رائے نہ صرف اُن سے جہاد کیا بلکہ ان فتنوں کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، حالانکہ ملتِ اسلامیہ اُن دنوں انتہائی ناساعد حالات سے دوچار تھی۔ یہ ہے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیار کردہ عدیم النظیر افراد کا طرزِ عمل جو مسلمانوں کے لیے قیامت تک روشنی کے مینار کا کام دیتا رہے گا۔ صحابۂ کرام کے تقویٰ و طہارت اور اصابتِ رائے سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس درجہ مطمئن تھے کہ اپنی بارگاہ کے ان تربیت یافتہ افراد کی پیروی کرنے کا بعد والوں کو یوں حکم دیا؛

أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ۔ [۱] — میرے تمام صحابہ ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

بی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی نے نہیں بلکہ خود اللہ جل شانہٗ نے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار
یتے ہوئے اپنے کلام معجز نظام میں واضح طور پر اور دو ٹوک لفظوں میں یہ اعلان فرمایا:

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ [۲] — پھر اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لائے جیسا تم لائے، جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اللہ ربّ العزت نے
ب کو ایمان کی حقیقی دولت سے مالا مال قرار دیا اور اُن کی مغفرت کا عام اعلان فرمایا ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ [۳] — اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی، وہی سچے ایمان والے ہیں۔ ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔

م صحابہ کرام کی مغفرت اور اُن میں سے بھی جنھیں عظیم الشان اور عدیم النظیر درجے
ہوئے اُن کے بارے میں منعمِ حقیقی عزّ شانہٗ نے فرمایا ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا — تم میں برابر نہیں وہ جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ مرتبے میں اُن سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد فتح کے خرچ اور جہاد کیا اور ان سب سے (پہلے خرچ اور جہاد کرنے وال

---

۱ شرح مشکوٰۃ، جلد ہشتم، ص ۴۴۴ ۲ پ ۱، سورۃ البقرۃ، آیت ۳۷،
۱۰۰، سورۃ الانفال، آیت ۷۴،

وَعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۔ لہ　　اور بعد میں) سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مقدس گروہ ہمیشہ اللہ جل شانہ، اور اُس کے آخری پیغامبر کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے رکھتا تھا۔ قرآن کریم نے وضاحت فرما دی ہے کہ وہ حضرات، قدسی صفات اپنی منزلِ مقصود کو پا چکے تھے۔ اُن کی قربانیاں بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی تھیں اور اللہ رب العزت نے اُنھیں اپنی رضامندی کا مژدہ سُنا دیا تھا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ	اور سب میں پہلے مہاجرین و انصار میں سے اور
الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ	جو بھلائی کے ساتھ اُن کے پیرو ہوئے اللہ
اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ	اُن سب سے راضی ہے اور وہ اللہ سے
عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ	راضی ہیں اور اُن کے لیے باغ تیار کر رکھے
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ	ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں
خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ	وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔
الْعَظِيْمُ ۝ لہ	

مہاجر و انصار کے اوّلین گروہ اور باقی اُن کا اتباع کرنے والے، جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور دنیا میں ہی جنھیں جنت کا مژدہ سُنا دیا گیا، کیا انبیائے کرام کے بعد بنی نوعِ انسان کے اِس افضل ترین گروہ سے بہتر کوئی اسلامی تعلیمات کو سمجھ سکتا تھا؟ کیا اِس کامیاب ترین جماعت کے طرزِ عمل کو منفی انداز قرار دینے والے اسلامی زاویۂ نظر رکھنے والے سمجھے جائیں یا غیر اسلامی نظریات کے حامل اور صحابۂ کرام کے اتباع سے عاری؟ حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان وہی معتبر جو صحابۂ کرام کی طرح ہو، اعمال وہی مقبول ہوں گے جو اُن حضرات کے اتباع میں ہوں، اسلامی نظریات و تعلیمات کی وہی تعبیریں معقول اور قابلِ تسلیم ہیں جو اُن حضرات سے منقول ہیں۔ یہی مقدس گروہ قصرِ اسلام کی بنیاد تھا۔ جو عمارت اِس بنیاد پر تعمیر

لہ پ ۲۷، سورۃ الحدید، آیت ۱۰　　　لہ پ ۱۱، سورۃ التوبہ، آیت ۱۰۰

گی وہ اسلامی اور اس سے ہٹ کر جو عمارت بھی بنائی جائے گی، خواہ اس کی بنیاد قرآن کریم پر بتائی جائے یا احادیث مقدسہ پر، توحید پر مبنی ٹھہرائی جائے یا تصوف پر، سراسر غیر اسلامی اور عند اللہ ناقابل قبول ہوگی کیونکہ صحابہ ہی حقانیت کا معیار اور کتاب و سنت کے عملی مفہوم و معانی کا واحد زندہ ثبوت ہیں جن کی نظیر چشمِ فلکِ کہن نے نہ آج تک دیکھی ہے اور نہ دیکھی جا سکتی ہے۔ خود اللہ رب العزت نے اپنے ان مقبول ترین جماعتِ عظیم الشان گروہ کی توصیف فرمائی۔ انھیں سندِ قبولیت بخشی، کامیابی و کامرانی اور رحمت و رضوان کا مژدہ سنایا اور انھیں ہمیشہ باغ و بہشت اور آرام و راحت میں رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا	جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اپنے مال و
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	جان سے اللہ کی راہ میں لڑے وہ اللہ کے
اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ	یہاں ان کا بڑا درجہ ہے اور وہی مراد کو
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ	پہنچے ہیں، ان کا رب انھیں اپنی رحمت اور اپنی
بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ	رضا کا مژدہ سناتا ہے اور ایسے باغوں کا
لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝ خٰلِدِیْنَ	جن میں دائمی نعمت ہے، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے
فِیْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ	بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر
اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ (۱)	ہے

عز و جل شانہ نے دوسرے مقام پر ... کو یوں ... ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ	اللہ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	جنتوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں
خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً	رواں ہیں، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ
فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ	مکانوں کا جو جنت عدن میں ہیں اور اللہ کی

(۱) سورۃ التوبہ، آیت ۲۰

مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ	رضا جو سب سے بڑی (نعمت) ہے - یہ ہے
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ [1]	سب سے بڑی کامیابی -

اسی مقام پر چند آیات کے بعد پروردگارِ عالم نے صحابۂ کرام کی قربانیوں کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اُنھیں اپنی نوازشات کا ان لفظوں میں بھی مژدہ سُنایا ہے :

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	لیکن رسول اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ،
مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ	اُنھوں نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد
وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ	کیا اور اُنھیں کے لیے بھلائیاں ہیں اور یہی
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ	مراد کو پہنچے۔ اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھی
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	ہیں ایسی بہشتیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ [2]	ہمیشہ اُن میں رہیں گے یہی بڑی مراد ملنی ہے۔

یہ ہے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا مقدس گروہ، جن کے اعمال مقبول اور جن کا ایمان باقی اُمتِ محمدیہ کے لیے نمونہ، جو دنیا میں رضائے الٰہی اور وعدۂ جنت کی بشارتوں سے نوازے گئے اُن کا طرزِ عمل اور اللہ و رسول (جل جلالہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کی تعلیمات کے تحت اندازِ فکر یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے اگر وہ اور اس کے متبعین اس اختیاری تلبیس سے باز نہ آئیں تو صحابۂ کرام نے اُنھیں موت کے گھاٹ اتار دینے کے علاوہ کوئی اور سلوک تجویز ہی نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی جن لوگوں نے اسلامی ارکان میں سے صرف ایک زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے سے جواب دے بیٹھے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ مقدس میں صحابۂ کرام نے باتفاقِ رائے اُن لوگوں سے بھی جہاد کیا اور اُن کے ہونے دعوائے مسلمانی کو ایک پرِ کاہ کے برابر حیثیت نہ دی۔

---

[1] پ ۱۰ ، سورۃ التوبہ ، آیت ۷۲

[2] پ ۱۰ ، سورۃ التوبہ ، آیت ۸۹

اب کیا فرماتے ہیں آج کے مدعیانِ علم و دانش کہ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو دورِ حاضر کے دجال اور اُس کے پیروکاروں کے ساتھ از رُوئے شرع کیا سلوک ہوتا؟ صحابۂ کرام نے تو ایک ہی فرض کے انکار کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن جو آج اکثر فرائض کے منکر ہیں اور جن کے نزدیک صرف اسلام کا دعویٰ کر لینا ہی ان کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے، ایسے مدعیانِ اسلام اور اُن صاحبانِ جبہ و دستار کے ساتھ اسلامی حکومت کیا سلوک کرتی جنہوں نے برٹش گورنمنٹ اور ہندو جیسے بہیوں کے ایماء پر، اُن کے وظائف کے تحت، مقدس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی قلمیں لگائیں، اسلام کے بیشمار نئے ایڈیشن تیار کیے، بعض اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹاتے رہے تو کتنے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کو شیرو شکر بناتے اور سب کو اپنے گاندھی مہاراج کے قدموں میں جھکانے کی طرح تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ ایسے اسلام دشمن عناصر کا اسلامی حکومت کے تحت کیا حشر ہوتا؟ اگر بد قسمتی سے آج کہیں بھی ایسی اسلامی حکومت نہیں تو ایسے افراد کی نشان دہی جرم کون سے اسلام کے تحت ہو گئی؟ کیا مسلمانوں کو از راہِ ہمدردی غلط کاروں سے خبردار کرنا منفی اندازِ فکر ہے؟ کیا آج کل کے اسلام میں رہزنوں کو رہنما اور بدخواہوں کو خیرخواہ ماننا اور منوانا مثبت اندازِ فکر قرار دیا گیا ہے؟

تعالیٰ ہر صدی میں مجدد بھیجتا ہی اسی لیے ہے کہ تخریب کاروں نے جو دینِ متین میں غتربود کر رکھی ہو، اُس کا تجزیہ کریں، صحیح و غلط اور حق و باطل میں اپنی خداداد قوتِ فیصلہ اور جرأتِ مردانہ سے تمیز کر دکھائیں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔ مثلاً امام محمد غزالی اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۵ھ) نے فلاسفہ، معتزلہ اور زنادقہ کے قائدین و سرغنوں کو میدان میں علمی محاذ پر شکست دی۔ مباحثہ و مناظرہ اور تقریر و تحریر میں عمر بھر اُن کا سر کرتے رہے اور اپنے اس علمی کارنامے کے باعث اُمتِ محمدیہ میں حجۃ الاسلام لقب سے یاد کیے جاتے ہیں حالانکہ امام موصوف کے مخالف علماء کا دعویٰ بھی دورِ حاضر چند علماء کی طرح یہی تھا کہ اصلی اسلام کے حقیقی علمبردار وہی ہیں۔

اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) نے اکبری دور

کے پیدا کردہ غلط کار علماء اور صوفیہ کا زبردست تعاقب کیا اور اسلامی خطوط سے ہٹی ہوئی حکومت کو تائیدِ ایزدی اور ہمتِ مردانہ سے راہِ راست پر گامزن کر دیا۔ کیا اُس دور کے بے فیض و فضل یعنی نام نہاد ابوالفضل و فیضی اور غلط کار علماء و صوفیہ مسلمان ہونے کے دعویدار نہیں تھے؟ اُن کے دعوئ اسلام کے باوجود اُنھیں آج بھی غلط کار اور سرہندی مرد کو گیارھویں صدی کا مجدد تسلیم کیا جاتا ہے۔

لیکن حالات کی اِس ستم ظریفی کو سمجھنے سے ہم یقیناً بڑی حد تک اپنے آپ کو قاصر ہی سمجھیں گے کہ پچھلے قریب کا دور یعنی رہنمائی کے بھیس میں رہزنی کرنے والوں کو رہبر ہی مانا جاتا ہے مگر برٹش گورنمنٹ جیسی اسلام دشمن طاقت اور ہنود و یہود جیسے مسلمانوں کے ازلی دشمنوں نے جن بکنے بکانے والوں کو خریدا، اُن سے رہنمائی کے پردے میں رہزنی کا کام لیا، ایسے لصوصِ دین اور بدخواہانِ اسلام و مسلمین کی نشاندہی کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے شر سے بچانے کو منفی اندازِ فکر کون سے اسلام کے تحت قرار دیا جاتا ہے؟

۶۔ ہر حکومت امنِ عامہ اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے پیشِ نظر جرائم پیشہ افراد پر کڑی نظر رکھتی، ارتکابِ جرم کی پاداش میں اُنھیں سزائیں دیتی ہے تاکہ اُنھیں عبرت ہو اور آئندہ لوگوں کو جانی اور مالی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کیا حکومت کا یہ اقدام فضا کو مکدر کرنا یا اپنی رعیت کی خیرخواہی کا ثبوت؟ نیز جو حضرات ایسے عناصر کی نشاندہی کریں تاکہ ذمہ دار حضرات اُن سے باخبر ہو کر مناسب قدم اٹھا سکیں تو نشاندہی کرنے والوں کو خطاکار کہا جائے گا یا ملک و ملت کا خیرخواہ؟

۷۔ ہر حکومت کا ایک آئین ہوتا ہے، جسے وہ ملک میں نافذ کر کے تمام باشندوں کو اُس کی پابندی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر کوئی ایک شخص یا جماعت اُس آئین کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے گھر میں بیٹھ کر اُس آئین میں ترمیم کرے اور کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر اُنھیں اِس ترمیمی آئین پر عمل کرنے کی ترغیب دے، بلکہ اِس ترمیمی آئین ہی کو حکومت کا اصل آئین بتایا جائے تو اِن حالات میں حکومتِ وقت ایسے فرد یا جماعت کو اپنا خیرخواہ سمجھے گی یا باغی شمار کر کے اُس کے دماغ کو سیدھا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی؟ جب ا

پُراسرار باغیوں کی نشان دہی کرے وہ غلط کار لوگوں کی نظر میں تو واقعی کھٹکے گا لیکن کیا حکومتِ وقت اُس نشان دہی کرنے والے کو بُرا سمجھے گی ؟ کیا عقلاء کے نزدیک اُس کا یہ اقدام ملک و ملت کی خیر خواہی شمار ہوگا یا قابلِ ملامت و نفرت ؟ جب دنیاوی حکومت کے پُراسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا (جیسا کہ حکومت کی منشا اور تنخواہ کے تحت سیکیورٹی فورس کرتی ہے) پسندیدہ اور قابلِ تحسین فعل ہے تو حکومتِ الٰہیہ کے ایسے پُراسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا منفی اندازِ فکر کہاں سے ہوگیا ؟

کیا جو حضرات اُن اکابر صحابۂ کرام کو گالیاں دینا ثواب شمار کریں جن کے تقوٰی و طہارت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ چشمِ فلکِ کہن نے جن کی نظیر ہرگز نہیں دیکھی، علاوہ بریں ماسوائے چند اصحاب کے باقی اُس سارے مقدس گروہ کو مرتد شمار کریں، کلامِ الٰہی جس میں کوئی ایک لفظ کی کمی بیشی کر سکا ہے نہ کر سکے، اُسے محرّف بلکہ اوّل سے آخر تک گھڑی ہوئی کتاب بتائیں، انجیل موجودہ کو غیر محرّف ٹھہرائیں، مجاہد ان کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں، اُن کے مال و جان کو اپنے لیے مباح اور اُن کی خونریزی کرنے کو کارِ ثواب بتائیں، بلکہ مسلمانوں کے قتل کو کُلّا کافروں، خصوصاً بُت پرستوں کے قتل سے زیادہ باعثِ ثواب شمار کریں، اپنے مہدی ہونے بلکہ صاحبِ وحی و عصمت ہونے کے راگ الاپیں اور یوں اپنی جعلی نبوت کے پُراسرار سانگ بھریں، اپنے بڑوں سے ایسی کرامتیں منسوب کریں کہ انبیائے کرام کے معجزے بھی پیچھے رہ جائیں، اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے بلکہ مصافحہ کرنے کا جھوٹا دعوٰی کریں تاکہ سید الانبیا علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی تنقیص شان ہو۔ اپنا کلمہ پڑھوانے کی تلقین کریں بلکہ اپنی ذات پر درود پڑھوائیں، سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش پر مسرت کرنے کو کنہیا کا سانگ گنائیں، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے آپ کے زمانے میں چھ مثیل و نظیر اور بنائیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم شیطان لعین کے علم سے کم بتائیں۔ محیط زمین کے علم کا فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے انکار کرکے بلکہ شرک بتا کر اسی علم کو شیطان مردود کے لیے نصوص سے ثابت بنائیں، یوں نصوص سے شیطان کو خدا کا شریک ہونا ثابت ٹھہرائیں،

سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علومِ غیبیہ کثیرہ عظیمہ وافرہ کو بچوں، پاگلوں اور جانوروں کی معلومات کے برابر سنائیں اور ذرا نہ شرمائیں، نبی آخرالزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کو جہلاء کا خیال اور فضل وکمال سے خالی بلکہ قرآن کریم کا انکار بتائیں اور برتری کے نام سے تیرھویں صدی میں نئی خاتمیت گھڑیں اور اسے آپ کے شایانِ شان گنائیں یوں برٹش گورنمنٹ جس سے دعوئی نبوت کروا تی ان کے لیے چور دروازہ بنائیں، احادیثِ مطہرہ کے دفاتر کو من گھڑت پلندے ٹھہرائیں، پیشانی پر قشقہ کھینچ کر ہندو کی جے کے نعرے لگائیں، ان کی ارتھیاں اٹھائیں، سمادھیوں پر پھولوں کی چادریں چڑھائیں، گاندھی کو صرف اپنا پیشوا اور امام علی الاطلاق بتائیں بلکہ اس شخصیت مشرک گئو پرست کو نبوت کا اہل سنائیں، باری تعالیٰ شانہ کو مجسم ٹھہرا کر حادث بتائیں کہ اس کا جھوٹا ہو جانا ممکن بتا کر کاذب بالفعل تک ٹھہرائیں بلکہ وقوعِ کذب کے معنیٰ درست ہو جانا تک سنا کر اپنا منکرِ الوہیت شخصیت دہریہ ہونا دکھائیں، کیا ایسے حضرات کو محض ان کے جبہ ودستار کی بنا پر یا مولوی، مولانا، مفتی، حضرت جی، امام الہند شیخ الاسلام، شیخ الہند، امامِ ربانی، قطب الاقطاب، فقیہ النفس، مسیحائے قوم شاعرِ ملت، مصلح، ریفارمر، حکیم الامت، مفسر، محدث، نابغۂ عصر، شمس العلماء مجدد، شیخ الکل اور امیرالمومنین وغیرہ کہلانے کے باعث ہی مسلمانوں کے رہنما ملتِ اسلامیہ کے پیشوا اور اسلام کے خیرخواہ شمار کر لیا جائے؟ بھلا کون سا مسلمان انھیں اپنا پیشوا مان سکتا ہے؟ کیا کسی صاحبِ عقل و دانش کو زیب دیتا ہے کہ وہ رہنماؤں کو چھوڑ کر نصوصِ دین کو رہنما تسلیم کریں؟ ایسے حالات میں شیطان، منافقینِ مدینہ، یزید پلید اور دوسرے ملتِ اسلامیہ کے دشمنوں کی طرح ان حضرات کے سیاہ کارناموں سے اہلِ اسلام کو باخبر کرنا ایک اخلاقی اور دینی فریضے کی ادائیگی ہے۔ کیا ایمان کے لٹیروں سے لوگوں کو خبردار کرنا منفی اندازِ فکر ہے؟

۹۔ پاکستان کو معرضِ وجود میں آتے ہوئے اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا لیکن تاحال تحریکِ پاکستان کی کوئی شایانِ شان تاریخ منظرِ عام پر نہیں آسکی اور نہ ابھی تک نظریۂ پاکستان

اجاگر کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی گئی بلکہ اندرونِ خانہ اسے مٹانے اور بے راہروی کو فروغ دینے کی کوشش سی ہوتی رہی ہے جبکہ پاکستان کا مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ بتایا جاتا تھا۔ گویا ؎

ہم بدلنا چاہتے تھے نظمِ میخانہ تمام
آپ نے بدلا ہے لیکن صرف میخانے کا نام

اگر کوئی بھی حکومت تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کرو اتی اور اُسے اسکولوں کالجوں میں رائج کرتی نیز نظریۂ پاکستان کے تحت پاکستان کی انتظامی مشینری چلائی جاتی تو یقینا اِس مملکتِ خداداد کا نقشہ پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو چکا ہوتا لیکن اِس ستم ظریفی کی داد کون دے سکتا ہے کہ دنیا کی اِس سب سے بڑی اور نظریاتی مملکت میں پاکستان بنانے والوں اور اِس کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا گیا بلکہ پاکستان کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے والوں کو پامال اور اِس کے دشمنوں کو مالا مال کیا گیا۔ جب بدخواہوں کو کسی اکھوں پر جگہ ملی تو انھوں نے نظریۂ پاکستان کو دلوں اور دماغوں سے نکال دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اِس افسوسناک صورتِ حال کا المناک نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ کشمیر کا مسئلہ صرف سلامتی کونسل کے کاغذات کی زینت بن کر رہ گیا اور ملک کا ایک بازو کٹ چکا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور نظریاتی ملک کا نقشہ سمٹ سکڑ کر رہ گیا۔ (اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون)

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جب پاکستان کے پُراسرار دشمنوں یعنی اِسی ملک میں رہ کر اِس کی جڑیں اکھیڑنے والوں کو شہ دیا تو جن حضرات نے بریلوی اور گاندھوی دَور سے دینِ متین پر اپنی مخصوص عنایات کی بارش کا برسانا شروع کیا ہوا ہے اُنہوں نے کیا گل نہیں کھلائے؟ کسی اہلِ نظر سے پوچھیے کہ اسلامی اقدار و شعائر کا کیا حشر کیا جا رہا ہے؟ کیا رہنمائی کے بھیس میں قوم کی رہزنی کرنے والوں کی نشاندہی اچھی بات نہیں ہے؟ کیا لٹیروں کو رہنما بنا لینے میں قوم

کی بھلائی ہے؟ افسوس! ؎

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

۱- یزید پلید تختِ خلافت پر متمکن بھی ہوا، اس کے باوجود ہر مسلمان اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، بلکہ کوئی مسلمان اس کے نام پر اپنے کسی بچے کا نام رکھنا پسند نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود شاہِ گلگوں قبا، سید الشہداء، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ہمیشہ خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے اور لاکھوں مسلمان اپنے بچوں کا نام محمد حسین، علی حسین، غلام حسین اور غلام شبیر وغیرہ رکھ کر امام عالی مقام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی اور سلطان ٹیپو شہید کی بارگاہوں میں ہر پڑھا لکھا مسلمان تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کرتا ہے لیکن جعفر بنگال و صادق دکن نفرت و حقارت کی نگاہوں سے ہی دیکھے جاتے رہے ہیں جیسا کہ شاعرِ مشرق، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا ہے: ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

کیا علامہ اقبال مرحوم کا یہ اندازِ فکر منفی ہے؟ ہمارے کرم فرما ناصحین کی تلقین کا ماحصل یہی ہوگا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یزید پلید اینڈ کمپنی کو ایک ہی نظر سے دیکھا جاتے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ اور ابو الفضل و فیضی کو یکساں حیثیت دی جائے۔ سلطان فتح علی ٹیپو اور میر صادق جیسے ملت فروش میں کوئی فرق روا نہ رکھا جاتے۔ نواب سراج الدولہ اور علی وردی خاں کو میر جعفر کے برابر ہی بٹھایا جاتے۔ فخرِ ایشیا، فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی سے ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالکریم چھاگلہ، مولوی حسین احمد ٹانڈوی، مولوی احمد سعید دہلوی، مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی داؤد غزنوی، عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی اور شیخ عبداللہ کشمیری جیسے ملت فروشوں کو فروتر نہ سمجھا جاتے۔

لیکن ہمارے ناصحین حضرات کو یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک دنیا میں ایک بھی ذی
اور انصاف پسند باقی رہے گا اُس وقت تک حضرت امام حسین، حضرت مجدد الف ثانی
سلطان محمود غزنوی، سلطان فتح علی ٹیپو اور نواب سراج الدولہ وغیرہ کو علیٰ قدر مراتب
ادب و احترام کی نگاہوں سے ہی دیکھا جائے گا لیکن یزید پلید، فیضی، ابو الفضل
میر جعفر، میر صادق اور اُن کی معنوی ذریت کے نام سے بھی گھن آتی رہے گی۔ حق
باطل میں تمیز ہوتی رہے گی اور انھیں شیر و شکر نہیں کیا جا سکے گا کیونکہ : کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

دریں حالات جن صاحبانِ جُبّہ و دستار نے برٹش گورنمنٹ کی جڑیں پاتال تک پہنچانے
گاندھی جیسے اسلام دشمن بُت پرست کو اپنا امام اور پیشوا بنا کر اسلام کو ہندو مت میں
کرنے اور ہندو مسلم کا فرق مٹانے بلکہ دونوں کی ایک مشترکہ قوم بنانے کی خاطر اپنی تمام صلا
صرف کر ڈالیں، ملّتِ اسلامیہ کا رُخ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جانب سے لندن اور دوا
کی طرف پھیرنے کی سر توڑ کوشش کی اور اس طرح مسلمانوں کی ایمانی دولت کو لوٹ کر، ا
اجتماعی قوت کو منتشر کر کے اِسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے رہے، آخر ایسے حضرا
اسلامیانِ پاک و ہند کے پُر اسرار بدخواہوں سے کیا رشتہ ہے؟ ایسے رہزنوں سے عقی
رکھنے میں بھلا دنیا و آخرت کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟ آخر اُنھیں ظاہر کرنے
سے روکا کیوں جاتا ہے؟ ؎

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

۱۔ اگر تخریب کاروں کی نشان دہی ناپسندیدہ امر ہے تو ہر ایک حکومت میں سی، آئی، ڈی
کے محکمے کا مقصد کیا ہے؟ پولیس کس لیے رکھی جاتی ہے؟ فوج میں سیکیورٹی کا عملہ اور اس
کا کام کیا ہے؟ آخر ہر حکومت اِس اقدام پر کیوں مجبور رہتی ہے؟ عدالتی نظام کا مقصد
کیا ہے؟ مجرموں کا ریکارڈ رکھ کر اُن کی اور اُن کے لواحقین کی دل آزاری کیوں کی جاتی
کیا ناصحین حضرات بتا سکتے ہیں کہ حکومت کا یہ نظام غلط ہے یا ملک اور قوم کی خیر خواہی

جذبہ ہی اِس کے پیچھے کارفرما ہے؟

یقیناً ہر عاقل اِن انتظامی اُمور کو ضروری قرار دے گا کیونکہ یہ اقدام ملک اور قوم کی بہتری اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہیں۔ جب اِس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر چارۂ کار نہیں تو اِس جانب سے آنکھیں کیوں بند کر لی جاتی ہیں کہ جان اور مال سے ایمان تو لاکھوں گنا عزیز ہے۔ جان و مال کے دشمنوں کی نسبت ایمان کے دشمنوں اور رہزنوں کا محاسبہ بدرجہا ضروری ہے۔ اِسلامی حکومت جو ایسے افراد کا محاسبہ کیا کرتی تھی کیا اُن کا اندازِ فکر منفی تھا۔ آج حکومت اگر اسلامی ہونے کا ثبوت دینے سے محروم ہو جاتی ہیں تو ملک و ملت سے ہمدردی رکھنے والا کوئی فرد جب صرف مسلمانوں کی ہمدردی کے تحت ایسے رہزنوں کی نشان دہی کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اُس کا اندازِ فکر کس طرح منفی قرار دے دیا جاتا ہے؟

کیا ایسے ناصحین حضرات حکومت کو یہ مشورہ دینے کے لیے تیار ہیں کہ وہ ملزموں کا ریکارڈ نہ رکھے۔ غلط کار اور جرائم پیشہ افراد کو سزائیں نہ دے کیونکہ ایسا کرنا ناصحین کی اصطلاح کے مطابق اُن مجرموں اور اُن کے لواحقین کی دلآزاری کا باعث ہے۔ کیا حکومت عدالتیں توڑ دے، پولیس، سی۔آئی۔ڈی اور سکیورٹی وغیرہ کے محکمے ختم کر دے؟ کیا ایسا کرنے سے نظامِ سلطنت درہم برہم نہ ہو جائے گا؟ کیا ایسا کرنے سے لوگوں کے مال و جان محفوظ رہ سکیں گے؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ دینی معاملات میں کھرے کھوٹے کی پہچان کرانا اِس سے بھی ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔ اِسے منفی اندازِ فکر قرار دینا کھوٹے سکوں پر پردہ ڈالنا اور خود اپنے بھی کھوٹ کو چھپانے کا ایک حربہ نہیں تو اور کیا ہے؟

مملکتِ خداداد پاکستان میں اِسی ستم ظریفی کا سلسلہ روزِ اوّل ہی سے چلا آ رہا ہے کہ محکمۂ تعلیم نے اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتب میں ایسے ہی علماء اور لیڈروں کو ملتِ اسلامیہ کے رہنماؤں میں شمار کیا ہے جنھوں نے پُراسرار طریقے پر قوم کو اپنے پیچھے لگا کر برٹش گورنمنٹ کی جڑیں مضبوط کیں یا گاندھی کو اپنا پیشوا بنا کر ملتِ اسلامیہ کو اُس کے قدموں میں جھکانے اور ہندو مسلم فرق مٹا کر، دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانے پر اپنی عمرِ عزیز

برباد کرتے رہے۔ اِس کے ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کے عہد میں جو علمائے کرام مسلمانانِ
پاک و ہند کی ناخدائی کا فریضہ ادا کرتے رہے، پُورے نصاب میں ابتدائی جماعتوں کی
کتابوں سے لے کر انتہائی جماعتوں کی کتب میں بھی اُن حضرات کے بارے میں ایک ٹوٹا پھوٹا
لفظ تک نہیں تھا۔ کیا انگریزوں اور ہندوؤں کے چہیتے لیڈر اور علماء کو اُن کی تمام تر
سیاہ کاریوں اور رہزنی کے باوجود مسلمانوں کا رہنما بتانا اور بچے بچے کو یہی رٹانا منفی انداز
اور مسلمانانِ پاکستان کو گمراہ کرنا نہیں ہے؟ آخر ملک و ملت کے بدخواہوں کو خیر خواہ اور
رہزنوں کو رہبر بتانے میں دنیا اور آخرت کا کون سا نفع متوقع ہے؟ کیا خود اپنی قوم کو یوں
اندھیرے میں رکھنا اور بالخصوص دین کا معتقد بنانا ایک قومی المیہ ہے یا نہیں؟

اے صاحبانِ عقل و دانش! انصاف سے کام لیجیے، کھرے کھوٹے میں تمیز کیجیے۔
رہزنوں کو رہنما اور رہنماؤں کو رہزن بتانے کا مشغلہ ملک و ملت سے غداری اور دارین کی
بربادی کا باعث ہے۔ خدارا خود اپنی اور دوسروں کی عاقبت برباد نہ کیجیے۔ آخر اِس
تخریب کاری کا پُراسرار جال بچھانے والا انگریز بوریا بستر لے کر بھاگ گیا اور اپنے جزیرے
میں اوندھے منہ جا پڑا ہے۔ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے وظیفے بند ہو گئے۔ وظیفہ خوار
آنجہانی ہو چکے۔ اب اُن کا معاملہ براہِ راست اپنے پروردگار سے ہے۔ اُنھوں نے جیسے
بیج بوئے تھے اُن کے پھل کھا رہے ہوں گے۔ اُنھوں نے اپنی عاقبت محض دنیا
سنبھالنے کے لیے بیچی تھی لیکن اُن کے معتقدین و متبعین جو شعوری یا غیر شعوری طور پر
اُنھیں رہنما تسلیم کر بیٹھے۔ ان بیچاروں کو تو دنیاوی نفع نہ اُخروی یعنی نہ وظیفے نہ ثواب
صرف نسلی یا علمی تعصب کی لاٹھی پکڑ کر کسی نہ کسی اندھے کے پیچھے اپنی آنکھیں بند کرکے
چلے جا رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے کنوئیں میں گر رہے ہیں، لیکن اُن کی لاٹھی چھوڑنے
[illegible] بھلا اِس
نرالی عقلمندی اور دانشوری کا کوئی ٹھکانا ہے؟

مجھے دنیائے اسلام سے اپیل ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کا، اندھے اور آنکھوں والے کا فیصلہ
کریں۔ اگر کسی کی محبت یا نفرت پہلے سے دل میں جا گزیں ہے تو [illegible]

بالائے طاق رکھ دیجیے۔ غیر جانبدار ہو کر اور تنقیدی نظر سے اِس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ یہ ایک
شفاف آئینہ ہے۔ احقر نے بساط بھر یہی کوشش کی ہے کہ یہ آئینہ انصاف اور دیانتداری سے
تیار ہو جائے۔ جن کتابوں سے اِسے مرتب کیا ہے وہ خود مبتدعین حضرات کی ہیں۔ فیصلہ
صرف قاری کی دیانت پر منحصر ہے۔ اگر موجودہ مبتدعین کا دل بھی بے ساختہ شہادت دینے لگے کہ جن
حضرات کو انھوں نے پیشوا بنایا ہوا تھا وہ ہرگز پیشوا نہیں تھے تو جانِ برادر! ناجی گروہ میں آملئے
مسلمانوں کی جس حقیقی جماعت یعنی اہلسنّت و جماعت سے آپ یا آپ کے بڑے بوڑھے کسی کے
بہکانے پھسلانے پر علیحدہ ہو گئے تھے، اُسی میں شامل ہو جانے سے کون سا نقصان پہنچ جائیگا؟
کیا یہ دارین کی بھلائی کا ذریعہ نہ ہوگا؟ آئیے! اپنے قدیم مرکز پر جمع ہو جائیے تاکہ بچھڑے بھائی بھائی
پھر گلے لگ جائیں اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت بڑھ جائے۔ ایک مرکز پر جمع ہو جانے میں ہی
دارین کی کامیابی و کامرانی ہے۔ شعر

اے کاش ترے دل میں اُتر جائے مری بات

جن حضرات کو پیش کردہ حوالوں میں سے کسی حوالے کی صحت کے بارے میں شک گزرے
یا اِس کے برعکس حوالے اُن کے پیشِ نظر ہوں اور وہ، افہام و تفہیم کے طور پر گفتگو کرنا چاہیں
تو مکتبہ حامدیہ، گنج بخش روڈ، لاہور کی معرفت بصد شوق تحریری گفتگو کر سکتے ہیں۔ علمائے
اہلسنّت کے پاس اگر کوئی ایسی کتاب ہو جو مبتدعین کی تاریخ یا مجددِ مأتہ حاضرہ قدس سرہٗ
کے تجدیدی کارنامے میں معین و مددگار ثابت ہو سکتی ہے تو نذر کو بھیجئے یا ارسال فرمائیں۔
استفادہ کے بعد فوراً بصد شکریہ واپس کر دی جائے گی۔ امید ہے کہ علمائے کرام تَعَاوَنُوْا
عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى کے تحت راقم الحروف کو فراموش نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں مولانا
نور الاسلام صاحب سے التماس ہے کہ انہیں کوئی کتاب مرتب فرمانا ہو تو احقر ہی کو عطا فرمانا بھی جائیگا۔
مجددِ مأتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارناموں کو بیان کرنے کے
سلسلے میں جتنی کتابوں کا موجود ہونا ضروری تھا وہ یقیناً ہمارے پاس ابھی نہیں ہیں لہٰذا ہم
جتنی کتابیں فراہم کر سکے ہیں یا پھر اسی تنگ دامانی کے باعث جلد اوّل ہی پیش کرنے کی سعادت
حاصل کر رہے ہیں۔ جو ہمارے تذکرے کو مکمل ہونے تک پہنچنے کی اپنے موضوع کی جملہ تصانیف پڑھ کر

ادھیڑے ہوئے ہے۔ یہ محض علمائے کرام کی نظرِ کرم اور اُن بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اہلِ علم حضرات سے ہم اعلیٰحضرت قدس سرّہٗ کی خاطر تعاون کی پھر اپیل کرتے ہیں کہ کتابوں کے ذریعے ہمیں زیادہ سے زیادہ نوازیں تاکہ مشعلِ راہ کی بقیہ جلدیں ترمیم و اضافوں کے ساتھ شایانِ شان طریقے سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں۔ نیز فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جتنی بھی تصانیف کی فہرست ملے اور آپ کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوط کی نقل مرحمت فرمائیں جن کے نام المجمل المعدد اور سوانح اعلیٰحضرت میں درج نہ ہوں۔

اِس مجموعے کی تدوین میں جن حضرات نے بعض کتابیں عنایت فرما کر اپنے قیمتی مشوروں سے ہماری مدد کی، احقر اُن کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ حوصلہ افزائی کرنے والے قدردانوں کا بھی شکرگزار اور ممنون ہوں۔ اپنے مخدوم و محترم عالیجناب محمد مسعود احمد صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج مٹھی ضلع تھرپارکر (صوبہ سندھ) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس ایسے الفاظ کہاں؟ یقین جانیے کہ موصوف کی ہدایات نے راقم الحروف کو مشعلِ راہ کا کام دیا۔ اِس عظیم و ضخیم مجموعے کو منظرِ عام پر لانے والے مولانا انوار الاسلام قادری رضوی جیسے عاشقِ رضویت کا احقر کیا شکریہ ادا کر سکتا ہے؛ باری تعالیٰ شانہٗ اُنھیں اِس خلوص و محبت اور جذبۂ صادقہ کا آخرت میں بہترین صلہ دے اور اِس دنیا میں اُنھیں اِس سے بدرجہا زیادہ مذہب مہذب اہلسنّت و جماعت کی خدمت کا حوصلہ اور مواقع عطا فرمائے۔ (آمین)

اہلِ علم حضرات کو اِس میں جس قدر خامیاں نظر آئیں، اُنھیں اِس ناچیز کی کوتاہ علمی پر محمول کرتے ہوئے مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ جو کام کی باتیں نظر آئیں اُنھیں اِس ناکارہ کے ولیٔ نعمت، مرشدِ برحق، مفتیٔ اعظم دہلی حضرت شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ کرم اور فیضِ رضا کا کرشمہ شمار کیا جائے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ وَ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔ وَصَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

باب اوّل

حامداً و مصلیاً - قارئین کرام! زیرِ نظر رسالے میں چودھویں صدی کے تجدیدی کارنامے
کرنا ہمارا موضوعِ سخن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت اُسی وقت پیش آتی ہے
قریب اپنے عالمِ شباب میں ہو، تخریب کاری جب تک اپنے نقطۂ عروج پر نہ پہنچ جائے
منظرِ عام پر آتی ہے! کیونکہ سلسلۂ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب تجدیدی اصلاح
تجربات سے ظاہر ہوا کہ تجدید سے پہلے انتہائی تخریب کا پایا جانا ضروری ہے۔ اِسی
کے پیشِ نظر ہمیں امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ کے تجدیدی کارنامے پر بحث کرنے
پہلے اُن افراد و عناصر کو بھی دیکھنا ہوگا جنہوں نے تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی
اصلاح کے نام پر اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی جسارت کی، اُمتِ محمدیہ کے تیرہ سو سالہ اجماعی
عقائد و نظریات سے انحراف کر کے غیر اسلامی نظریات کی مقدس شجرِ اسلام میں پیوندکاری
اِس طرح اِن متجددینِ زمانہ نے اپنے اپنے انداز میں تخریبِ دین کا ناپاک فریضہ انجام دیا۔
سے پہلے تصویر کا یہ رُخ دکھانا ضروری ہے۔ ع

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

جن حضرات نے سابقہ مجددین کے حالات پڑھے اور اُن بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کا
مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک اُن خرابیوں کا ذکر نہ کیا جائے جن پر مذہبی
روغن چڑھا کر، اسلامی لیبل لگا کر دین میں شامل کیا جا رہا ہو، اُس وقت تک یہ واضح
ہی نہیں جا سکتا کہ فلاں مجدد نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ مثلاً اکبری دور کی اسلام دشمنی
دینِ الٰہی " کی فتنہ سامانی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ
(المتوفی ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) کا کیا کارنامہ پیش کیا جا سکتا ہے؟ اِسی ضرورت کے
تحت متجددینِ زمانہ کی تخریبی کارروائی کا پیش کرنا لازم آیا ورنہ ہمیں اِس گندگی کو کریدنے،
... بجانے اور اِس کوڑی کو اُلٹنے پلٹنے کی ضرورت کیا پڑی تھی؟ خدا گواہ ہے

اُس کا حبیب شاہد ہے کہ کسی کی محبت یا نفرت کو درمیان میں حائل کیے بغیر، مستند عینی صورتیں، تخریب کاروں کے چہرے، خود اُنھیں کے آئینوں میں دکھائے ہیں۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں بغرضِ خیر خواہی صرف یہی کیا ہے کہ جن اپنے آئینوں کو ہاتھوں نے منتشر کر کے گھروں میں چھپایا ہُوا تھا، اُنھیں جمع کر کے قارئین کرام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب ہر چشمِ بینا خود ہی دیکھ لے گی کہ اسکے ہی آئینوں میں جتنہ عینِ زمانہ کی صورتیں کیسی نظر آتی ہیں

اُنھیں کی محفل سنوارتا ہُوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی
اُنھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہُوں، زبان میری ہے بات اُن کی

انگریزوں کا قبضہ اور مظالم

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

دُوسری یورپین اقوام کی دیکھا دیکھی انگریزوں کو بھی متحدہ ہندوستان میں تجارت کرنے کا شوق دامنگیر ہُوا۔ ملکہ الزبتھ سے بعض انگریز تاجروں نے اجازت لے کر ۱۶۰۰ء میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ ۱۶۴۴ء میں باٹن نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے مغل فرمانروا شاہجہان کی بڑی لڑکی جہاں آرا بیگم کا علاج کر کے کمپنی کے لیے مزید مراعات حاصل کیں۔ تلاشِ معاش میں باشندوں نے سرزمینِ پاک و ہند کو سونے کی چڑیا دیکھا تو چوری چھپے دونوں ہاتھوں سے لُوٹنے اور ہر وقت یہاں اپنے پَیر مضبوط کرنے میں کوشاں اور سرگرمِ عمل رہنے لگے۔

سلطان محی الدین اورنگ زیب کے زمانے میں انھوں نے چند سرکاری جہازوں کو لُوٹ لیا۔ بادشاہ کے حکم سے ان کی کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ مکر و فریب کی ان زندہ تصویروں نے سترہ ہزار پونڈ جرمانہ ادا کر کے رحم دل بادشاہ سے معافی حاصل کر لی۔ بنگال کا صوبیدار علی وردی خاں ایک بیدار مغز اور مردم شناس حاکم تھا۔ انگریزوں کی فطرت اور خفیہ چالوں کو بھانپ کر وہ ان عیاروں پر کڑی نظر رکھا کرتا تھا۔ موصوف نے اپنے جانشین اور نواسے سراج الدولہ کو بھی انگریزوں کی فطرت اور کارگزاریوں سے باخبر رکھتے ہوئے

بارے میں سخت ہدایت کر رکھی تھی۔

علی وردی خاں کی وفات کے بعد ۱۷۵۶ء میں سراج الدولہ بنگال کا نواب بنا تو
ں نے علی وردی خاں مرحوم کے دوسرے نواسے شوکت جنگ کو گانٹھ کر قلعہ بندیاں
ر دیں۔ اِس پر فوراً تادیبی انداز میں نواب سراج الدولہ نے قاسم بازار اور
انگریزی کوٹھیوں پر قبضہ کر کے اُن کا انتظام مانک چند نامی ایک ہندو افسر کے سپرد
لارڈ کلائیو مدراس سے فوج لا کر کلکتہ پر حملہ آور ہُوا، لیکن مانک چند اِس حملے کی اطلاع
انتظام چھوڑ کر بھاگ گیا تو کلائیو نے بغیر کسی مزاحمت کے آسانی سے کلکتہ اور ہگلی پر
لیا۔ اِس واقعے سے اُس کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی کہ سات روز تک کلکتہ میں لوٹ مار
گرم رکھا۔ نواب سراج الدولہ نے ان کے استیصال کی ٹھان لی اور ایک لشکر جرّار
یزوں پر حملہ بول دیا تھا تاکہ یہ آئے دن کا جھگڑا ایک روز مٹا ہی دیا جائے۔ کلائیو
بلے کی تاب نہ دیکھتے ہُوئے صلح کی پیشکش کر دی اور عہد نامہ مدراس کی رُو سے صلح
۔

یہ صلح کلائیو نے محض اس لیے چاہی تھی کہ نواب کی عظیم طاقت کو سازشوں کے جال
کر کمزور کر لے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ سراج الدولہ کے سپہ سالار لشکر اور
ی خاں کے بہنوئی یعنی میر جعفر کو گانٹھ لیا نیز نواب کی فوج کے دو جرنیل راج درلبھ
یچند بھی خرید لیے گئے۔ ان غداروں کا ہاتھ میں آنا ہُوا اور کلائیو نے زیادہ مہلت
۱۷۵۷ء میں عہد نامہ مدراس کی دھجیاں اڑا کر پھینک دیں اور پلاسی کے میدان
سراج الدولہ کے خلاف جنگ آزمائی کے لیے صف آرا ہو گیا۔
سے نواب کی فوجی قوت اگرچہ کئی گنا تھی لیکن گھر کے بھیدی لنکا ڈھا رہے تھے
اپنوں کی بدولت شکست کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ اپنی غداری کے سرٹیفکیٹ پر مُہرِ تصدیق
تے ہُوئے میر جعفر کے لڑکے میرن نامی نے نواب شجاع الدولہ کو اپنے ہاتھوں
دیا۔

سہ دوستوں سے اِس قدر صدمے ہُوئے ہیں جان پر
دل سے دشمن کی عداوت کا گِلہ جاتا رہا

شجاع الدولہ کی جگہ کلائیو نے اپنے محسن اور چہیتے لیکن ننگِ ملک و ملت یعنی میر جعفر
بنگال کا نواب مقرر کر دیا۔ میر جعفر نے ازراہِ تشکر و امتنان انگریزوں کے لیے قومی خزانہ
منہ چوپٹ کھول دیا۔ قوم کی گاڑھے خون پسینے کی کمائی کو انتہائی بے دردی سے اپنے آقا
پر نچھاور کرنا شروع کر دیا۔ کلائیو کو اِس خوشی میں دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ نقد اور چوبیس
پرگنے جاگیر میں دیے۔ کونسل کے ممبروں کو بڑی بڑی بھاری رقمیں دیں۔ کپتان سے نیچے
کے ہر افسر کو تین تین ہزار پونڈ انعام ملا۔ اِسی لیے تو بنگال کے لوگ میر جعفر کو "کلائیو
کہا کرتے تھے۔ انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے میر جعفر نے انعامات و تحائف کا س
باقاعدگی سے جاری رکھا لیکن ایک روز خزانہ بھی اُسی طرح خالی ہو گیا جس طرح میر جعف
سینہ ملک و ملت کے درد سے خالی تھا۔ انگریز صاحب بہادروں کی یہ حالت دیکھ کر
خراب ہو گیا۔ میر جعفر کو برطرف کر کے اُس کے داماد میر قاسم کو نواب مقرر کر دیا گیا۔

میر قاسم بیدار مغز اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور بنگال
خوشحال ترین صوبے کی بدحالی اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ شروع میں تو مصلحتاً
کی سُنّت کو ادا کرنا چاہا لیکن کچھ عرصے بعد برطانوی لٹیروں کے مطالبات ماننے اور ا
پُورا کرنے سے اپنے مجبور و معذور ہونے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے
ہو کر اپنے اصلی پٹھو میر جعفر کے دوبارہ نواب ہونے کا اعلان کر دیا، تو اِس موقع پر
اور انگریزوں میں ٹھن گئی۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر ایک فیصلہ کن لڑائی ہوئی، جس
میر قاسم کو افسوسناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اِس جنگ سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟
جواب میاں محمد شفیع کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

" بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) نے ہندوستان کی کمر توڑ دی اور انگریز کی ریڑھ
کے مُہرے مضبوط ہو گئے جو ابھی تک لرزتے رہتے تھے۔ شجاع الدولہ کو

ہ میاں صاحب بھول گئے یہاں سراج الدولہ کے بجائے میر قاسم لکھنا چاہیے تھا۔ نواب سراج الدولہ تو
سے چھ سات سال پہلے پلاسی کی جنگ میں جامِ شہادت نوش کر چکا تھا۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ہوئی

بالکل اسے صلح کرنی پڑی۔ الٰہ آباد کے ساتھ کئی علاقے انگریزوں نے دبا لیے۔ غنیمت ہوا کہ ریاست بچ گئی اور ہندو مسلمان کی چند روزہ زندگی نکل آئی۔ بنگال کے انگریز بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔ دولت اُن کی لونڈی ہو گئی۔ اِس لیے کہ صرف بنگال سے اُنھوں نے تین کروڑ ستائیس لاکھ ستر ہزار آٹھ سو تینتیس پونڈ وصول کیے۔ خاص نوابوں کی جیب سے جو رقم نکالی، اکیس لاکھ اٹھتر ہزار چھ سو پینسٹھ پونڈ تھی۔ ان رقموں کے علاوہ اور بہت کچھ دیگر ذرائع سے وصول کیا گیا، جس کے ساتھ عوام و خواص کی رگوں تک کا خون کھینچ کر لندن چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال کا رزق اُنھیں دنوں ختم ہو گیا اور اِس امیر صوبے پر ہمیشہ کے لیے افلاس دوڑ گیا۔" [1]

جناب غلام رسول مہر نے انگریزوں کی ان عیاریوں کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

۱۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اصل ناظم سراج الدولہ تھا۔ اُس سے جھگڑا پیدا کیا، پھر صلح کر لی اور باہم معاہدہ ہو گیا۔ بایں ہمہ امیروں اور درباریوں خصوصاً میر جعفر سے خفیہ ساز باز کر کے سراج الدولہ کو ختم کر دینے کا بندوبست کیا گیا۔

۲۔ میر جعفر نے نظامت کی خاطر اپنے آقا سے غداری کی اور انگریزوں کے لیے کامیابی کا دروازہ کھولا۔ اُسے نظامت ضرور دی گئی لیکن بے اندازہ رقمیں وصول کی گئیں بلکہ مالی مطالبوں کا ایک لا متناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ میر جعفر تنگ آ گیا تو اُسے مسند سے اتار کر اس کے داماد میر قاسم کو ناظم بنا دیا گیا۔

۳۔ میر قاسم بھی لوٹ کا سلسلہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا تو اُس سے جنگ ہوئی اور دوبارہ میر جعفر کو گدی پر بٹھایا گیا۔

۴۔ اِسی اثنا میں بادشاہ دہلی سے چھبیس لاکھ سالانہ دینے کے وعدے پر

---

[1] محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اول، ۱۹۵۷ء، ص ۵۰

بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لی گئی۔ بالآخر بادشاہ کے چھبیس لاکھ بھی ضبط کیے اور اُس کے علاوہ علاقے بھی دُوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گویا سراج الدولہ سے وفا کی نہ میر قاسم یا میر جعفر سے اور نہ بادشاہِ دہلی سے۔ جس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نکلا، فائدہ اُٹھایا، پھر اُسے بے مصرف سمجھ کر پھینک دیا۔"[1]

ریاست ٹونک کے بہادر حکمران، نواب امیر خاں نے بھی انگریزوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگ نے یہ محاذ حسب تصریحات مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی وغیرہ کے سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے ذریعے فتح کیا، جس کا مفصل اور مدلل ذکر آگے آئے گا۔ موصوف نے بڑی رازداری اور نمک حلالی کے ساتھ اس پھرتے ہوئے شیر کو انگریزوں کے شیطانی پنجرے میں گرفتار کیا تھا، اپنے مہربان آقاؤں کے آہنی پنجرے میں بند کروایا اور اس طرح اپنی مہربان، بے رو ریا اور غیر متعصب سرکار کی حدودِ مملکت کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں پورا پورا ہاتھ بٹایا کیونکہ اس انگریزی عملداری کو موصوف فخریہ طور پر اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے اور لارڈ وارن ہیسٹنگ بھی سید احمد صاحب کے ایسے کارناموں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا اور ان پر اعتماد رکھتا تھا۔ وسطِ ہند کے نواب امیر خاں، سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف جو کچھ برٹش گورنمنٹ کرنا چاہتی تھی وہ خود پردے میں رہ کر سید احمد صاحب سے ہی کروایا گیا۔ نظام حیدرآباد کے بعد اگر مسلمانوں میں سے کسی نے سب سے بڑھ کر برٹش گورنمنٹ کے قیام و استحکام میں مدد دی تو وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی ہے لیکن ان صاحبان جبّہ و دستار نے اپنے ملک و ملت سے غداری کے کارناموں پر اصلاح، جہاد اور سکھوں کے مظالم کا توڑ وغیرہ ایسے ایسے خوشنما لیبل لگا کر قوم کے سامنے پیش کیے کہ عوام الناس کی کافی تعداد اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ آئندہ صفحات میں ہم تفصیلی طور پر حقائق پیش کر کے قارئین کرام سے فیصلہ چاہیں گے کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص ۱۳۱

ی کی اصلاح وتجدید کا بیڑا اٹھایا تھا یا تخریب دین اور افتراق بین المسلمین کا؟ موصوف سبیل اللہ انگریزوں سے جہاد کرنے نکلے تھے یا انگریزوں کی عملداری کو وسعت دینے کی طرا انگریزی امداد کے سہارے سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کے سکھوں کا زور توڑنے کیلئے بھیجے گئے تھے؟ وہ مجاہد بننا چاہتے تھے یا انھیں بادشاہت اور نبوت کا سودا سمایا ہوا تھا؟

وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ حق یہ ہے کہ جس طرح اس لم حکمران نے دیسی عوام وخواص کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے کی اگر کوئی کسر رہ گئی تھی پوری کر دکھائی اسی طرح جعفر بنگال اور صادق دکن جیسے ملت فروشوں سے جس جس شعبے میں ی رہ گئی تھی وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے پوری کر دکھائی اور ایسی رازداری سے کہ ی قوم آج تک اسی بحران میں مبتلا چلی آرہی ہے۔ موصوف کی تخریب کاری کے اثرات مدی مرض کی طرح پھیلے اور آج تک پھیلتے ہی جا رہے ہیں کیونکہ اس پر جو خوشنما لیبل لگایا گیا تھا س کے پیش نظر کتنے ہی مسلمانوں نے اسے مرض کے بجائے شفا اور بدخواہی کی جگہ خیرخواہی مجھ لیا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز کی نمایاں روش کا میاں محمد شفیع نے یوں نقشہ کھینچا ہے:

"وارن ہیسٹنگز نے ہندوستان آکر انگریزی اخلاق کی تکمیل کر دی۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو اس نے نہ کیا ہو اور کوئی بدعہدی ایسی نہ تھی جو عمل میں نہ لایا ہو۔ ملک گیری کی ہوسناکیوں اور زرکشی کی حرص پرستیوں کو آخری حد پر پہنچا دیا۔ اس کے بعض مظالم تو ایسے دردناک ہیں کہ لکھتے وقت قلم کانپ جاتا ہے اور ایسے شرمناک ہیں کہ غیرت اذن تحریر نہیں دیتی۔" [1]

حیدر علی نے میسور کی پہلی اور خصوصاً دوسری لڑائی میں انگریزوں کی فوجی طاقت کا دہ نکال دیا تھا۔ دوسری لڑائی میں انگریزوں کے مایۂ ناز اور تجربہ کار جرنیلوں مثلاً کرنل بیلی منرو جیسوں کی شیخی کرکری کرکے انھیں عبرتناک شکست دی تھی۔ حیدر علی کا اگرچہ دران جنگ ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن اس کے جانشین سلطان فتح علی ٹیپو نے اپنے والد

کی طرح ایسی کامیابی سے دو سال تک متواتر جنگ جاری رکھی کہ وارن ہیسٹنگز کو مجبور ہو کر صلح کی پیشکش کرنی پڑی۔ معاہدے کی رُو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیے گئے۔ آئندہ باہم نہ لڑنے اور دوستی کا عہد و پیمان ہو گیا، لیکن انگریز اور بدعہدی سگے بھائی بہن ہیں۔

وارن ہیسٹنگز کے بعد ۱۷۸۶ء سے ۱۷۹۳ء تک لارڈ کارنوالس گورنر جنرل رہا۔ اُس نے آتے ہی نظام اور مرہٹوں کو یہ جھانسہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا کہ آئندہ جو علاقے فتح کیے جائیں گے اُن میں تینوں طاقتیں حصہ دار ہوں گی اور تینوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند رہیں گے یہ اتحادِ ثلاثہ یا تثلیث انگریزوں نے اپنی فوجی قوت کو کمزور دیکھ کر کیا تھا۔ نظام کی نالائقی تو مشہور تھی لیکن اس موقع پر مرہٹے بھی دھوکا کھا گئے کیونکہ اُن کا مشہور اور مدبر سیاستدان نانا فرنویس مر چکا تھا۔ مرہٹوں نے اسلام دشمنی تو مدِ نظر رکھی لیکن غلامی کی جن طالمانہ اور عیارانہ زنجیروں میں پورا ملک جکڑا جا رہا تھا، اُن کی طرف مرہٹوں کی نظر ہی نہ گئی۔

میسور کی دوسری لڑائی کے خاتمے پر انگریزوں نے جو سلطان فتح علی ٹیپو سے نہ لڑنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ کیا تھا، اُسے پس پشت ڈالتے ہوئے، ٹراونکور کے راجہ کی مدد کے بہانے سے، لارڈ کارنوالس نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر سلطنتِ میسور پر حملہ کر دیا۔ ایک سال تک ٹیپو سلطان مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا لیکن رسد کی کمی اور دشمن فوجوں کی کثرت کے پیشِ نظر سلطان کو دب کر صلح کرنی پڑ گئی۔ تین کروڑ تاوانِ جنگ دینا پڑا اور ریاست میسور کے تقریباً نصف حصے سے دستبردار ہو کر باقی آدھی ریاست کو بچانا پڑا۔ مفتوحہ نصف علاقے کو انگریزوں، مرہٹوں اور نظام نے آپس میں بانٹ لیا۔

کارنوالس کے بعد ولزلی آیا جو ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ ولزلی کی ملک گیری کی ہوس اپنے پیشروؤں سے بھی زیادہ تھی۔ سلطان نے فوراً اس خطرے کو محسوس کیا نظام اور مرہٹوں کو سارے نشیب و فراز سمجھائے، لیکن تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ ان سے مایوس ہو کر فرانس، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کے پاس اپنے سفیر بھیج کر مدد طلب کی۔ فرانس اور ترکی اُن دنوں اپنے ہی مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے اس لیے بروقت کوئی مدد

نہیں کرسکتے تھے۔ زمان شاہ والیٔ افغانستان نے اس اپیل کا خیر مقدم کیا اور سلطان فتح علی ٹیپو
امداد کے لیے ایک لشکرِ جرار لے کر فوراً روانہ ہو گیا۔ زمان شاہ ابھی پنجاب سے ہی گزر رہا
کہ افغانستان میں اپنے بھائی کے باغی ہو جانے کی خبر سن کر اُس کی سرکوبی کرنے
غرض سے مجبوراً واپس لوٹنا پڑا۔

بیرونی امداد سے سلطان یوں محروم رہ گیا اور اندرونی طور پر ولزلی نے سازش کا ایسا
پھیلایا کہ میسور کے ارکین سلطنت میں سے میر صادق، میر غلام علی اور پورنیا جیسے انگریز کے
ہاتھوں بک گئے، سلطنتِ میسور کو چند روزہ زندگی کے آرام کے بدلے بیچنے اور متحدہ ہند
کو انگریزوں کا غلام بنانے پر تل گئے۔ اس موقع پر کمپنی نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے
بغیر کسی خوف و خطر کے تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ انگریزوں اور اُن کے ساتھیوں کی فوج
میر صادق وغیرہ کی بدولت بغیر کسی روک ٹوک کے سرنگاپٹم تک پہنچ گئیں۔ انیسویں صدی
ہنوز آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمانانِ پاک و ہند کی امیدوں کا آخری چراغ بھی ۱۷۹۹ء
بجھ گیا، اُن کی تلوار ٹوٹ گئی۔ سلطان حیدر علی والیٔ میسور جیسے شیر دل سپاہی، مدبر
اور اسلامی غیرت کے نشان کا مایۂ ناز فرزند اور لائق ترین جانشین یعنی سلطان فتح علی ٹیپو
سرنگاپٹم کے قلعے میں غداروں کی بدولت اس طرح محصور ہو گیا جیسے شیر آہنی پنجرے
ان نامساعد حالات میں بھی وہ مردِ مومن، شیر دل مجاہد اور مسلمانانِ پاک و ہند کی عظمت
نشان، آخری وقت تک لڑتا رہا۔ جان دے دی لیکن اسلامی آن پر دھبہ نہ لگنے دیا۔ ا
کے سامنے گردن نہ جھکائی اور شہیدانِ کربلا کا سچا غلام ہونا ثابت کر گیا۔

زندگی کے اس نازک موڑ پر بھی عظمتِ اسلام کا یہ بیباک نقیب اپنوں اور بیگانوں
سامنے یہ تاریخی اعلان کرتا ہے کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے
بہادر سلطان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ سلطان
لاش کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر فرطِ انبساط میں جنرل ہیرس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
"آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔" یہ کسی مجنون کی بڑ نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار
انگلینڈ میں اس فتح کی خوشی میں جشن منایا گیا، چراغاں ہوا اور برطانوی حکومت نے

جو ننگِ انسانیت کو مارکوئس کا خطاب دیا اور جنرل ہیرس کو لارڈ بنا دیا گیا۔ شہیدانِ کربلا
کی سنّت کو زندہ کر دکھانے والے عظیم سلطان کے متعلق ہر غیرت مند اور حریت پسند مسلمان
کے منہ سے یہ الفاظ دلی خلوص اور عظمت و عقیدت کے جذبات کے ساتھ دعائیہ انداز میں جاری
ہو جاتے ہیں:۔

ابرِ رحمت تیرے مرقد پر گہرباری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے

وہ سلطان ٹیپو شہید جس سے انگریز ہر وقت خائف رہتے تھے۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز اور
لارڈ کارنوالس کو جس کے ملک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، کیا لارڈ ولزلی اپنی
طاقت کے بل بوتے پر اس کی ریاست میں داخل ہو گیا تھا؟ سلطان ٹیپو جیسے مدبر اور بیدار مغز
حکمران کو خبر نہ ہوئی اور انگریزی فوج اپنے اتحادیوں سمیت سلطنتِ میسور کا جگر چیرتی ہوئی
سرنگاپٹم تک جا پہنچی، یہ ناممکن امر کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت سے ممکن ہو گیا تھا؟ نہیں!
بلکہ اسی گھر کے ایک منحوس چراغ قابلِ صد ہزار نفرت و حقارت کا کارنامہ ہے۔ خود میر صادق
نے ہی اپنے ہاتھوں اس گھر کو آگ لگائی تھی۔ اسی ناآشنائے دردِ ملت نے پاک و ہند
کے باشندوں کو برطانوی ڈاکوؤں کا غلام بنانے کا ناپاک فریضہ انجام دے کر تاریخ میں
اپنے لیے بدترین مقام پسند کر لیا تھا۔ اسی لیے تو ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا:

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

سلطان حیدر علی اور اس کے فرزندِ نامدار کی فراست، تدبر اور باریک بینی کو
خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے نظام اور مرہٹوں کی کوتاہ اندیشی کا غلام رسول مہر نے یوں
اظہار کیا ہے:

"دیسی حکمرانوں میں سے میسور کا فرماں روا حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے
انگریزوں کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا۔ اس کی دوررس نگاہ نے بھانپ لیا تھا
کہ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تو ملک خوفناک

آفات کا باعث بن جائے گا۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جا سکتا ہے ...
حیدر علی کی تمام کوششیں انگریزوں کو ختم کر دینے کے لیے وقف رہیں ....
حیدر علی، نظام مرہٹوں اور ناظم کرناٹک کو بھی بار بار آگاہ کرتا رہا۔ اُس کے
فرزند ٹیپو سلطان نے بھی زندگی اِسی مقصد کی نذر کر دی لیکن نظام اور مرہٹے
کوئی بھی ست یان کام نہ کر سکے، صرف اِسی وہم میں مبتلا رہے کہ انگریزوں کے
ساتھ ہو کر سلطنتِ میسور کو ختم کر دیں۔ وہ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے نظام کو
اِس درجہ بے دست و پا بنا دیا کہ اُس کا عدم اور وجود برابر ہو گیا اور مرہٹوں کا
نشان تک باقی نہ چھوڑا ... غرض سلطنتِ میسور کی تباہی انگریزوں کی جنگی
قوت کا کارنامہ نہ تھی بلکہ دیسی حکمرانوں خصوصاً نظام اور مرہٹوں کی نالائقی،
کوتہ اندیشی اور تفرقے کا نتیجہ تھی۔[1]

سلطان ٹیپو کی شہادت اور سلطنتِ میسور کی تباہی کے بعد حسبِ منشا عمل کرنے
کے لیے ولزلی کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ بعض ریاستیں تو پہلے ہی انگریزوں کی باج گزار
ہو گئی تھیں، اب ولزلی نے باقی دیسی حکمرانوں کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ اپنی اپنی ریاست
میں انگریزوں کی امدادی فوج رکھیں اور اُس کے اخراجات برداشت کریں۔ جن ریاستوں نے
ایسا کرنے سے انکار کیا اُن پر فوج کشی کر کے یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا گیا لیکن جن حکمرانوں
اپنی اپنی ریاستوں میں انگریزی فوج رکھنا منظور کر لیا تھا اُن کا انجام بھی دوسروں سے چند
مختلف نہیں رہا۔ کسی سے بڑھتی ہوئی فوج کے اخراجات پورے نہ ہو سکے، کوئی بساط سے
باہر خراج ادا کرنے سے قاصر رہ گیا اور کسی سے انگریزی عملداری کے مطالبات پورے
ہو سکے تو اِس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے اُس ریاست کا ایک حصہ خرید لیا جاتا، اور
چاہتا تو ایسے حکمران کو ہٹا کر کسی اپنے نمک خوار کو گدی نشین کر دیتے اور اُس کے ذر
اُس ریاست کے عوام کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵

ناکارا اِس علاقے کو ہڑپ کرنے پر جا کر ہی وہ قضیہ ختم ہوتا۔ انگریزوں کی اِس پالیسی کا تجزیہ علیم ہروی نے یوں تجزیہ کیا ہے:

"جو رئیس اور حکمران انگریزوں کی دوستی کے جادو سے مسحور ہوئے ان کے لیے یہ دوستی انجامِ کار مہلک ثابت ہوئی۔ اُن میں سے ہر ایک کو تختِ حکومت سے اُترنا پڑا یا وُہ اُس طاقت کے ہاتھ میں بے جان کھلونے بن کر رہ گئے جو اپنی مرضی پُوری کرنے پر تُلی بیٹھی تھی۔ اُن حکمرانوں نے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی، نتیجہ دونوں حالتوں کا یکساں نکلا۔ اگر اُنھوں نے غاصب انگریزوں سے دوستانہ تعلقات گوارا نہ کیے تو اُن پر ارادہ بانُدے بد کا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور اُن کے علاقے مسخر ہو گئے۔ اگر اُنھوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی، تو وہ ڈپلومیسی کے جال میں اس طرح اُلجھ گئے کہ اپنی عزّت اور موروثی مقبوضات سے محروم ہوتے بغیر نجات نہ پا سکے۔ حق یہ ہے کہ وُہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے وہاں قیدی بن کر رہ گئے تھے۔"[۱]

انگریز جو تاجر کے رُوپ میں آئے تھے لیکن ایک بلائے ناگہانی بن کر متحدہ ہندوستان کے اکثر حصّے پر قبضہ جما بیٹھے کتنی ہی ریاستوں کو کمال عیّاری سے ہضم کر چکے تھے۔ عیّاری کا کوئی گُر ایسا نہ تھا، جو انگریزوں نے آزما کر نہ دیکھا ہو، لُوٹ کھسوٹ کی کوئی ترکیب ایسی باقی نہ رہی تھی جو اُنھوں نے جاری نہ کی ہو۔ کیا پنجاب کی سکھ ریاستوں نے اِس خطرے سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار کی یا اُسی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے بلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیا کرتا ہے۔ مہر صاحب نے اِس حقیقت کے چہرے کو یُوں بے نقاب کیا ہے:

"مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں سکھوں نے ستلج اور جمنا کے درمیان چند مسلیں قائم کر لی تھیں، جنھیں سکھ ریاستوں کا آغاز سمجھنا چاہیے اور ستلج کے شمال میں بھی اُن کی چند مسلیں تھیں، جن میں سے انجامِ کار رنجیت سنگھ نے

---

[۱] غلام رسول مہر: ١٨٥٧ء، مطبوعہ لاہور، ص ١٧

خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر وہ ذرا دُور اندیشی سے کام لیتا تو تمام سِکھوں کو متحد کر کے ایک پائیدار حکومت کا انتظام کر سکتا تھا لیکن اُس نے ذاتی برتری کے جنون میں ستلج اور جمنا کے درمیان کی سکھ مسلوں کو بدظن کر دیا اور وہ بھی انگریزوں کی آغوش میں چلی گئیں۔ رنجیت سنگھ کو پھر بھی ہوش نہ آیا۔ اُس نے اپنوں کو غیروں کے قبضے سے نکال کر اپنے ساتھ ملانے کے بجائے انگریزوں سے (۱۸۰۹ء میں) معاہدہ کر کے ستلج کو اپنی اور انگریزی سلطنت کے درمیان حدِ فاصل بنا لیا۔ گویا سکھوں کی نصف قوت انگریزوں کے پاس چلی گئی، باقی نصف کا رئیس رنجیت سنگھ اس بنا پر خوش ہو گیا کہ اب کسی خلش اور خدشے کے بغیر شمال اور مغرب میں اپنے حدود بڑھا سکے گا۔ اگرچہ حقیقتِ حال کے اعتبار سے اُس نے سکھوں کے مستقبل پر سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔

اُس نے ایک طرف سکھوں کے دو ٹکڑے کیے، دُوسری طرف اپنے دائرۂ حکومت کی توسیع کے لیے ایسی کوتاہ اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ ہر گروہ غیر مطمئن ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب انگریز ہندوستان کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک ہی جست میں دریائے ستلج سے پشاور جا پہنچے۔ سکھوں کی حکومت کا نشان تک باقی نہ رہا اور ایک بھی آنکھ سکھوں کی تباہی پر اشک باری کے لیے نہ مل سکی۔ آخر میں سکھوں کے لیے فخر کی صرف ایک دستاویز باقی رہ گئی کہ انھوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر پورے ملک کو غلامی کی زنجیریں پہنائیں۔ پچاس ساٹھ سال تک وہ اسی سرمایۂ فخر کے سہارے انگریزوں کی نظر میں معتمد علیہ بنے رہے۔[1]

دیکھنا یہ ہے کہ جب انگریز متحدہ ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قبضہ جما چکے تھے۔ تبھی چھوٹی بڑی ریاستوں کا حسرت ناک انجام سامنے تھا، ان دنوں ایران سندھ سے

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹

سِکھوں جیسی بداندیشی اور خود فریبی سے ہی کام لیا تھا یا کوئی قابلِ قدر ایسا بھی قدام کیا جو حریت پسندی اور عاقبت اندیشی کے تحت کرنا پڑتا ہے۔ اِس سوال کا جواب بھی مہر صاحب کے لفظوں میں ہی پیشِ خدمت ہے:

"سندھ کی مثال سب سے بڑھ کر دردناک ہے۔ وہاں کے امیر ایک طرف انگریزوں سے بدکتے تھے اور دُوسری طرف اُنھیں سِکھوں کی پیش قدمی کا خطرہ پریشان کر رہا تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے کام لیا۔ وُہ سِکھوں کی پیش قدمی کے خطرے کو زیادہ سے زیادہ بھیانک صورت میں پیش کر کے امیروں پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جماتے رہے۔ نہ رنجیت سنگھ میں اِتنی وسعتِ قلب اور وُسعتِ نظر تھی کہ وہ امیروں کو پورا اطمینان دلا کر انگریزی اثرات کو دُور رکھتا اور نہ امیروں میں اِتنی ہوشمندی تھی کہ وُہ سِکھوں کے خطرے کی روک تھام کے لیے کسی دُوسری تدبیر سے کام لیتے اور انگریزوں سے بچے رہتے جو تقریباً بیسیوں دیسی حکومتوں کو ہضم کر چکے تھے۔

امیروں سے حتمی معاہدہ تھا کہ فوج اُن کے علاقے میں سے نہ گزاری جائے گی لیکن پہلی جنگِ افغانستان میں انگریزوں نے اِس شرط کی خلاف ورزی کی بلکہ شاہ شجاع کو امیروں سے روپیہ بھی دلوایا۔ جنگِ افغانستان ختم ہو گئی تو انگریزوں نے امیروں کو دبانا شروع کیا کہ تم نے تو ہماری مشکلات کے وقت دوستی کا حق ادا نہ کیا تھا۔ اب نیا معاہدہ کرو۔ مجوزہ معاہدہ امیروں کے استقلال کو ختم کرتا تھا۔ وُہ بیچارے تذبذب میں پڑے اور اُن پر حملہ کر دیا۔"[1]

متحدہ ہندوستان کی جس ریاست پر بھی انگریزوں نے قبضہ کیا اُسے دوستی کے چکر

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶

[2] ایضاً: ص ۱۷

پھنسایا یا دُوسروں کو ساتھ لے کر، اُسے دشمن ٹھہرا کر حملہ آور ہوئے اور قبضہ کر لیا۔ کیتھی نے انگریزوں کی اس چالبازی پر یُوں تبصرہ کیا ہے:

"کہا جاتا ہے کہ امیرانِ سندھ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے معاہدے توڑنے کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اگر معاہدوں کو توڑنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا کہ علاقے چھن جاتے تو آج حکومت برطانیہ کے پاس دریائے برہم پتر اور دریائے سندھ کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی باقی نہ رہتا"[1]

پنجاب، ناگپور اور ستارہ پر انگریزوں نے کس طرح قبضہ کیا؟ یہاں کس قسم کا جال پھیلا کر اپنی توسیع پسندی کی ہوس اور سرزمینِ پاک و ہند کے چپے چپے کو غلام بنا کر لوٹنے کی خواہش پوری کی، ملاحظہ ہو:

۱۔ ہارڈنگ نے سکھوں کی حکومت کا صرف ایک حصہ چھینا تھا اور کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا، ڈلہوزی نے پُورا پنجاب لے لیا اور دلیپ سنگھ کو معزول کر کے فتح گڑھ (یو۔پی) پہنچایا۔ اُس نے عیسائیت قبول کر لی، شاید اسی لیے کہ تختِ حکومت حاصل کرنا سہل ہو جائے گا لیکن عیسائیت اُسے انگریزوں کے قریب تر نہ لا سکی اور آخری دور میں اُس سے جو بدسلوکیاں ہُوئیں وہ بڑی ہی درد انگیز اور عبرت افزا تھیں۔

۲۔ ستارہ کی چھوٹی سی ریاست سیواجی کے خاندان کے لیے رکھی گئی تھی۔ معاہدہ یہ ہُوا تھا کہ وہ دواماً قائم رہے گی۔ اپریل ۱۸۴۸ء میں ستارہ کے راجہ نے وفات پائی۔ اُس کے اولاد نہ تھی۔ لیکن ہندو دھرم کے رواج کے مطابق اُس نے ایک لڑکے کو متبنّٰی بنا لیا تھا۔ ڈلہوزی نے

---

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۷

متبنّیٰ کو راجہ بنانا منظور نہ کیا اور ریاست ضبط کر لی۔

۲- ۱۸۵۳ء میں رگھوجی بھونسلا والیِ ناگپور فوت ہُوا۔ اُس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی اور غالباً اِس خیال سے اُس نے کسی کو متبنّیٰ نہ بنایا تھا کہ عوام اُسے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم سمجھ لیں گے۔ تاہم ملک کے رواج اور ہندو دھرم کے مطابق اُس کی بیوہ متبنّیٰ تجویز کر سکتی تھی۔ ڈلہوزی نے وُہ ریاست بھی بے تکلّف سنبھال لی، پھر محلّات کا سارا اسباب انتہائی بے دردی سے برسرِ عام نیلام کرایا، یہاں تک کہ ایک رانی بدسلوکی پر خفگی کے جوش میں پُورے محل کو آگ لگوا دینے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔" [1]

یہ ہے برطانوی لیڈروں کے متحدہ ہندوستان پر قابض ہونے کی مختصر سی کہانی اور نہ ماننے والوں کی خود اپنی زبانی۔ اِس کے باوجود کتنی ستم ظریفی ہے کہ بعض مُبتدعینِ زمانہ اور نصوص فہمی نے برٹش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے اور اِس کے باوجود انگریزوں کے اُن نمک خواروں، ملک و ملّت کے غدّاروں کو آج تک مسیحائے قوم، مصلح رہنما، ریفارمر اور معلوم نہیں کیا کیا منوانے کی مُہم برابر جاری ہے۔ ایسے بیانات اِسی کتاب کے باب چہارم کے اندر ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں۔ اب بانیِ علی گڑھ کالج سر سیّد احمد خاں کا انگریزوں کے متعلق ایک بیان ملاحظہ ہو کیونکہ پاکستان کا ایک طبقہ موصوف کو پاکستان کا معمارِ اوّل منوانے پر بضد ہے:

"اُن (سر سیّد) کی نہایت پختہ رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وُہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۴۳

کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت
نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بزورِ حاصل کی اور نہ مکر و فریب سے ، بلکہ
درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی ، سو اُسی
ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا۔" [1]

موصوف کے ہر لفظ سے کس طرح انگریزوں کی محبت کے دریا رواں ہیں ، عقیدت و احترام
کے کیسے کیسے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور ساتھ ہی دردمندانِ ملک و ملت کی آنکھوں میں دھول
جھونک کر قوم کو کیسا خوشنما دھوکا دیا جا رہا ہے کیونکہ مسیحائے قوم اور ناخدائے کشتیِ ملت
جو ٹھہرے - اکبر الٰہ آبادی نے اسی لیے تو کہا تھا : ؎

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا ، سیّد کو مرید بنا ہی لیا
سب پیروں سے تو بچ نکلے ، اِس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

یک طرف انگریز اپنی مخصوص پالیسی کے ذریعے دیسی ریاستوں پر یکے بعد دیگرے
قبضہ جماتے گئے اور دوسری طرف اُس متحدہ ہندوستان کو ، جو کبھی سونے کی چڑیا مشہور تھا
اور جسے اپنی بعض مصنوعات پر بجا طور پر ناز تھا ، اُسے صنعتی لحاظ سے مفلوج کرنے میں بھی
برطانوی لیڈروں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا - برطانوی لوگوں کے تاثرات ہمارے
سُوتی کپڑے کی صنعت کے بارے میں اُس وقت یہ تھے : (بقول میاں محمد شفیع)

"ہندوستان کی جس چیز نے سب سے زیادہ تباہی مچائی ہوئی ہے وُہ سُوتی
کپڑا ہے - ہمارا (برطانوی) اُونی کپڑا اُس کے سامنے بے قدر ہو گیا ہے -
افسوس ہے کہ ہندوستانی دولت لُوٹ رہے ہیں لیکن عیسائی برباد ہو رہے ہیں ،
کیا انجام ہوگا ؟ یہی کہ ہندوستانی دولتمند ہو جائیں گے اور ہم مفلس" [2]

یہی میاں صاحب ہماری ریشمی صنعت کے بارے میں مسٹر شیلڈن کا ایک بیان یوں

---

[1] الطاف حسین حالی : حیاتِ جاوید - ص ۲۶۲

[2] محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء ، مطبوعہ لاہور ، بار اول ، ۱۹۵۷ء ، ص ۱۰ [illegible]

نقل کرتے ہیں :

"انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہوگیا ہے، اس لئے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے آدھی قیمت پر انگلستان پہنچ جاتا ہے اور دونوں سے بہتر ہے۔" [1]

اس سونے کی چڑیا پر قابض ہونے سے پہلے برطانیہ انتہائی پسماندہ اور غریب ملک تھا۔ سرزمین پاک و ہند کو لُوٹ کر انگریزوں نے اپنے ملک کو صنعتی بنا لیا اور صفِ اوّل کے خوشحال ملکوں میں انگلستان کا شمار ہونے لگا۔ میاں محمد شفیع اس حقیقت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"ہندوستان پر تصرف حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کی حیثیت نہایت معمولی تھی۔ یہ سونے کی چڑیا ہاتھ لگی۔ پُشت ہا پُشت کی نسلوں کے خزانے انگلینڈ پہنچے تو کارخانوں کی بنیادیں شروع ہوگئیں۔ جہاں سرسبز چراگاہیں، تروتازہ مرغزار تھے وہاں چمنیاں دُھواں اُگلنے لگیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۷۵۵ء سے ہندوستان کی صنعت رُو بہ زوال ہُوئی اور انگلستان میں کپڑا بُننے کی دیگر صنعتی آسانیاں پیدا ہوگئیں، کلیں نکل آئیں، گھنٹوں کے کام منٹوں میں ہونے لگے۔ سستے مال ہندوستان کی بندرگاہوں میں پہنچے۔ ہندوستان کے ہاتھ سُست پڑ کر اپنے چرخے پر چلتے رہے۔" [2]

جب انگریزوں نے یہاں کی دولت کے ذریعے اپنے ملک کو صنعتی بنانا شروع کیا تو، چونکہ بنگال کے سُوتی اور ریشمی کپڑوں نے فرانس اور اٹلی کی صنعتوں کو ناکارہ بنا کے رکھ دیا تھا، اسی خطرے سے بچنے اور اپنی مصنوعات کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے کی غرض سے انگریزوں نے متحدہ ہندوستان کی صنعتِ پارچہ بافی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر

---

[1] محمد شفیع میاں : ۱۸۵۵ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۱

[2] ایضاً، ص ۱۰۲

شعار رکھی۔ اس سلسلے میں میاں صاحب نے مسٹر بورڈس کا ایک بیان یُوں نقل کیا ہے:

"پارچہ بافوں پر جرمانے کیے جاتے تھے، قید کی سزائیں دی جاتی تھیں، کوڑے لگائے جاتے تھے۔ اُن سے جبراً تجارتی عہد ناموں پر دستخط کرائے جاتے تھے۔ اس سے مصنوعات ناپید ہوگئی ہیں اور یہ تو سخت گراں ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں اور علی ویردی خاں کے زمانے میں یہ پارچہ باف نہایت خوش تھے اور اب بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔" [1]

ی صنعتوں کو اِس طرح تباہ کرنے کا معاملہ کہاں جا کر ختم ہُوا، یہ بھی میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"۱۸۵۰ء تک مکمل طور پر انگریزوں نے یہاں کی صنعت و تجارت کو ٹھکانے لگایا اور ہندوستان سُوئی تک کے لیے وہاں (انگلستان) کا محتاج ہو کر بیٹھ گیا۔ نہ تجارت رہی نہ جہاز رہے، روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ سلطنت، جائدادیں، عزتیں، یہ سب تو جا ہی چکی تھیں، صنّاعوں اور کارخانہ داروں کے طبقے کی تباہی نے قوم کی شومیِ قسمت کی داستان کو مکمل کر کے دلوں کے لیے ایک اور مسلسل جراحت کا سامان مہیا کر دیا۔" [2]

جب انگریز اپنی کمال عیاری سے ملک پر قبضہ کر رہے تھے، دونوں ہاتھوں سے یہاں دولت کو لُوٹ رہے تھے، ہندوستان کی وہ صنعتیں جنھوں نے یورپ کی مصنوعات بدجات کو مقابلے میں بالکل ردّی ثابت کیا تھا، ان ظالموں نے اُنھیں ٹھکانے لگا کر کے پارچہ بافوں اور صنعت کاروں کو محتاج بنا دیا، تجارت ختم کر دی اور ہر طرح برباد کر کے سُوئی تک کے لیے انگلستان کا اِس خطّے کو محتاج بنا دیا تھا۔ اُن دنوں انگریزوں کے دیسی نمک خوار وکیلِ صفائی بن کر اپنے آقاؤں کی یُوں قصیدہ خوانی کرتے تھے

---

[1] تنقیح میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۵

[2] ایضاً: ص ۱۰۶

"غرض ان (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ درستی ملک اور صفائی راہ اور رفاہِ عوام اور امنِ خلائق اور امانِ مخلوق اور راحتِ رسانی رعیت اور آرام دہی بریت میں حکّامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اس وقت میں بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے ملّا اور مفتی خوشامد کی راہ سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں، مگر میری نظر میں جو راجح اور صحیح معلوم ہوا، وہ لکھ دیا اور قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔" [1]

شاید اکبر الہٰ آبادی نے ایسے ہی انگریز کے مداحوں کی فوج کو دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا تھا

ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہُوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

مداخلت فی الدین: جب انگریز دیسی ریاستوں پر قبضہ جماتے جا رہے تھے، ملک کی دولت کو طرح طرح کے حربوں سے لُوٹ رہے تھے، یہاں کی صنعتوں کو تباہ و برباد کر کے اور اپنے ملک کو صنعتی بنا کر پاک و ہند کے باشندوں کو انگلستان کا دستِ نگر بنا رہے تھے تو اہلِ ملک کی عزیز ترین متاع یعنی دولتِ دین و ایمان کو لُوٹ لینے کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انگریزوں کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خرچ پر انگلینڈ سے پادری بُلائے جاتے، وہ متحدہ ہندوستان میں آکر دُوسرے مذاہب پر اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتے اور اپنی حقانیت جتانے کی غرض سے جگہ جگہ مناظروں کا چیلنج بھی دے دیا کرتے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیت کی حمایت میں بے شمار کتابیں شائع کروا کر مفت تقسیم کرنے لگے۔ چنانچہ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان مولانا عبدالرشید ارشد نے یُوں نقل کیا ہے:

"انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو عیسائی بنانے کی اسکیم بنائی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا"

---

[1] صدیق حسن خاں بھوپالی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۴۲

اس لیے انقیاد و اطاعت سے سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمراں کا باشندوں سے اختلاف ، تسلط و قبضے کی راہ میں سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملک کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و حیلے سے کام لینا شروع کیا انھوں نے بچوں کو ان کی اپنی زبان اور دین کی تعلیم کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔[1]

خود مولوی عبدالرشید ارشد نے انگریزوں کی اِس ظالمانہ روش کا تذکرہ اِن لفظوں میں کیا ہے :

"ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے بجائے جبر و استبداد ، لوٹ کھسوٹ کا عام دَور دورہ تھا۔ مسلمان چھ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر انھوں نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ ہندو مسلمان باہم دگر شیر و شکر کی طرح رہتے تھے مگر انگریزی عملداری میں ہندوستان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پادریوں کو نہ صرف تبلیغ کی عام اجازت تھی بلکہ انگریزی حکام ان کی پُشت پناہی کرتے۔ اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس ضروری کر دیا گیا تھا۔ پادری عام مجمعوں میں نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ ہی کرتے بلکہ ہندو اور مسلمانوں پر بے محابا جارحانہ حملے کیے جاتے۔ چونکہ انگریز کی نظر میں اس کا اصل مدِّ مقابل مسلمان تھا اور اسی کو وہ اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا۔ اسی لیے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کو پست اور ناکارہ نہ بنا دیا جائے گا اُس وقت تک حکومت اور سربلندی کا نشہ ان کے دماغوں سے نہیں نکلے گا۔ اِسی لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ظلم و جور اور تبلیغ عیسائیت کا نشانہ بنایا گیا۔"[2]

---

[1] عبدالرشید ارشد ، مولوی : بیس بڑے مسلمان ، ص ۳۹

[2] ایضاً ، ص ۴۲

اس منصوبے کے تحت بے شمار عیسائی پورے ملک میں پھیل گئے۔ ان میں پادری فنڈر کی سرگرمیاں سب سے نمایاں تھیں جو کہ اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ اور مناظرے کا چیلنج دیتا پھر رہا تھا۔ اہلسنت و جماعت کے مایۂ ناز عالم دین لیعنی پایۂ جرمین مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے آگرہ کے تاریخی مناظرے میں اُسے وہ شکست فاش دے کر ساکت و صامت کیا کہ انگلستان کی طرف بھاگتے ہی بنی۔ غلام رسول مہر نے اس امر کا تذکرہ یوں سپرد قلم کیا ہے:

"اس ضمن میں پادری فنڈر کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۵۴ء میں یہاں آیا تھا اور آتے ہی اسلام پر اعتراضات کا لامتناہی سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ اُسے عربی اور فارسی سے خوب واقفیت تھی۔ اسلامی علوم کی کتابیں بھی دیکھ چکا تھا سادہ لوح علماء جنھیں عیسائیت سے چنداں واقفیت نہ تھی۔ فنڈر کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ آخر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے بمقام آگرہ فنڈر سے مناظرہ کیا۔ موضوع مناظرہ یہ تھا کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی یا نہیں؟ فنڈر نے شکست کھائی اور وہ واپس چلا گیا تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ واضح ہو گئی کہ پادریوں کو دور دراز کے سفر کر کے یہاں آنے اور لوگوں کے عقائد بگاڑنے کی کوشش کرنے کا حوصلہ کیوں ہوا۔"[1]

پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اس مناظرے کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

"مولوی رحمت اللہ بن خلیل اللہ عثمانی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ کیرانہ ضلع مظفر نگر وطن ہے۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولوی محمد حیات اور مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ سے تحصیل علم کی۔ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں آگرہ میں پادری فنڈر سے مناظرہ کیا۔ فنڈر نے راہِ فرار اختیار کی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بڑے زور کے ساتھ حصہ لیا، جس کے نتیجہ میں جائیداد و

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، ص ۳۰

اد کی ضبط ہوگئی اور مکہ معظمہ کو ہجرت کرنی پڑی۔ مکہ معظمہ میں صولت النساء بیگم کی استعانت و امداد سے مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔ عیسائیت کے رد میں بڑا کام کیا ہے۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔[1]

ن مناظروں میں اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے سرکاری سطح پر دوسرا رنگ بدل لیا۔ م ملازموں کے نام عیسائیت قبول کر لینے کے پادری ایڈمنڈ سے خطوط لکھوائے گئے۔ یزوں کی اِس شرمناک کارگزاری کا تذکرہ غلام رسول مہر نے اپنے لفظوں میں یوں ا ہے:

"۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ایک طویل خط ملک کے تمام تعلیم یافتہ آدمیوں، خصوصاً معزز سرکاری ملازموں کے پاس بھیجا۔ جس کا مضمون یہ تھا: اَب ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔ اِن تمام باتوں کا نتیجہ اِس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا، اب حکومت نے عیسائیت کو فروغ دینے اور سابقہ مذاہب کو مٹا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔"[2]

یاں محمد شفیع نے پادری ایڈمنڈ کے مذکورہ خطوط کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

"چلتے چلتے سُلگتی آگ پر پادری ایڈمنڈ نے کلکتے سے ۱۸۵۵ء میں تمام دفاتر اور اہم اداروں میں ذیل کا اعلان بھیج کر تیل چھڑک دیا۔ جو شک میں تھے اُنھیں بھی یقین ہوگیا کہ انگریز اُن کو مذہب سے بھی محروم کر دیں گے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، دونوں پر اِس کا یکساں اثر پڑا اور دونوں تپ گئے۔"[3]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر، تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۰

[2] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹

[3] محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اوّل ۱۹۵۶ء، ص ...

پادریوں کی ان شرمناک سرگرمیوں میں حکومت کا ہاتھ تھا یا نہیں؟ میاں صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

"حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ پادریوں کی تحریک و تبلیغ میں خود گورنر شامل رہے ہیں۔ مبلغین عیسائیت کو باقاعدہ امداد کیا بلکہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور بعض گورنر تبلیغ میں خاصی دلچسپی اور جوش و سرگرمی رکھتے تھے۔" [۱]

برٹش گورنمنٹ کا نظریہ و منصوبہ پادریوں کی سرگرمیوں سے واضح تھا۔ آخر ہزاروں میل دور سے یہاں آکر، اتنا خرچ برداشت کر کے پادریوں کو یہاں تبلیغ کرنے، دوسروں کے مذاہب پر اعتراضات جڑنے کی آخر کون سی ضرورت پڑی تھی؟ ضرورت بھی تسلیم کی جائے تو آمد و خرچ کے اتنے مصارف ایک مذہبی مبلغ کے پاس کہاں سے آئے؟ اگر مصارف ہوں بھی تو ہزاروں روپے خرچ کر کے یہاں آکر تبلیغ کرنے کے بجائے ایک کوڑی خرچ کیے بغیر اپنے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم رہ سکتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ پادریوں کو ہزاروں میل دور سے یہاں آنے کی قطعاً کوئی ضرورت تھی اور نہ کسی عام آدمی میں استطاعت۔ پادریوں کی ضرورت تھی تو برٹش گورنمنٹ کو اور انھیں یہاں لانے، ان کے سارے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت تھی تو ایسٹ انڈیا کمپنی میں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ساری کارگزاری انگریزی حکومت کی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود یہاں کے ایک علی گڑھی دانشمند، اپنی سرکار ابد قرار کی صفائی میں یوں گہر بار ہوتے تھے:

"اوّل یہ ہے کہ کلکتے کے بعض پادریوں نے اپنے حسب عادت، مذہب و ملت کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کے طریقے پر ایک اعلان چھپوا کر عام طور پر ہندوستانیوں کے پاس بھیجا ہے اور ہندوستانیوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس قسم کے مضامین ابد پائدار گورنمنٹ کے اشارے سے بھیجے گئے ہیں حالانکہ گورنمنٹ کو اس کی مطلق خبر نہیں ہے اور سرکار عالی مقدار کی یہ شان

---

[۱] محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اول، ۱۹۵۷ء، ص ۲۰۔

ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا کو اپنے دین و مذہب کی ترغیب و تحریص دے۔
صاف ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں جو الگ الگ
آئین رکھتے ہیں اور ان کا علاقہ اس سرکار والا اقتدار کے ماتحت ہے۔ گورنمنٹ
ان پر لطف و کرم کی یکساں نظر رکھتی ہے۔ اقتدار کو اتنی مدت ہو چکی ہے ابھی
کسی سے مذہب و ملت کے بارے میں تعرض نہیں کیا گیا۔ اس میں اسلام
ہوں یا دوسرے مذاہب و ملل۔"[1]

ایسے اعلانات کی صفائی کے باوجود گورنمنٹ کے خلاف نفرت کے عام جذبات بھڑک گئے، پادریوں کی ان سرگرمیوں کی ذمہ داری ہر کوئی حکومت پر ڈالتا تھا، ان سب سے قطع نظر علمائے دین کے مقابلے میں پادریوں کی شکستیں اور ذلت و ناکامی کے واقعات نے حکومت پر واضح کر دیا کہ اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تجویز نہایت ٹیڑھی کھیر ثابت ہو کر رہے گی، اس حقیقت و تجربے کی روشنی میں جو کام پادریوں سے لینا تھا وہ حکومت نے اپنے کالے پادریوں سے لینا شروع کر دیا اور یوروپین تعلیم و تہذیب کی قدر دانی و حوصلہ افزائی شروع کر کے دینی علوم اور علوم شرقیہ کی تحصیل کرنے والوں کو عضو معطل بنا دینے کی ٹھان لی
محمد صاحب لکھتے ہیں:

"ابتداء میں مدرسوں اور کالجوں کے اندر تعلیم کا دوسرا طریقہ تھا۔ وہ تمام السنہ و علوم پڑھائے جاتے تھے جن کا پہلے رواج تھا، مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت، فقہ، حدیث، ہندو دھرم کی کتابیں وغیرہ، ان کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ بعد ازاں عربی اور فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی۔ فقہ، حدیث اور دوسری مذہبی کتابیں بند کر دی گئیں۔ اردو اور انگریزی کا زور بڑھا۔ مذہبی علوم کی تعلیم ختم ہونے پر تشویش تھی ہی، اچانک حکومت نے اشتہار دے دیا کہ جو شخص سرکاری سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ ہوگا یا فلاں فلاں علوم اور

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور ص ۱۲۰

انگریزی میں امتحان دے کر سند حاصل کرے گا اُسے دوسروں کے مقابلے میں ملازمت کے لیے ترجیح دی جانے گی۔ اِس طرح تعلیم کے متعلق بھی سوءِ ظن پیدا ہو گا۔" [1]

جب انگریزی حکومت نے مذہبی تعلیم اسکولوں اور کالجوں سے خارج کر دی اور اُس کی جگہ انگریزی زبان و علوم کو دے کر ملازمت کے سلسلے میں انگریزی تعلیم کو فوقیت اور اولیت دے کر مشرقی اور مذہبی علوم کو پامال کرنا شروع کیا تو اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ملازمت کے سلسلہ میں اپنے مقرر کردہ ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ کو لازمی قرار دیا۔ یہ امر متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نظر میں زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا کیونکہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ہی اُس وقت ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے غدار انگریزوں کے ایجنٹ سمجھتے تھے اور اُنھیں کالا پادری کہا کرتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اِس امر کا یوں اظہار کیا ہے:

"دفعتاً پیشگاہ گورنمنٹ سے اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہو گا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہو گا، وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ اِس طرح چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سارٹیفکیٹ پر، جن کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے، منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی۔ اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے کہ ناچار ہو کر رفتہ رفتہ اِن لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائیگا۔" [2]

سر سید احمد خاں صاحب بہادر نے اپنی سرکار نامدار، بدپائدار کی صفائی پیش کرتے ہوئے اور ملک و ملت کے دین و ایمان کی تباہی و بربادی کی اسکیموں کی تائید و تصدیق کرتے ہوئے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۰

[2] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۷

یہی انگریز دوستی اور اقتدار پرستی کا ایسا عمل کہ ثبوت دیا کہ دین فروشوں کیلئے علی الاعلان حکومت کی حمایت اور ملک و قوم کے خلاف بولنے کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ موصوف اس وقت خود ساختہ مصنوعی کرب بیان کرتے ہیں:

"چوتھی بات یہ ہے کہ ہمارے عادل کانوں تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اس ملک کے رہنے والے علوم و فنون اور انگریزی زبان حاصل کرنے کے اسکولوں کو اپنے مذہب و ملت کی تبدیلی کا سبب جانتے ہیں، اسی وجہ سے لوگ تحصیلِ علم و تکمیلِ فنون میں سستی کرتے ہیں، بچوں کو اسکولوں میں نہیں بھیجتے، یہ سب خیالات بدعقلی و کج فہمی کی وجہ سے ہیں"[1]

انگریزی حکومت کی چال یہ تھی کہ جب اپنے کسی تخریبی منصوبے پر عمل کرنا منظور ہوتا تو اپنے دیسی ایجنٹوں سے اُس کے بارے میں تجویزیں پیش کروا دی جاتی تھیں اُس کے بعد حکومت یہ کہہ کر احکامات جاری کر دیتی کہ ملک کے بعض اہلِ امراء کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے [illegible] یہ حکم نافذ کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب حکومت نے سررشتۂ تعلیم کے ذریعے مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں میں برائے نام باقی رکھا ہوا تھا تو عالیجناب، معلی القاب [illegible] سرسید احمد خاں صاحب نے یوں تجویز پیش کی تھی:

"سررشتۂ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے، وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہلِ ہند کا ہے۔ اُردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو . . . . میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، جاتی رہے، صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اول، ص ۱۲۲

اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر طرح کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔" لہ

بعض حضرات آج تک یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ سرسید احمد خان صاحب اردو زبان کے بہت بڑے حامی تھے اور انہوں نے اس زبان کی بڑی خدمت کی تھی، ایسے حضرات ذرا آنکھیں کھول کر حیاتِ جاوید کے اس حوالے کو پڑھیں اور انصاف کو مدِنظر رکھیں۔ مسلمان قوم کو بدلنے، اسلام سے ناآشنا کرنے اور نئی نسل کو دین سے ناواقف محض رکھ کر انگریزی خواں اور بے راہ رو بنانے اور بنوانے میں کہیں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ موصوف بھی پورے پورے شریک کار تو نہیں تھے؟ یہ فیصلہ کرنا قارئین کرام کا کام ہے۔ سہ

وہ یہ کہتے ہیں، بسایا ہے بیاباں ہم نے
ہم یہ کہتے ہیں، اُجاڑا تھا گلستاں کس نے؟

جب مذہبی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں سے قطعاً خارج کر دیا گیا تو دینی علوم حاصل کرنے والے مسلمان ملازمتوں سے محروم رہ کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگے یا قوم کے رحم و کرم پر پلنے کے لیے کسی مسجد میں اڈہ جا کر بیٹھ جاتے۔ اس کے برعکس جس نے انگریزی پڑھی ہوتی، اُسے کالے پادریوں (ڈپٹی انسپکٹروں) سے ملازمت کے لیے سرٹیفکیٹ مل جاتے اور خاصی گزر بسر کرتے نظر آتے۔ ان حالات میں کون سا والد ہے جو اپنے بچوں کو بے روزگار دیکھنا چاہتا ہو؟ اُنھیں دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہو؟ اگرچہ دوسری طرف ایمانی غیرت، اور دینی حمیت دامن کھینچتی تھی لیکن اولاد کی خوشحالی اور بدحالی کے جو مناظر روزانہ نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے، اُن کے پیشِ نظر اکثر حضرات نے اپنے بچوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں کا راستہ ہی اختیار کیا جیسا کہ آزاد ہونے کے بعد سے مملکتِ خداداد پاکستان میں بھی کمال سعادت مندی اور فرمانبرداری کے ساتھ انگریزوں کی اسی اسلام دشمن پالیسی پر متواتر پچیس سال سے آج تک عمل ہوتا آ رہا ہے۔

لہ الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ص ۱۴۲

بہرحال یہ راستہ اختیار کر کے ملازمت تو مل جاتی تھی۔ یہ تعلیم معاش کا ایک ذریعہ ضرور
ثابت ہوتی تھی لیکن جب یہ نونہال اسکولوں اور کالجوں کی چار دیواری سے فارغ التحصیل ہو کر
نکلتے تھے تو وہی کچھ بن کر نکلتے تھے جو انگریز انھیں بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ مسلمان عیسائی بننے پر
آمادہ نہ ہوئے اور انگریز اپنے اِس مقصد میں واقعی ناکام رہے لیکن حکومت نے اپنا
مقصود دوسری طرح حاصل کر لیا کہ اِن کی تعلیم حاصل کرنے والی نئی نسل کی اِس انداز سے
ذہنی تربیت شروع کر دی۔ گفتار و کردار اور غور و فکر کے زاویے اِس طرح بدل دیے کہ
نام کے مسلمانی کے علاوہ اُن کے مسلمان ہونے کا ثبوت شاید ہی کوئی ملتا تھا۔ گویا عیسائی
نہ بنے تو حقیقی مسلمان بھی نہ رہنے دیا۔ یہ تھا برطانوی منصوبہ جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں
خصوصاً مسلمانوں کو اُن کے دین سے ہٹانے اور اسلام کے عدیم النظیر فیوض و برکات سے
محروم رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کا ٹکراؤ: انگریز جس طرح ملک کے بلا شرکتِ غیر حاکم بنے، دولت لوٹی،
یہاں کی صنعتیں تباہ کیں، پاک و ہند کے باشندوں کی پشت ہا پشت کے گاڑھے خون
پسینے کی کمائی سے جس طرح اپنے قلاش ملک انگلستان کو خوشحال اور صنعتی بنا دیا، اِن میں
ہر ظلم دوسرے سے بڑھ کر تھا۔ اہلِ ملک کو تڑپانے کے لیے اِن میں سے ایک ظلم بھی کافی تھا،
لیکن پے در پے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے اور خون کا گھونٹ پی کر مظلوم سہتے
رہے تھے۔ مگر جب پاک و ہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر عمل شروع
ہوا تو مظلوم بلبلا نے لگے۔ حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے نقطۂ عروج پر
جا پہنچے۔ اِس ستم بالائے ستم نے غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑا دی، پورا ملک ایک آتش فشاں
پہاڑ بن گیا۔ صرف کسی خاص بہانے کی ضرورت تھی کہ چربی والے کارتوسوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے
کا کام کیا۔ فوجیوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو جو کارتوس دیے جاتے ہیں اُن پر خنزیر کی چربی اور
ہندوؤں کو دیے جانے والے کارتوسوں پر گائے کی چربی لگائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کارتوس
دانت سے لگائے بغیر چل نہیں سکتے تھے لہذا ہندو اور مسلمان فوجیوں کا یہی خیال تھا کہ بس
اب کے حکومت اُن کے دھرم اور ایمان کو خراب کرنا چاہتی ہے اور اُن کے جذبات کو

تھیں پہنچا رہی ہے۔ میرٹھ چھاؤنی کے بعض سپاہیوں نے وہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو انھیں اطمینان دلانے کے بجائے نشۂ اقتدار میں بدمست رہنے والے افسروں نے اُن کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا۔ اِس امر کا تذکرہ جناب غلام رسول مہر نے مؤرخانہ انداز میں یُوں کیا ہے:

"۹ مئی کی صبح طلوع ہوئی۔ دیسی رسالے کو پیدل پریڈ کے میدان میں آنے کا حکم مل گیا۔ یورپی فوج کو اور توپ خانے کو اِس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی خفیف سی بھی حرکت کرے تو توپوں کے منہ کھول دیے جائیں اور سب کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ پچاسی مجرموں کو جنھوں نے میرٹھ چھاؤنی میں ۲۴ اپریل ۱۸۵۷ کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا تھا اور جنھیں انگریز سرکار نے موت کا حکم سُنا چکے تھے، پہرے میں لایا گیا۔ پریڈ کے میدان میں پہلے اُن کی وردیاں اُتاری گئیں، پھر لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ اِن مجرموں کو بیڑیاں پہنائی جائیں۔ چنانچہ اِس پر عمل ہوا۔ کیئی نے لکھا ہے: "یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ اُن بدنصیب آدمیوں کے پاس اِس انگیز انداز سے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہو گئے۔ اُن میں ایسے بھی تھے جو فوج کے گُل سرسبد سمجھے جاتے تھے۔ وُہ سپاہی جنھوں نے حد درجہ امتحانی حالات اور اجنبی مقامات میں حکومت برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور اُن کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا۔ قیدی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور بلند آواز کے ساتھ جرنیل سے التجائیں کر رہے تھے کہ ہم پر رحم کیجیے اور ایسی ذلت خیز سزا نہ دیجیے۔ جب انھیں اُمید کی کوئی بھی کرن نظر نہ آئی تو وُہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بُرا بھلا کہنے لگے کہ کیوں چُپ چاپ کھڑے ہمیں ذلت کا نشانہ بنتے دیکھ رہے ہو؟"

ظاہر ہے کہ گرد و پیش توپیں لگی ہوئی تھیں اور اُن کی امداد کے لیے ایک بھی حرکت سب کی یقینی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ لہٰذا اگرچہ دلوں میں غیظ و غضب کے

طوفان متلاطم تھا، تاہم صبر و ضبط کے سوا چارہ نہ تھا۔ ذمہ دار انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ فعل سراسر احمقانہ تھا اور اس درجہ احمقانہ جو تصور میں نہیں آسکتا۔ [1]

موصوف نے اس جرنیل کے اسی احمقانہ فعل کے بارے میں فارسٹ جلد اول صفحہ ۴۴ کے حوالے سے اس وقت کے انگریز گورنر جنرل کے تاثرات یوں پیش کیے ہیں:

"آدمیوں کو پریڈ میں بیڑیاں پہنانا جس میں کئی گھنٹے صرف ہوئے اور ان لوگوں کی موجودگی میں سب کچھ کرنا جن میں سے بہتیروں کی طبیعتیں برگشتہ تھیں اور وہ کارتوسوں کی داستان کو درست سمجھتے تھے، یقین ہے کہ اس سے پریڈ کے دل پر سخت ضرب لگی ہوگی۔ فوج کے مزاج اور ان لوگوں کے جرم کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں ایسی رسم کی بجا آوری کے بعد محض دیسی گارد کی حفاظت میں جیل بھیجنا ناقابلِ تصور حماقت تھی۔" [2]

یہ ہیں گورنر جنرل کے تاثرات۔ جب حکومت ایسی جابر اور ظالم ہو تو لاوا کیوں نہ پکتا۔ میرٹھ چھاؤنی میں مذکورہ بے طاقتی جرنیل نے فوجیوں پر وہ قیامت خیز ظلم ڈھایا کہ مظلوموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ابتدا میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو وہاں فوج نے بغاوت کر دی۔ انگریزوں کی فوج سے تصادم ہوا۔ جنگل کی ہوا کی طرح یہ خبر دوسری چھاؤنیوں میں پہنچی اور وہاں بھی دیسی اور پردیسی فوجیں باہم دست و گریباں ہوئیں۔ فوجوں کی طرف دیکھ کر میرٹھ کے ہوتے عوام بھی اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور ظالم حکمرانوں سے بدلہ لینے میں شریکِ کار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک میدانِ کارزار بن گیا۔ دیسی اور پردیسی محکوم اور حاکم، مظلوم اور ظالم آپس میں اس طرح ٹکرا گئے کہ ایک فریق کی مکمل تباہی یقینی تھی۔

۱؎ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۹۸

۲؎ ایضاً: ص ۹۹

اِس مسلح اور بھرپور تصادم کا نتیجہ صاف نظر آرہا تھا کہ پاک و ہند کی سرزمین پر حکومت کرنے کا انگریزی کارنامہ چند روز میں حرفِ غلط کی طرح مٹنے والا تھا کتنے ہی مقامات پر دیسی فوجوں کا قبضہ ہوگیا اور انگریزوں کا کسی شہر پر قبضہ باقی رہ جانا تو دُور کی بات ہے یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید ایک بھی انگریز واپس برطانیہ جانے کے لیے زندہ و سلامت نہ بچ سکے گا لیکن بعض ملک دشمن اور ملت فروش عناصر نے تن من دھن کی بازی لگا کر اپنے آقاؤں کی بگڑی بنا دی، اکھڑی ہوئی حکومت پھر جما دی اور اِس طرح ہزاروں برادرانِ جعفر و صادق نے اپنے عمل سے ملت فروش ہونے پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

صُوبہ یو پی سے انگریزی اقتدار کا جنازہ سب سے پہلے نکالا گیا اور جگہ جگہ قومی پرچم لہرا دیئے گئے، لیکن اُن جاں نصیبوں کو کیا معلوم تھا کہ انگریزوں کے بعض بہی خواہ، چند سِکّوں پر بِک جانے والے ملک دشمن اور ملت فروش عناصر اِس خوشی کو پھر مایوسی میں تبدیل کر دیں گے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوّے سال کے لیے انگریزوں کو پاک و ہند کی قسمت کے مالک بنائے رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انگریزوں کی حمایت میں خود اپنے بھائیوں کا خون اِس جُرم کی پاداش میں اپنے ہاتھوں بہائیں گے کہ وہ ایک غیر ملکی ظالم قوم کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ میاں محمد شفیع نے صُوبہ یُو پی کے حالات کا نقشہ اپنے الفاظ میں یُوں کھینچا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ اِس ساری تحریک کا مرکز یُو پی تھا، جس کا کونا کونا سلگ اُٹھا، جس کے ایک ایک دل سے انگریزوں کے خلاف لاوا پُھوٹ بہا۔ جس نے ملک اور دین کے لیے جان و مال، عزّت و آبرُو، محبّت، شفقت، دنیا طلبی، حرص، لالچ، مآل اندیشی، بہتری، بہبود، ہر چیز کی بازی لگا دی۔ نہ ماضی کی شان کو دیکھا، نہ مستقبل کی تباہی کو سوچا، نہ جاگیروں پر نظر گئی، نہ دولت کا خیال آیا۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں آزادی خواہی میں بھڑک گیا۔ آبادیوں اور جنگلوں میں آگ لگ گئی۔"[1]

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۵

جنرل بخت خاں، خان بہادر خاں اور دیگر مجاہدین جنگِ آزادی نے جس دانش مندی اور جرأت سے بریلی شہر کو سب سے پہلے انگریزی تسلّط سے آزاد کروایا، وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بریلی کی اس شاندار اور جرأت مندانہ معرکہ آرائی کے بارے میں میاں محمد شفیع صاحب نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے:

"آفریں ہے روہیلکھنڈ کے ان مجاہدین پر جنھوں نے بریلی کے میدان میں شجاعت اور قربانی کی مثال قائم کی تھی اور بتادیا تھا کہ مسلمان بیچارگی میں شیرِ نیستاں اور پیل دماں ہے۔ جب وہ اللہ کے نام پر تلوار اُٹھاتا ہے تو وہ کائنات کو جھکا کر سر سے ہم آغوش ہوجاتا ہے۔ باطل کا ہجوم اس کے ضمیر کو زیر نہیں کرسکتا۔ طاقت و جبروت کے سینے میں پنجے ڈال دیتا ہے۔"[۱]

خان بہادر خاں صاحب نے بریلی کو فتح مندی سے ہمکنار کرنے کے بعد دیگر اضلاع اور خصوصاً دہلی میں بادشاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ پاک و ہند کے باشندوں کو آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے گرمایا اور سر توڑ کوشش کرنے کی ترغیب دلائی۔ میاں صاحب نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے:

"یہ ساری کوشش خان بہادر خاں اور اس کے کارکنوں کی تھی کہ اتنی آسانی سے بیک وقت روہیلکھنڈ کا صوبہ آزاد ہوگیا۔ پھر اس نے خود ایک عرضداشت بادشاہ کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی اور روہیلکھنڈ کے تمام اضلاع میں بھی شائع کی: "ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظار کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ تم اسے قبول کرتے ہو یا رد کرنا چاہتے ہو؟ تم اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے یا اپنے ہاتھوں سے دے دینے پر تیار ہو اور فائدے کے خواہشمند نہیں؟"[۲]

۱۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۶

۲۔ ایضاً: ص ۳۰۶

بریلی اور اُس کے گرد و نواح کو انگریزی تسلط سے پاک کرنے کے بعد وہاں کا انتظام خان بہادر خاں کے سپرد کیا گیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا ممتاز مجاہد و مدبر، جنرل بخت خاں عازمِ دہلی ہوا۔ فوج، خزانہ اور سامانِ حرب و ضرب ساتھ تھا تاکہ بادشاہِ دہلی کی مدد کر کے مُتحدہ حکومت میں جان ڈالی جائے۔ بریلی سے لاؤ لشکر سمیت بخت خاں کا جانا خود ظاہر کرتا ہے کہ انگریزی حکومت میں کسی جگہ روک نے یا ٹکرانے کی سکت نہیں تھی۔ انگریزی طاقت چھوٹے چھوٹے اجزا میں منتشر ہوئی پڑی تھی۔ لیکن اس مجاہدِ ملت کی اُمنگیں اور آرزوئیں کامیاب ہوتے ہوتے ناکام ہو کر رہ گئیں۔ غلام رسول مہر نے اِن حقائق کو یُوں بیان کیا ہے:

"جنرل بخت خاں ادھر جولائی میں پہنچا۔ وُہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اُسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی۔ ساز و سامان بھی لایا تھا اور روپیہ بھی خزانۂ سرکار میں جمع کیا تھا۔ اس میں جنگی اور انتظامی دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں، لیکن اُس کے پہنچنے سے پیشتر شہزادے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خاں کو پُورے اختیارات دے دیے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا اور کوئی اور شخص دہلی میں مختار بن جائے۔ وُہ ہر کام میں روڑے اٹکاتے رہے یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہ سکا۔"[1]

جنرل بخت خاں کی قابلیت کو میاں محمد شفیع صاحب نے یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"بخت خاں میں دو باتیں جمع تھیں، اوّل تو وہ روہیلہ تھا، جو شجاعت و جانبازی کا سبب ہے، پھر یہ کہ اس میں بادشاہی خُون بھی تھا، جس نے تحمل، شائستگی اور مزید شرافت کی خُوبیوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ باقی طبعی خوبیاں بھی اِس اچھے روہیلے میں کسی سے کم نہ تھیں ... انگریز نے اس کی دانائی اور فوجی شعور دیکھ کر تمام دیسی توپ خانہ اُس کے ماتحت کر دیا۔ جس بیٹری کا یہ سردار تھا وہ کارگزاری میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ غدر کے

---

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۲۱

قریب یہ لائق صوبیدار بدل کر اپنے باپ دادوں کے اصل وطن بریلی میں آ چکا تھا
اور اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔
۲۱ جون کو جب بریلی میں انگریزوں کا صفایا ہو گیا تو بخت خاں جیسا کہ پہلے
بتایا جا چکا ہے، سات ہزار باقاعدہ سوار اور پیدل کی رجمنٹیں اور کئی ہزار
مجاہد لے کر مع سامانِ حرب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچا۔"[1]

مولانا احمد اللہ شہید مدراسی رحمۃ اللہ علیہ ایک متبحر عالمِ دین اور صاحبِ اجازت تھے
۱۸۵۷ء کی جنگ میں آپ نے عدیم النظیر جنگی کارنامے سرانجام دیے۔ جس فنی مہارت کے
ساتھ مولانا نے انگریزوں کے مایۂ ناز اور پختہ کار جرنیلوں کو پے در پے شکستیں دیں اور اُن کے
جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا، وہ تاریخِ عالم کے جنگ آزما جرنیلوں کی تاریخ کا ایک سنہرا
اور تابناک ورق ہے۔ اس سلسلے میں میاں محمد شفیع یوں رقمطراز ہیں:

"۶ مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں اور باقی لیڈر بریلی سے نکل گئے (کیوں کہ
انگریزوں نے حریت پسندوں کو شکست دے کر دوبارہ بریلی پر قبضہ کر لیا تھا)
مولوی احمد اللہ شہید پھر شاہجہان پور پہنچے۔ ان کی تیز نظر نے بھانپ لیا تھا کہ
انگریز وہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بریلی پر آئے ہیں۔ اُنھوں نے وہاں پہنچ کر
اُس تھوڑی سی فوج کو مار بھگایا اور بریلی کی شکست کی تلافی کر لی۔ جنرل
جیل کو سخت ہزیمت دی ۔ ۔ ۔ ۔ اب لڑائی کا رنگ یہ ہو گیا کہ سر کولن اِدھر
کو فتح کرتا تھا تو مولوی صاحب روہیلکھنڈ پر قبضہ جما لیتے تھے۔ وہ روہیلکھنڈ
(بریلی) کو لیتا تھا تو یہ اُدھر کو فتح کر لیتے تھے۔ اس پریشانی میں انگریز
نے طے کیا کہ اس آہنی ہاتھ کو شل کر دینا چاہیے۔ اس بے مثل مجاہد
سے جب تک پیچھا نہ چھڑایا جائے گا اُس وقت تک ساری کوشش
بیکار ہے، اس کے سوا اور کوئی ایسا خطرہ نہیں، پھر بھی لڑائی میں قابو

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۰

پاتا یا اس کو زیر کرنا مشکل تھا، اس لیے سوچ لیا کہ یہ کام غدار اچھی طرح کر سکیں گے۔" [1]

انگریزوں نے "پاوِن" نامی ایک ہندو راجہ سے ساز باز کی جس نے پچاس ہزار روپے انعام پانے کے بدلے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو اور حریت پسندوں کے عدیم النظیر جرنیل کو شہید کرکے پاک و ہند کی غلامی کے محضر پر دستخط کر دیئے۔ میاں صاحب نے مولانا احمد اللہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کے محیر العقول کارناموں کے پیشِ نظر یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"آخرکار قوم اور دین کا سب سے بڑا مجاہد، ملک کی آزادی کا عظیم ترین حامی، شجاعت کا شیرِ نیستاں، اس آخری وقت کا سہارا، عقل و تدبر کا نمونہ، جنگی چالوں میں انگریز کے جگر کو پگھلانے والا، عزم و استقلال کی چٹان، اسلام اور مسلمانوں کا فخر، انقلابیوں کے ٹوٹے ہوئے دل کی جان، آزادی خواہوں کی امیدوں کا روشن آفتاب، اس طرح اپنے ہی ایک غدار کے ہاتھ سے موت کی وادی میں غروب ہو گیا۔" [2]

مولانا احمد اللہ شہید نے شاہجہان پور کے معرکے میں جس فراست، تجربہ کاری اور عزم و استقلال سے انگریزوں کے ایک مایۂ ناز سپہ سالار "جرنل ہیل" کو شکست فاش دی اور اُس کے سارے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا تھا، مولانا کی اس مہارت اور زالی کارکردگی پر میلیسن کے تبصرے کو میاں صاحب نے یُوں نقل کیا ہے:

"مولوی کا یہ حملہ بالکل اچھوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی یورپ کا جرنل لڑ رہا ہے۔" [3]

مولانا احمد اللہ شہید کی شہادت کا علم ہونے پر جوشِ مسرت میں "ہومز" نے اپنے خیالات

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۸

[2] ایضاً، ص ۲۵۹

[3] ایضاً، ص ۲۵۸

یُوں اظہار کیا:

"شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن، سب سے خطرناک انقلابی ختم ہو گیا ہے۔" [1]

اودھ کے علاقے میں مدتوں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہاں جس استقامت اور پامردی کے ساتھ حریت پسندوں نے آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے جنگ جاری رکھی، اس پر خود میلیسن نے یُوں تبصرہ کیا تھا:

"اودھ کے لوگ اپنے سپاہی بھائیوں کے شریکِ کار ہو گئے اور ملک کی آزادی کے لیے جانیں دے دیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ انھوں نے کس عزم و ارادہ اور سرفروشی کے ساتھ ہم سے جنگ آزمائی کی۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں ایسی طویل اور استقامت آمیز جنگ نہیں ہوئی۔ ان تمام معرکوں میں اس ظلم کی داستان (واجد علی شاہ کی معزولی) آگ لگاتی رہی جو ہم نے ۱۸۵۶ء میں کیا تھا۔ یہی خیال، یہی رُوح تھی جس نے اُن کے دلوں کو فولاد سے زیادہ مضبوط کر دیا تھا.... شکستوں پر بھی اُن کا یہ حال تھا کہ بھوکوں مر جانے کو ہماری اطاعت پر ترجیح دیتے تھے اور اُن تمام طبقوں نے اُس آخری وقت میں خاموشی اختیار کی جب دنیا میں اُن کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔" [2]

اودھ کے معزول حکمران واجد علی شاہ کی بیگم، حضرت محل، جس نے میدانِ جنگ تو کیا زندگی بھر محل سے باہر کی فضا بھی نہیں دیکھی تھی، چونکہ برطانوی مظالم سے سینہ فگار تھی، اس لیے جب اس خاتون نے شمعِ حریت کے پروانوں کو سینہ سپر دیکھا، تو خاموش نہ بیٹھ سکی بلکہ برجیس قدر کی سرپرست بن کر، رعایا میں نئی رُوح پھونک کر میدانِ کارزار میں انگریزی فوجوں سے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵۔

[2] ایضاً، ص ۲۸۶

معروفِ پیکار ہو گئی۔ میاں صاحب نے یُوں اِس امر کی وضاحت کی ہے:

"تیموری اِس بادشاہ کی کوتاہیوں کو اُس کی ایک بیگم، حضرت محل نے اِس طرح پُورا کیا کہ انتقام کی آگ میں اگر دشمنوں کو نہ جلا سکی تو کیا، خود اُس میں جل کر قوم کو سُرخرو کر گئی اور جو کچھ بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا، اُس کی لکھنؤ میں رہ جانے والی اِس بیگم نے بہر طرح کی قربانی دے کر حق ادا کیا، حالانکہ لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) کی طرح نہ آزاد فضا کی پلی ہُوئی تھی، نہ اُس نے تیر و تفنگ کا استعمال سیکھا تھا، نہ مردوں کے دوش بدوش رہی تھی، وُہ تو شاہی محلوں کی پردہ نشین خاتون تھی۔۔۔ اِس لائق بیگم نے اپنے بیٹے برجیس قدر کی سرپرستی لے کر محبوب علی کو نیابت دی اور سب سے پہلے بادشاہِ دہلی کو آزادیِ اودھ کی مبارک باد دے کر علاقے کے زمینداروں، جاگیرداروں، نوابوں اور راجاؤں کو خطوط لکھے۔ سب نے اطاعت میں تلوار اٹھائی اور سینہ سپر ہو گئے۔" [1]

تیموری خون کا امین، شہزادہ فیروز شاہ اِن انتہائی بگڑے ہُوئے اور ناسازگار حالات میں بابر اور اورنگ زیب کی یادگار ثابت ہُوا۔ دہلی سے گوالیار تک کے اکثر معرکوں میں حریت پسندوں کی مختلف جماعتوں میں شامل ہو کر مردانہ وار لڑتا اور شمعِ حریت کے پروانوں کو غاصب انگریزوں سے لڑاتا رہا۔ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر گیا کہ بابر کی شجاعت اور اورنگ زیب کی ایمانی فراست کا کم از کم ایک امین، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت مُغلیہ خاندان میں ضرور موجود تھا۔ اِس عظیم شہزادے کو میاں صاحب نے یُوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"جس وقت غدر ہُوا، اُس سے پہلے ہی فیروز شاہ حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو ساحل پر قدم رکھتے ہی انقلاب کی خبر کانوں میں پڑی اور یہ جوانمرد شہزادہ دہلی پہنچ کر ہنگامۂ دار و گیر میں کود پڑا، دادِ شجاعت دی اور جب دہلی پر انگریز قابض ہو گئے تو نہایت احتیاط کے ساتھ مشرقی دروازے سے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۶

نکل کر بریلی کی طرف آگیا۔ بریلی کی جنگ کا خونریز معرکہ ختم ہوا تو نانا صاحب کے پاس جا پہنچا اور جب تانتیا توپی ناگپور سے دوبارہ گوالیار آیا ہے تو یہ اور نواب باندہ بھی اُس سے جنگلوں میں آملے تھے۔ وہ (تانتیا توپی) بھی گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ گیا تو فیروز شاہ کچھ دنوں اِدھر اُدھر بھٹک بھٹکا کر خوش قسمتی یا ہوشیاری سے بچ نکلا اور مکے چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ وہیں باقی زندگی فقیرانہ حالت میں گزار کر دنیا کو رخصت کیا۔ رحمت ہو اُس باہمت شہزادے پر۔" [1]

جھانسی کی رانی لکشمی بائی سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں عورت ہونے کے باوجود جس طرح مردانہ وار حصہ لیا اور اپنی حریت پسندی کا لوہا منوایا اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

"لکشمی بائی بھی حضرت محل کی طرح محل کی راحتوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئی، ورنہ انگریز کے قدموں پر سر جھکا دیتی تو اُس کی زندگی کی راحتوں میں ذرا سا بھی فرق نہ آتا۔ اُس نے جھانسی سے غاصب انگریز کو نکال دیا۔ اُس کے انقلابیوں نے ساگر، نوگاؤں، باندہ، بانا پور، شاہ گڑھ اور کرکی سے انگریزوں کا نام نشان مٹا دیا۔ رانی نے اِس کے بعد امن و امان اور انتظام کی وہ لیاقت دکھائی کہ لوگ حیران رہ گئے۔" [2]

"تانتیا توپی برہمن نے جس شجاعت اور جوانمردی سے اس جنگِ آزادی میں حصہ لیا وہ بھی حریت پسندوں کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ نامساعد حالات میں بھی مختلف انقلابی لیڈروں کے ساتھ مل کر اور تنہا انگریزوں سے اِس طرح مقابلہ کرتا رہا کہ ستم پیشہ انگریزوں کو ناک چنے چبوا دیے۔ مولانا احمد اللہ شہید کے بعد تانتیا توپی کی رزم آرائیاں، فنونِ حرب و ضرب کے لحاظ سے کسی بھی دوسرے انقلابی لیڈر سے کم حیرت انگیز نہیں۔ اس محب وطن برہمن کے کارناموں کا کرشمہ ملاحظہ ہو:

---

[1] محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱۹

[2] ایضاً، ص ۲۰۷

"جنرل ونڈھم جس نے یورپ میں اپنی لیاقت دکھائی تھی، اس وقت کان پور کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ تانتیا بہمن نے جو کبھی نانا صاحب کا کلرک اور اب جنرل تھا، سوچ لیا کہ اب کان پور میں تھوڑی سی فوج ہے، جنرل ونڈھم پر ضرب لگانی چاہیے اور اپنی بے قاعدہ فوج لے کر جنرل ونڈھم کے مقابلے پر آ گیا۔۔۔۔ باقاعدہ سخت گولہ باری شروع ہوئی۔ تانتیا نے اپنی فوج کو نیم دائرے کی شکل میں ترتیب دے کر بڑھنا شروع کیا۔ ونڈھم نے حلقہ توڑنے کی کوشش کی لیکن تانتیا کی توپوں نے معذور کر دیا۔۔۔ تانتیا کے دائرے نے گرفت کو زیادہ مضبوط کر دیا۔ شام کے چھ بجے تک انگریزی فوج نے پورے طور پر حوصلہ ہار دیا اور بہت سا سامانِ جنگ انقلابیوں کے ہاتھ آیا۔۔۔۔ دن نکلتے ہی لڑائی شروع ہو گئی اور انقلابیوں نے دونوں پہلوؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ دایاں بازو بالکل اڑا دیا۔ بریگیڈیر ولسن، کیپٹن ایم کری مارٹی، میجر سٹرلنگ، میجر گیبن سب مارے گئے۔ تیسرے دن انقلابیوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ انگریزی فوج بالکل تباہ ہو گئی۔ اُس دن تانتیا کا پورے کانپور پر قبضہ ہو گیا۔"[۱]

متعدد بار حوصلہ شکن حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کیونکہ غداروں کی سرگرمیوں کے باعث ملکی حالات میں نشیب و فراز آتے رہے لیکن وہ سب بہادر جن کا ہر جذبہ حب الوطنی سے سرشار اور آزادیٔ وطن کا والہانہ طلبگار تھا، بے سروسامانی کی حالت میں بھی اُس کے عزائم متزلزل نہ ہوتے۔ مثلاً:

"تانتیا رانی جھانسی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑتا رہا اور جب یہ بہادر رانی جنگِ آزادی میں ماری گئی تو اکیلا رہ گیا اور نانا صاحب سے بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ نہ کوئی فوج تھی، نہ سامان تھا، پھر بھی پوری ہمت سے راؤ صاحب اور پیشوا کو ساتھ لے کر سر متھورا (متوسط ہندوستان) میں جا بیٹھا اور غداروں کی

---

[۱] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۰

لُوٹ کر کچھ سامان مہیا کر لیا۔ [۱]

تانتیا، راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ، جنھوں نے اپنی حریت پسندی اور جواں مردی کا زندہ
اپنے عمل سے گھر میں بیٹھ کر نہیں، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیا کیا
اُن بہادروں کا انجام ملاحظہ ہو :

"۲۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کی رات کو ورودن نے میجر لاک کی فوج پر سخت شبخون مارا
اور بالکل تباہ کر کے جنگل سے نکل گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ بھی اپنی فوجوں سے آملا
اور یہ سب اندرگڑھ میں جمع ہو گئے۔ انگریزوں نے ہر طرف سے گھیرا ڈال لیا۔۔۔
جب یہ لوگ جنگل میں چھپے ہوتے تھے تو انگریز جیالوں نے مان سنگھ سے جو اس
تمام دوڑ دھوپ میں اُس (تانتیا) کا ساتھی تھا سازش کر لی اور اس غدار نے
جنگِ آزادی کے اس ہیرو کو گرفتار کرا دیا۔ ۸ اپریل کو تانتیا انگریزوں کے
ہاتھ میں آگیا۔ تین دن مقدمے کی کارروائی ہوئی، پھر ۱۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو
پھانسی دے دی گئی۔ آخر وقت جب یہ بہادر تختے کے پاس پہنچا اور پھانسی
دینے والے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے بڑھے تو اس نے مسکرا کر کہا "اس
تکلف کی کیا ضرورت ہے؟" اچھل کر خود پھندا گلے میں ڈال لیا اور لٹک گیا۔
راؤ صاحب ۱۲ اگست کو جنگلوں سے گرفتار ہوا اور پھانسی دی گئی۔ شہزادہ
فیروز شاہ بچ کر نکل گیا اور مکے جا پہنچا۔" [۲]

جب انگریزوں نے اپنے زر خرید غلاموں اور حلیفوں یعنی ملک دشمنوں اور ملت
کے سہارے انقلابیوں کا زور توڑ دیا اور تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں پر دوبارہ
کر لیا، تو انقلابیوں کے چھوٹے چھوٹے باقی ماندہ جتھے ایک جگہ جمع ہونے میں کامیاب
انگریزوں نے انھیں پسپا کرتے ہوئے نیپال کی ترائی میں دھکیل دیا۔ ان بہادروں

---

[۱] محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۷۱

[۲] ایضاً، ص ۲۷۳

بیچارگی اور کس مپرسی کی حالت میں بھی اپنے خون سے مادرِ وطن کی سرزمین کو لالہ زار کر دیا لیکن طاغوتی قیصروں کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ میاں صاحب اِس امر کی یہ وضاحت فرماتے ہیں:

"نیپال کی ترائی اُن بہادروں کے خون سے رنگین ہو گئی جنھوں نے اپنے ملک کی آزادی کے لیے ہر عزیز سے عزیز چیز کی بازی لگا کر ڈھائی سال تک انگریزوں کی طاقت کو ہلکان کیا تھا۔ بے سروسامانی اور بدنظمی میں انتہائی معذوری، مجبوری اور بےبسی میں بھی اپنے ملک کی عزت کو بلند رکھ کر جانیں قربان کیں۔ ہر طرف سے مایوسی کے بادل سر پر منڈلاتے دیکھے۔ اہلِ ملک کی غداری سے سارے سہارے ٹوٹ گئے۔ موت کے سوا کوئی آس نگاہوں کے سامنے نہ رہی، پھر بھی تلوار ہاتھ سے نہ رکھی اور غاصب، ظالم انگریز کے سامنے سر نہ جھکایا۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کے دامن میں آخری حملے کر کے خون میں نہاتے اور زمین پر گر کر آنے والی نسلوں کو بھی آزادی کا پیغام دے گئے۔"[1]

قارئینِ کرام! یہ تھا ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کا ایک رُخ۔ اب اِسی تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ۱۸۵۷ء میں لاکھوں حریت پسندوں کا خون کن منحوس چہروں کی وجہ سے رائیگاں گیا۔ وہ کون سے وطن دشمن اور ملت فروش عناصر تھے جن کے باعث مٹھی بھر پردیسی پاک و ہند کے کروڑوں باشندوں کو دوبارہ طاقت کے ذریعے غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مرزا الٰہی بخش کا کارنامہ ملاحظہ ہو:

"یہ (مرزا الٰہی بخش) شاہی خاندان کا بڑا سمجھدار آدمی، بادشاہ کا رشتے میں چچا اور سمدھی تھا۔ بہادر شاہ اس سے تمام معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔ اِس ظالم کو ملک و مذہب سے تو کیا ہمدردی ہوتی، خاندان کی بہتری سے بھی بےبہرہ نکلا۔ انگریزوں کا پٹھو بن کر شماتا دیا بھی بجھا دیا۔ ذرا ذرا سی خبریں پہنچائیں، زینت محل کو سبز باغ دکھا کر ہم راستے کر لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی ڈورے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۸۲

ڈالے اور انقلابیوں کو بدنام کرتا رہا۔ ہر معاملے میں انھیں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تاکہ اس کا انعام مارا جائے۔

سب سے بڑا کارنامہ جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہ کو بخت خان کے ساتھ جانے سے روکا، پھر اپنی زندگی میں بادشاہ کو پکڑوایا اور شہزادوں کی گرفتاری کے وقت بھی پہنچ کر ان کو تسلیاں دیں اور ذبح کرا دیا۔ چالاک اتنا تھا کہ سب پر شبہے کیے گئے اور گرفتیں ہوئیں اور شور مچے لیکن یہ ہر طرح محفوظ رہا۔ نہایت چرب زبان اور سلجھا ہوا تھا۔ ایک اور ظلم اس نے یہ کیا تھا کہ جمنا کا پل تڑوا دیا، جس کی وجہ سے انقلابیوں کی مشرقی رسد رسانی بند ہو گئی۔ انگریز نے بھی پیٹ بھر کے انعام دیے۔ دربار میں پہلی کرسی مقرر ہوئی۔ ۲۲۸۳۰۰ روپے سالانہ پنشن دی جو نسل در نسل تھی۔ بیوی کی الگ، لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ، عزیزوں کی ان کے علاوہ۔ بعد میں مختلف تقریبوں پر اضافے ہوتے رہے۔ یہ ننگ خلف اپنے خاندان کی درگاہ حضرت سلطان جی میں رہا اور ۱۸۷۵ء میں مرا۔[۱]

بہادر شاہ ظفر کے معتمد اور مشیر یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی محسن کشی اور ملک دشمنی ملاحظہ ہو:

"بہت سمجھدار، تعلیم یافتہ اور معاملات میں بصیرت رکھنے والا آدمی تھا لیکن جس پر رجب علی اور الٰہی بخش کا جادو چلے، وہ غداری نہ کرے یہ کیونکر ہو سکتا تھا؟ افسوس تو یہ ہے کہ جس پر بادشاہ اور عوام کو پورا اعتماد ہو، عزت سے وقت بھی گزر رہا ہو، ہر طرح کی دلجوئی بھی ہوتی ہو، وہ ملک اور قوم اور اپنے ولی نعمت سے بے وفائی برتے! ..... بادشاہ کے خلاف گواہی دی، اس سے زیادہ اور کیا کرتا۔"[۲]

---

[۱] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۲۵

[۲] ایضاً، ص ۳۲۶

مولوی ذکاء اللہ صاحب نے منشی رجب علی جگرانوی کے بارے میں اُس کی ملت فروشی
بر ہندوستی کے پیشِ نظر یُوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے :

" سرکارِ انگریزی کے جو ایجنٹ اس مخبری کے لیے کہ دشمن کیا حرکتیں کرتا ہے
دہلی میں رہتے تھے اُن سب کے سردار منشی رجب علی تھے ۔ جاسوسی کے لیے
جو اعلیٰ درجے کی لیاقتیں چاہییں وُہ اُن میں تھیں ۔ انگریز افسروں کو اُن پر پُورا
اعتماد تھا ۔ وہ ہمیشہ اپنے کارفرماؤں کے ساتھ راست باز رہے ، بھیدی بات دریافت
کر لینے کی عجیب قابلیت و استعداد اور فراست و کیاست رکھتے تھے " ! [1]

اس کی ملت فروشی اور انگریزوں کا ایجنٹ ہونے پر میاں صاحب نے یُوں تبصرہ کیا ہے :

" یہ مولوی یا منشی ، انگریز کا ارسطو جاہ ، جسے علم ارسطو کی ہوا بھی نہ لگی تھی ، جگراؤں
ضلع لدھیانے کا رہنے والا تھا ۔ دہلی کالج کا ذہین طالب علم ، ملک و ملت کے درد
سے بالکل بیگانہ تھا ..... وائسرائے کا میر منشی بھی رہا ۔ بڑا کام یہ کیا کہ دہلی کے
بڑے قوم فروش الٰہی بخش وغیرہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایسے کام کرائے کہ رہتی دنیا
تک دونوں کی پیشانی پر کلنک کے ٹیکے ثبت رہیں گے " ۔ [2]

سو کی اس جنگِ آزادی کو ناکام بنانے اور مٹھی بھر انگریزوں کو مزید نوے سال کے لیے
ملک و قوم پر مسلط کر لینے میں کون کون سی طاقتوں کا ہاتھ تھا اُن کی نشان دہی یُوں
کی ہے :

" فرنگی کی یہی وُہ کامیابی تھی جس نے ملک کی آزادی کو سَو سال پیچھے پھینک دیا ۔
ہندوستانی سپاہی نہ ملتے ، فوجیں مہیا نہ ہوتیں ، تو اُس کا تدبر کام نہ آتا ،
نہ سازوسامان مدد دیتا ، یک بینی و دو گوش اپنے جزیرے میں جا بیٹھتا ۔ وُہ
جو شہری غدار اور خانساماں بیرے اُسے چمٹے ہوئے تھے کب تک بچا لیتے ؟

---

[1] ۔ ذکاء اللہ مولوی ، عروج عہدِ انگلشیہ ، ص ۴۰۳
[2] شفیع میاں ، ۱۸۵۷ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۳۲۶

وُہ نکال دیا گیا تھا اور نکال دیا جاتا۔

بھلا ہو میاں والی اور عیسیٰ خیل والوں کا، بھلا ہو پنجاب کے پھلنے پھولنے والے زمینداروں کا، بھلا ہو ریاست ہائے پھلکیاں کا اور سب سے زیادہ بھلا ہو سکھ قوم کا، جس نے صرف روٹی کے لیے انگریزی غلامی کا پٹا گلے میں ڈال کر بڑی خوشی اور انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ اُس کی جڑیں پاتال تک پہنچا دیں اور ملک کے آزادی خواہوں کے سینے چھلنی کر کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کو لوٹ کر ہندوستان (پاک و ہند) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لیے کلنک کا ٹیکہ لگا دیا۔ لہ

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں صوبہ پنجاب نے جس طرح حصہ لیا اُس کے متعلق سرجان لارنس کی رپورٹ کا ایک اقتباس اور میاں صاحب کے اپنے تاثرات اور تحقیق ملاحظہ ہو:

"انگریز یو۔پی میں بے دست و پا ہو گیا تھا لیکن پنجاب اُس کے اثر میں تھا۔ پنجاب کے سکھ اور مسلمان فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور اُنھیں کے ذریعے وہاں کے جن اضلاع میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی اُن کو سختی سے تباہ کر دیا گیا۔ اب دہلی کا مرحلہ درپیش تھا اور اُس کے بعد ہندوستان کے اکثر حصوں میں اِس آگ (تحریکِ آزادی) کو بجھانا تھا۔ بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی گئی اور لوگ بہت خوشی کے ساتھ انگریز کے دست و بازو بن کر ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اُن کی کیا نیت اور کیا ارادے تھے، کس خیال پر اِتنی آسانی سے شرکت کی؟ سرجان لارنس کی زبانی سُنیے، وُہ غدر کی رپورٹ میں لکھتا ہے: "پنجابی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اپنی برتری کا احساس تھا اور پنجابی خیال کرتے تھے کہ ہم اُن سے بہتر ثابت ہوں گے۔ اِسی بنا پر خیال کرتے تھے

لہ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۹۔

کہ جس روٹی کو ہندوستانیوں نے ٹھکرا دیا ہے، وہ اب ہمارے حصّے میں آئیگی، اس کے ہم مالک نہیں ہونگے۔" [۱]

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں صوبہ پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے حریت پسندوں کا ساتھ دے کر انگریز کی غلامی کا جُوا اتار پھینکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس جب کئی شہروں اور علاقوں سے برٹش اقتدار کا جنازہ نکل چکا تھا، تو صوبہ پنجاب کے باشندوں نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر برطانوی ڈاکوؤں کے دست و بازو بن کر حریت پسندوں کو کچلنے اور انگریزی اقتدار دوبارہ بحال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اس صوبے کا کارنامہ یُوں بیان کیا گیا ہے:

"پنجاب کی عدم شرکت کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سکھوں کے ظلم نے اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ بغاوت میں حصّہ لیتے۔ اُن کا ملکی و قومی شعور مردہ کر دیا تھا۔ شاید یہ صحیح ہو کیونکہ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب انگریز نے بھرتی کی تحریک شروع کی تو سب لبیک کہہ کر دوڑ پڑے تاکہ لُوٹ میں شریک ہو کر ہندوستانیوں سے بدلہ لیں۔ پھر انگریز کے دست بدست اُن کے سب مظالم میں حصّہ لیا اور کسی بڑے سے بڑے فعل سے بھی اجتناب نہ کیا اور نہ شرم محسوس کی اور نہ دل میں یہ خیال گزرا کہ اُن بھائیوں پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اپنے لیے نہیں، اپنی قوم اور مذہب کے لیے ایک غیر قوم سے لڑ رہے ہیں۔" [۲]

پنجاب کے مشہور ٹوانہ خاندان نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا رول ادا کیا تھا۔ لیکن میاں محمد شفیع نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر یہ رائے پیش کی ہے:

"مئی ۱۸۵۷ء میں تین سو سواروں کا دستہ بھرتی کر کے جہلم میں پلٹن نمبر ۱۴

---

[۱] محمد شفیع میاں؛ ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۸

[۲] ایضاً: ص ۱۹۹

کے باغیوں سے لڑا پھر خالم کوپر کے ساتھ مل کر نمبر ۲۶ کے باغیوں سے چالبازی کی اور اُن کو گرفتار کرایا اور اجنالے کا کنواں آزادی خواہوں کی لاشوں سے پاٹنے میں اِس کا ہاتھ تھا۔ اِس کے بعد مختلف علاقوں میں بہت کارگزاریاں کیں۔ تانتیا کے مقابلے میں کالپی کا میدان انقلابیوں کے خون سے رنگین کیا اور وہاں سے جنرل نیپیئر کے ساتھ وسطی ہند کے جھگڑے نمٹائے۔

پنجاب میں واپس آکر خان بہادری کا خطاب، چار سو اسّی روپے کی پنشن اور بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ اپنی محنت اور جستجو سے بہت سی زمین حاصل کر کے دریا ستلج سے نہر تک کھدوائی۔ گھوڑوں کی نسل کو قابلِ رشک ترقی دی۔ خاندانی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہا۔ عزت پائی اور سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور آخر میں تمام جائداد ملا کر ایک اچھی خاصی ریاست ہو گئی اور صرف تدبیر سے شاہ پور کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک رئیسِ اعظم بن گیا۔ ہارے مجاہدِ وطن اور جاں نثارانِ دین و قوم کے خون کی سیاہی کہاں جا سکتی ہے۔"[1]

لاہور کے قزلباش خاندان کے بارے میں بھی میاں صاحب کی دلچسپ ہی تحقیق ہے۔ معلوم نہیں اُن کے پاس کیسے دلائل تھے؟ اُن دلائل میں کتنا وزن ہے؟ بہر حال یوں لکھا ہے:

"علی رضا خاں قزلباش۔ اِس نے غدر میں دہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائداد بیچ کر خرچ بھرا۔ اِس میں اس کے چاروں بھتیجے (بلکہ پانچوں)، عبداللہ خاں، محمد حسن خاں، محمد زمان خاں، غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اِس فوج نے نکلسن کی نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی۔ محمد رضا خاں اِس کا بھائی بہت دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں"

---

[1] شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۲۔

دو مرتبہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں بے محابا گھس جاتا تھا، اس لیے "آرڈر آف میرٹ" حاصل کیا۔ سردار بہادری کا خطاب اور دو سَو روپے پنشن علی الدوام ملی۔ علی رضا خاں کو بطور تیغ اودھ میں تعلقداری ملی، خان بہادر کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے۔ ۱۸۶۴ء میں علی رضا خاں کو نوابی کی عزت بخشی گئی۔ اس کے بڑے بیٹے نوازش علی خاں کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور باپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا۔ دوسرے بیٹے ناصر علی خاں کو بعد میں اسسٹنٹ کمشنر بنایا گیا۔ نوازش علی خاں نے خدمت خلق سے بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہوا، بلکہ پنجاب کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ ای کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں چھوٹا بھائی ناصر علی خاں نواب ہوا اور عزت سے کارگزاریاں دکھا کر ۱۸۹۶ء میں مرا۔ فتح علی خاں نے اس کی جگہ لی، جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و فرماں برداری سے انگریز کے نزدیک سر بلند و باوقار رہا۔"[1]

شاید ایسے ہی کارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر دیوبندیوں کے امیر شریعت اور شعلہ بیان خطیب یعنی مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری (المتوفی ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) نے بقول علامہ خالد محمود صاحب سرزمین پنجاب کی یوں منظوم تعریف فرمائی ہے:

ندیدم کشورے مردود و مرتاب — بہ شوی ہائے کفر آباد پنجاب

چو ملکے ننگ و عارِ سے ہفت کشور — ز شرق و غرب بادش خاک بر سر

خمیر طینتش مردم کشی ہا — زنقل مسلکش باشد خوشی ہا

چہ پیرانش مریدانِ فرنگی — لقب کافور و ذاتِ پاک زنگی

ز نواب و رئیسانش چہ پرسی — سگ و سگ زادگان کرسی بکرسی

چناں فرزند ناہموار زاید — کہ از خر قیمتش برتر نیاید

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۴

چکد از لالہ اش خونِ مسلماں — ازو نالاں حجاز و مصر و ایراں
جوانانش غلامانِ فرنگی — پناہِ شاں بدامانِ فرنگی
چو پنجاب آں فرنگی را معسکر — معسکر را غلام احمد پیمبر
ضلالت را پیمبر ہست پنجاب — فرنگی را معسکر ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیز است — بہ آئینِ الٰہی در ستیز است

زمینِ فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطان پیشِ پائش سجدہ ریزے ۱؎

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو کہاں کہاں سے بھرتی کرنے کے لیے جوان ملے، جن کے تے پر حریت پسندوں کو بُری طرح کچل کر برٹش گورنمنٹ کو دوبارہ استحکام نصیب ا، ملاحظہ ہو:

"یکم اپریل ۱۸۵۸ء تک انگریزی فوج کی تعداد چھیانوے ہزار تک پہنچ گئی۔ سکھ، پٹھان اور پنجابی مسلمان بھرتی ہو ہو کر آ گئے۔ راجاؤں اور نوابوں نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اس طرح بے شمار فوج جمع ہو گئی اور چاروں طرف پھیل کر انقلابیوں کا صفایا بول دیا۔ لیگارڈ اور ڈگلس، بہار کی طرف چلے گئے۔ سر ہنری لارنس نے نیپال سے شروع ہی میں مدد منگا لی تھی اور جنگ بہادر غدار نہایت خلوص اور پابوسی سے پانچ ہزار گورکھوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گیا۔" ۲؎

مشرقی پنجاب میں پٹیالہ، نابھہ اور جیند وغیرہ سکھوں کی ریاستیں تھیں۔ یہ ریاستیں ئی وطن کی تہِ دل سے دشمن نکلیں۔ انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں کے خلاف ڑھ کر کارنامے دکھائے۔ انقلابیوں پر دل کھول کر ضربیں لگائیں اور انگریزوں سے

۱؎ رشید ارشد، مودودی، بیس بڑے مسلمان، ص ۸۱۱

۲؎ شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

بھی بڑھ کر مظالم کے پہاڑ ڈھائے۔ ان کے کارنامے نمایاں کی کہانی پنجاب کے مشہور مورخ جناب غلام رسول مہر کی زبانی سماعت فرمائیے:

"ان ریاستوں کو موقع حاصل تھا کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں یا اسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور ان کی امداد کے بغیر انگریزوں کا عقب حفاظت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بھی بیٹھی رہتیں تو اس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے خاصے امکانات موجود تھے لیکن جب پٹیالہ، نابھہ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان تعلقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان ریاستوں نے شہنشاہِ دہلی کی دعوت ٹھکرائی، جو سوار پیغام لے کر آئے تھے انھیں قتل کر دیا۔ اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے، اپنی فوجیں جمع کیں، جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا انھیں بچائے رکھا، پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا۔" [1]

ان ریاستوں کی مذکورہ کارکردگی پر موصوف نے یوں تبصرہ کیا ہے:

"جیند، نابھہ اور پٹیالہ کے علاقے ایسی جگہ واقع تھے کہ اگر وہاں کے رئیس ذرا صبر کرتے تو دہلی سے ستلج کا پورا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتے تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے اور ان کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلۂ مخابرت قائم کر لینے کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ یقیناً مارے جاتے۔ اس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندوستان کو از سرِ نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً انھیں کامیاب ہونا آسان نہ رہتا، لیکن ان سکھ ریاستوں کی انگریز دوستی اور

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۰

وطن دشمنی نے صورت بگاڑ دی" [۱]

[سکھ]وں کی وطن دشمنی اور انگریز دوستی، جو اس موقع پر واضح ہوئی وہ قومی لحاظ سے پاک و [ہند] کی تاریخ میں ایک امتیازی کارنامہ ہے کیونکہ پوری سکھ قوم انگریزوں کی ڈوبتی ہوئی ناؤ [ب]چا کر کنارے پر لگانے کی غرض سے آزادی چاہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے [م]د مقابل صف آراء ہو گئی، مثلاً:

"سکھوں نے اس اہم موقع پر جبکہ مذہب و ملت کے درد نے ہر ہندوستانی کے دل کو آگ بگولہ بنا دیا تھا، خاص طور پر خلوص کے ساتھ انگریز کی غلامی کو راحت سمجھ کر گلے میں ڈالا اور دست و بازو بن کر ہندوستان کے دل پر ضربیں لگائیں، جیسے خاص اسی کام کے لیے پیدا ہوئے تھے، اور تو اور اپنی رانی مائی جنداں کا بھی انگریزوں کے لیے مقابلہ کیا۔ دہلی میں آ کر تو گویا حقِ نمک ادا کر دیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں اور باغیوں کو ذاتی دشمن سمجھ کر لڑے" [۲]

انگریزوں نے سکھوں کو حریت پسندوں کو کچلنے اور خاص طور پر ان سے تختِ دہلی [کے] ما[لک]وں کو نیست و نابود کروانے کی غرض سے جیدا ذرائع سے پر اشتعال انگیزی کی، اس [...]ی کا ذکر میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"انگریزوں نے سکھوں کو بھڑکانے کے لیے ایک عجیب چال چلی۔ گویا کہ بادشاہِ دہلی کی طرف سے ایک جھوٹا اعلان چھپوا دیا کہ سب کاموں سے پہلے باغیوں کا یہ فرض ہے کہ سکھوں کو تباہ کر دیں۔ سکھ پہلے ہی وطن پرستی سے خالی تھے، [ل]یکن اس تحریک سے کوئی ہمدردی نہ تھی، اس اعلان سے اور بھی بلند ہو کر بھرتی [ہو] گئے تا کہ دہلی اور دہلی والوں سے خوب بدلہ لیں" [۳]

---

[۱] [...]ول عہد: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

[۲] [...] مسیح میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۳

[۳] [ایضاً]، ص ۱۹۸

پاک و ہند کے مختلف گوشوں میں پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے جو کارنامے انجام دیئے اُن کی ایک جھلک پیش کی جا چکی۔ پنجاب کے اندر جو دوسرے صوبوں کے فوجی مختلف چھاؤنیوں میں تھے، جب انھوں نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تو اُن حریت پسندوں کے ساتھ پنجاب میں جو سلوک ہوا وہ ملاحظہ فرمایئے:

"پنجاب میں بھی فتح کے بعد پوربیوں ہی کی پلٹنیں پشاور تک پھیلی پڑی تھیں وہ ہر جگہ بگڑیں لیکن انگریز یہاں معذور و مجبور نہ تھا۔ ملک (پنجاب) کے لوگ اُس کے دست و بازو تھے۔ ہر جگہ اُن کو کچل دیا گیا۔ باقی مقامات سے پلٹنیں پہنچتی رہیں، فیروز پور سے بھی قریب ہونے کی وجہ سے پہنچیں۔" [1]

نواب احمد علی خاں ممڈل نے اِس جنگِ آزادی میں جو کارنامہ انجام دیا اُس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو:

"ممڈل خاندان کا نواب (احمد علی خاں) جس کی خدمات کی تعریفیں لارڈ کیننگ تک نے کیں، سالانہ پانچ سو روپے لگان کے ادا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا گیا، اِس لیے کہ اُس نے غدر میں انگریز کی ایسی مخلصانہ مدد کی کہ ملکہ وکٹوریہ کا بیٹا بھی نہ کرتا۔" [2]

جن حضرات کی انگریز دوستی اور ملک دشمنی کی طرف سطور بالا میں اشارات کیے گئے۔ اُن سے مقصود کسی پر کیچڑ اُچھالنا یا کسی کو بدنام کرنا نہیں، بلکہ اِن حضرات کا ذکر ضمناً اِس وجہ سے آ گیا ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں نے جس طرح سرزمین پاک و ہند پر قبضہ جمایا، مدتوں یہاں کے باشندوں پر حکومت کرتے رہے، کتنے ہی اہم ترین مواقع پر ناممکن کو ممکن کر دکھاتے رہے، اُن کے اندر جو صلاحیت تھی اُس صلاحیت کے دو جز ہیں، ایک یہ کہ اُن کے اندر ایجنٹ تلاش کرنے اور اُن کے ذریعے سازشوں کا جال پھیلانے کی بڑی مہارت تھی اور دوسرے

---

[1] محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷، مطبوعہ لاہور، ص ۱۸۹

[2] ایضاً: ص ۳۲۷

یہ ہے کہ ملک کے اندر ایسے حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر بڑی سے بڑی چیز قربان کر دیا کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ کی ساری کامیابی کا راز دراصل اِن حضرات کی ملک دشمنی، پیٹ پرستی اور ملت فروشی کی مرہونِ منت ہے۔ یہاں صرف اُن حضرات کا تعارف منظور تھا جن کی بدولت برطانوی یہاں اپنی حکومت جما سکے اور مٹھی بھر ہونے کے باوجود اپنا قبضہ و اقتدار ایسے وسیع و عریض ملک پر برقرار رکھنے میں کامیاب و کامران رہے۔ ملک اور قوم کا اپنے ذاتی، اور گھٹیا مفاد پر سودا کرنیوالوں کی نشان دہی کر دینا بھی انگریزوں کی عیاری اور مظالم کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ؎

لاؤ تو قتل نامہ ذرا ہم بھی دیکھ لیں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

اِس تحریکِ آزادی کے دوران اور دوبارہ غلبہ پا لینے کے بعد انگریزوں نے اہلِ ہند کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً کیسے کیسے ظلم و ستم روا رکھے اور تاریخِ عالم کے بے رحم ترین فرمانرواؤں کو بھی شرمندہ کر کے کس طرح امتیازی مقام حاصل کیا؛ اِس کے ثبوت میں چند ایک انسانیت سوز وحشیانہ مظالم کے واقعات پیش کرتا ہوں۔ جب مرزا الٰہی بخش نے مغل شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کروا دیا، تو جنرل ہوڈسن نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا:

"شہزادے رتھ پر سوار اور سواروں کے حلقے میں چلے آ رہے تھے۔ جیل خانے کے قریب پہنچے تو ہوڈسن نے سامنے بلوا کر، کپڑے اُتروا کر، پھر اُسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ سے تین تین گولیاں مقامِ قلب پر ماریں اور شہ رگ کو سنگین سے چیر دیا اور اسی طرح چبوترۂ کوتوالی میں جا کر نعشوں کو زمین پر ڈال دیا۔"[1]

شہزادوں کے ساتھ یہ ظالمانہ اور بہیمیت کا سلوک روا رکھنے کی، خود ہوڈسن نے یہ وجہ بیان کی تھی:

---

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۳

میں بے درد نہیں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اُن بد بختوں (تین شہزادوں) کے
وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میرا
ارادہ یہ تھا کہ انھیں پھانسی پر لٹکاؤں گا، لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار
کر لی کہ وہ رہیں گے یا ہم، تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہ تھا۔“ [1]

ہو سکتا ہے ہوڈسن کا یہ بیان انگریزوں یا دوسرے انصاف پسند دشمنوں کو مطمئن کر گیا ہو لیکن
اصل سوال تو اپنی جگہ پر علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ بتانا تو یہ تھا کہ شہزادوں کو یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی تھی؟
متحدہ ہندوستان کے شاہی خاندان کو ختم کرنے کا برطانوی لٹیروں کو کہاں سے پرمٹ ملا تھا؟
کون سا ضابطۂ اخلاق انھیں اس سفاکی کی اجازت دے رہا تھا؟ شہزادے کون سی
ناپاکی پھیلا رہے تھے جس کے پیشِ نظر ہوڈسن جیسے پاکباز کو ان کے وجود سے زمین کو پاک کرنا پڑا؟
کیا انگریزوں کے پاس ان مظالم کے جواز کا کوئی ثبوت ہے؟ ان کے علاوہ دیگر مغل شہزادوں
کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

”دلّی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے، پکڑے گئے۔ اُن کی تعداد انتیس بیان
کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکائے
گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا قیصر مرزا (ابن شاہ عالم ثانی) اکبر شاہ کا
بھائی تھا اور مرزا محمود شاہ، اکبر شاہ کا پوتا وجعِ مفاصل میں مبتلا تھا۔ اُن کی
لاشیں پھانسی میں گر لاٹھی لگی ہوئی لٹکتی تھی۔۔۔۔۔۔ شہزادے بے تمیزی
کے ساتھ پھانسی پاتے تھے۔“ [2]

پھانسی دینے سے پہلے شہزادوں کو تڑپانے کی غرض سے جیل خانے میں رکھ کر، اُن سے
مشقت لی جاتی، مارا پیٹا جاتا تھا۔ آخر اس سلوک کی وجہ؟ کس جرم کی یہ پاداش تھی۔ جناب
غلام رسول مہر کی زبانی شہزادوں کا یہ قصور تھا:

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۰
[2] ذکاء اللہ مولوی: عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۰۰

"جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی اُن سے عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی وہ بیچارے مشقت کیا کر سکتے تھے! اُن سے چکی پسوائی جاتی تھی، پیس نہ سکتے تو کوڑوں کی مار پڑتی یہاں تک کہ وہ بیچارے چند روز میں مرجاتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کتنے مرے ، اُن کا قصور اس کے سوا کیا تھا کہ بہادر شاہ کے خاندان سے تھے۔" [1]

کیا چشم فلک کہن نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے کہ کسی قوم نے حکمران خاندان کو چُن چُن کر پھانسی لگایا ہو، جب گدھ اُن کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں تو ڈھانچے دریا میں پھینکوائے گئے ہوں ۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو نہ سہی، انگریزوں نے متحدہ ہندوستان میں شاہی خاندان کے افراد سے ۱۸۵۷ء میں یہ سلوک کر کے اپنی برتری کا لوہا منوایا۔ ونایک ساورکر نے اس بہیمانہ مظاہرے پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"جب گدھ کچھ مدت تک اُن کا گوشت نوچ چکے تو مُردے ہوئے جسموں کو کھنچوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔ آہ زمانے تیرے انقلابات! شہنشاہ اکبر اعظم کی اولاد پر نمازِ جنازہ ادا کرنے اور انھیں آغوشِ زمین میں سُلانے والا بھی کوئی نہ تھا!" [2]

مغل شہزادوں پر تو یہ ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے لیکن جب متحدہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں انگریز فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تو باشندگانِ دہلی پر جو قیامت برپا کی وہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی زبانی سُنیئے:

"سپاہ شہر کشا نے شہر میں قدم رکھا تو اس کے سامنے جو مرد آیا اس کو وہ گولی مارتے۔ اس وقت دوست دشمن ، مجرم و غیر مجرم میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اس میں کچھ ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔" [3]

---

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۴۵۱

[2] ونایک ساورکر، ساورکر، طبع اول، ص ۸۸ ؟

[3] ذکاء اللہ مولوی، عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۶۵ ؟

دہلی میں انگریزی سپاہ اور سکھوں کے جیش جب والہانہ انداز میں داخل ہو گئے تو بچے کھچے باشندوں کے ساتھ انھوں نے انسانی ہمدردی کا کمال تک ثبوت دیا تھا۔ یہ جناب مہر صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"کرنل برن شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا، جس نے قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی۔ شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لشکریوں کے جیش مقرر ہو گئے جو بازاروں، گلیوں کے چکر لگاتے، جہاں کسی گھر کو آباد پاتے، مردوں، عورتوں، بچوں سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے اوڑھنے بچھونے کے پشتارے مردوں کے سروں پر ہوتے۔ تلاشی میں جو چیز قیمتی ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو کوڑی میں کوئی نہ خریدتا اُسے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں سینگ سمائیں، چلے جائیں۔ اِس طرح باقی شہر بھی خالی کرا لیا گیا۔" [1]

۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لال قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب مابرٹس کان پور جانے لگا تو اُس نے دہلی کو بھی گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہجہان آباد کی بربادی کا نقشہ رابرٹس نے یُوں کھینچا تھا:

"صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا یہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہرِ خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سُموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وُہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجزیہ و تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجئے کہ بے ارادہ زیرِ لب باتیں کر رہے تھے تاکہ انسانیت کے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۱

ان دردناک واقعات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے، جن مناظر سے ہماری آنکھیں
دو چار ہوئیں وہ بڑے ہی خوفناک اور انتہا درجہ رنج افزا تھے۔

کہیں کوئی کُتا کسی نعش کا برہنہ عضو جھنجھوڑ کر کھا رہا تھا۔ کہیں کوئی گدھ ہمارے
قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑپھڑاتے پروں سے ذرا دُور چلا جاتا تھا
لیکن اس کا پیٹ اِتنا بھر چکا تھا کہ اُڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہُوئے
زندہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی کے ہاتھ اُوپر اُٹھے ہُوئے تھے جیسے کسی کو اشارہ
کر رہا ہو۔ در اصل یہ پُورا منظر اِس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ
بیان میں نہیں آ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری
تھا، اِس لیے وُہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پُھلا رہے تھے۔ پُوری فضا
ناقابلِ تصور حد تک بھیانک تھی، جو بڑی مضر اور بیماری آور بدبُو سے لبریز تھی۔[1]
باشندوں کے ساتھ یہ سلوک کرنے پر لُوٹ مار کا جس طرح بازار گرم کیا گیا وہ مہر صاحب کی
زبانی سُنیے: —

'فتح کے ساتھ ہی فوج کو تین دِن کے لیے لُوٹ کی اجازت دے دی گئی تھی۔
باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ اجازت نہ بھی دی جاتی تو سپاہ اِس حالت میں
بھی باز نہ رہتی۔ سکھوں اور دُوسرے لوگوں کو معلوم تھا کہ دہلی میں اعلیٰ قیمتی
سامان، جواہرات، سونے چاندی کے برتنوں اور روپے کے انبار لگے ہوئے
ہیں ... شکاری کتوں کی طرح جھول ڈال وُہ گلی گلی اور بازار بازار پھر نکلے۔
ایک بے آباد گھر کے بعد دُوسرے میں داخل ہوتے۔ ہُنرمندوں کی طرح
آہستہ آہستہ دیواروں اور تختوں پر تھپکیاں مارتے، فرش پر پانی ڈالتے اور
دیکھتے رہتے کہ کہاں جلد رِستا ہے، پھر عقاب کی آنکھ یا سُرخ ہندوستانی کے
کان یا شکاری کتے کی ناک سے کام لے کر سیدھے گڑھے یا تہ خانے یا

---

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۰

زمین میں دبے ہُوئے برتن نکال لیتے، جن میں عمر بھر یا پشتوں کی بچائی ہُوئی پُونجی موجود ہوتی۔"[1]

دہلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک روا رکھا اُس کا تصور بھی انتہائی دردناک اور وحشت انگیز ہے۔ سیّد کمال الدین حیدر نے اس کا اجمالی تذکرہ یُوں کیا ہے:

"سنا ستائیس ہزار اہلِ اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتلِ عام رہا، اُس کا حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسلِ تیموریہ کو ذرہ رکھا مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورت سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔"[2]

عبادت گاہیں ہر مذہب و ملت کے نزدیک قابلِ احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں لیکن انگریزوں نے نہ انسانی اور اخلاقی ضابطوں کو مدِّ نظر رکھا اور نہ اپنے عیسائی ہونے کے دعوے کا کوئی پاس لحاظ کیا۔ مسلم کشی کے جذبے نے اُنھیں اِتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف جامع مسجد کو سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا۔ سکھوں نے بھی انسانی اور اخلاقی کسی زاویے سے اِس حرکت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی، بلکہ اِس خانۂ خدا میں وُہ نازیبا اور شرمناک کام کیے جو اُن کی قومی ذہنیت کا ایک جزو بن کر رہ گئے۔ مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں:

"جامع مسجد جو شہر کی کل مساجد کی ناک تھی اُس کو یُوں کٹنا بنایا کہ سکھ سپاہ کی بارک اِس کو بنایا۔ اس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز اُنھوں نے نہیں کیا۔ سکھوں نے اپنے کڑاہے حلوے کے سُرخ مینار کے نیچے خوب چڑھائے۔ سُور ذبح کر کر کے پکائے۔ کُتّے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف میں پڑے پھرتے تھے۔"[3]

جب دہلی کے باشندوں کو خاک و خون میں مِلا دیا، بچے کھچے افراد کو شہر سے بھگا دیا، اپنے نزدیک

---

[1] غلام رسول مہر، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۹۷۔

[2] کمال الدین حیدر، سید: قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۴۵۴

[3] ذکاء اللہ، مولوی: عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۱۹

تیموریہ خاندان کو مٹا دیا تو صرف دو چیزیں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک مغلوں کی آخری نشانی ضعیف العمر اور حرماں نصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر، جو انگریزوں کی قید میں تھا اور دوسری چیز دھلی کی نوحہ کناں خالی عمارتیں۔ ان کے بارے میں انگریزوں کا روزنامہ کرانیکل لاہور، ۱۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں یہ سوال کرتا ہے:

> "دہلی کو اب تک کیوں تباہ نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک کیوں زندہ ہے؟ اس کا جواب اختصار سے دے دینا چاہیے۔ شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود دفتری حکومت کا ممنون ہے۔ دفتری حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیے۔" [1]

یہی مطالبہ لاہور کے دوسرے انگریزی اخبار "پنجابی" نے ماہ نومبر میں اپنی حکومت سے ان لفظوں میں کیا:

> "دہلی مسلمانوں کا یروشلم ہے، کیوں اب تک اسے زمین کے برابر نہیں کیا گیا؟ بادشاہ مسلمانوں کی محبت و عقیدت کے جھگڑے کا پروہت ہے، کیوں اب تک اُسے پھانسی نہیں دی گئی یا گولی نہیں ماری گئی؟" [2]

جن کے خون پسینے کی کمائی سے انگریز پچھلے سو سال سے چوسے تھے، جن کی پشت ہا پشت کی پونجی کو لوٹ کر انگلستان جیسے غریب اور پسماندہ ملک کو صنعتی، مالدار اور ترقی یافتہ بنا بیٹھے تھے۔ آزادی اور دولت چھین لینے اُن کے مذاہب میں مداخلت کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی پاداش اور آزادی چاہنے کے جرم میں وہ مظالم ان غریبوں پر ڈھائے کہ جن کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دہلی میں جو کچھ کیا اس کی جھلک پیش کی جا چکی۔ باقی ملک میں شہروں اور دیہات میں، اس بدنصیب ملک کے باشندوں سے کیسا سلوک کیا گیا ملاحظہ ہو:

> "نیل نے الہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں ظلم و جور کی بھٹیاں دہکا رکھی تھیں۔

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۶۱

[2] ایضاً، ص ۳۶۱

اِس اثناء میں اُس کی جگہ ہنری ہیوسے لاک کو سپہ سالار بنا دیا گیا اور ہیوسے
۔۳ جون کو الٰہ آباد پہنچ گیا۔ نیل جتنا کام انجام دے چکا تھا، اُس کی تفصیلات
بیان کیں نیز بتایا کہ رینالڈ کو ہراول کے طور پر بھیجتے وقت اُس نے کیا کیا ہدایات
دیں۔ ہیوسے لاک نے اِن تمام ہدایات پر تحسین کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی
تصدیق کر دی۔ گویا ظلم وجبر اور بے پناہ تشدد محض نیل ہی کو پسند نہ تھا،
تمام انگریز جرنیل ایسے ہی طور طریقوں کو پسند کرتے تھے۔" [۱]

رینالڈ جس کو کرنل نیل مذکور نے ہراول کے طور پر آگے بھیجا ہوا تھا۔ اہلِ ملک کے ساتھ اُس کے سنگین مظالم، جن کی کوئی با اخلاق آدمی ہرگز جرأت نہ کر سکتا تھا، انگریزی ذہنیت کے پوری طرح آئینہ دار ہیں:

"دو روز میں بیالیس آدمیوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ بارہ آدمیوں کے ایک
گروہ کو اِس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ جب کالم کوچ کرتا ہوا اُن کے پاس
سے گزرا تو اُنھوں نے مُنہ پھیر رکھے تھے۔ رینالڈ جب پڑاؤ ڈالتا تو سامنے
کے تمام دیہات کو آگ لگوا دیتا۔" [۲]

کرنل نیل نے ایک مکان کے اندر فرش پر علیحدہ علیحدہ گائے اور سؤر کے خون کا چھڑکاؤ کرایا ہوا تھا۔ جو حریت پسند گرفتار ہو کر اُس کے سامنے پیش کیا جاتا اُسے پھانسی دینے سے پہلے یہ تعذیب دی جاتی کہ اگر مسلمان ہے تو اُس مکان میں اپنے حصّے کا سؤر کا خون زبان سے چاٹ کر فرش کو صاف کرے اور اگر قیدی ہندو ہے تو اُس سے گائے کے خون والی جگہ کا ایک قطعہ اِسی طرح صاف کروایا جاتا۔ جو انکار یا حیل وحجت کرتا تو کوڑے لگتے۔ انکار کی صورت میں کوڑے مار مار کر اُسے ختم کر دیا جاتا ورنہ صاف کرنے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا جاتا اور اِس طرح موت سے پہلے چند منٹ زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی۔ یہ

---

[۱] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

[۲] ایضاً: ص ۲۵۶

ڈنکار نیل نے ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو جاری کیا تھا۔ اِس طریقۂ تعذیب کو میلی سن جلد دوم ۲۰۰ سے یوں نقل کیا گیا ہے:

"بریگیڈیر جنرل نیل کا عزم مصمم ہے کہ بے گناہوں کے خون کا ہر دھبّا اِن بدمعاشوں (حریت پسندوں) سے قبل از نفاذ سزائے موت صاف کرایا اور دھلوایا جائے جو اَشنده غدر میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر گرفتار ہوں۔ اُنھیں حیثیت، ذات اور درجۂ جرم کی بنا پر اِس کام کے لیے منتخب کیا جائے۔ ہر بدمعاش کو موت کی سزا کا حکم سُن لینے کے بعد پہرے کے ساتھ متعلقہ مکان میں لے جایا جائیگا، اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ دھبّوں کا ایک حصہ صاف کرے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز بنا دینا چاہیے۔ اگر مجرم کام پورا کرنے تو فوجی کوڑا ل تازیانے لگائے۔ اپنے حصّے کا کام کر چکنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے۔ اس غرض سے پھانسی پاس ہی نصب کی جائے گی۔"[۱]

نیل نے اپنی اِس تجویز پر دل کھول کر عمل کیا لیکن ہنری ہیو سے لاک جسے نیل کی جگہ ڈبادو کے علاقے کا فوجی افسر مقرر کیا گیا تھا اس نے بھی ۲۰ روپیہ، وہ سے جو سلوک برّ صغیر ہند کے باشندوں کے ساتھ روا رکھا۔ وُہ ایک انگریز سیول افسر کی زبانی میلی سن جلد دوم ۲۷۷ سے یوں منقول ہے:

"راستے کے بہت سے گاؤں جلا دیے گئے تھے اور انسان وہاں قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دلدل تھی، جلی ہوئی جھونپڑیوں کے سیاہ کھنڈر تھے، جنھیں موسم کے اثرات نے اَور زیادہ بدوضع بنا دیا تھا۔ ایک بھی صدا نہ سُنی جاتی تھی جو کسی انسان کے وجود کا پتہ دیتی یا معلوم ہو سکتا کہ آدمی کام کاج میں لگے ہوتے ہیں۔ ایسی صداؤں کی جگہ مینڈکوں کے ٹرانے کا شور تھا یا ٹڈیوں کی تیز و تیز بانسریاں بج رہی تھیں یا ہزاروں پردار

---

[۱] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۱

کیڑے دھیمے دھیمے منمنا رہے تھے جو نمی اور گرمی کے باعث پیدا ہو گئے تھے، پھر نیم کے درختوں کی ناخوشگوار بُو بھی وقتاً فوقتاً گلی سڑی ہوئی لاشوں کی بدبو ہوا خواب کر رہی تھی، جنہیں ہماری آنکھوں کے سامنے مکروہ سؤر مزے سے کھا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمارے مختلف حواس پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور مل کر بربادی، تباہی اور رنج و ماتم کا ایسا مرقع تیار کر رہی تھیں جو میرے نزدیک موجود لوگوں میں سے کسی کو عمر بھر فراموش نہ ہوگا۔" [1]

لیفٹیننٹ مارٹس نے ١٢ جون ١٨۵٧ء کو جہلم سے اپنی والدہ کے نام ایک خط انگلستان بھیجا۔ اس میں اپنی قوم کے عزائم اور متحدہ ہندوستان کے باشندوں کو اذیت ناک سزائیں دینا اور توپ سے اُڑانا جس فخریہ انداز میں لکھا وہ انگریزوں کی ذہنیت کی صحیح تصویر ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"سزائے موت کی سب سے زیادہ مؤثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے اُڑا دیا جائے۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے ..... ہمارا مقصد ان بدمعاش مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک رہیں گے۔" [2]

جو ظلم و ستم دہلی میں ڈھایا گیا اسی طرح دیگر شہروں اور دیہات میں غالب آنے کے بعد انتقام کی بھٹیاں گرم کی گئیں۔ نیل، ہیوسے لاک اور رینالڈ کے جو مظالم بیان ہوئے، پورے ملک میں یہی کچھ کیا گیا۔ اس کے بعد فوجی عدالتیں نیچے پیچھے باشندوں کے لیے قائم کر دی گئیں، اُن کا عدیم المثال انصاف ملاحظہ ہو:

"ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے فوجی کمیشن کے سربراہ کے رُوبرُو پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا۔ موت کے سوا

---

[1] غلام رسول مہر، ١٨۵٧ء، مطبوعہ لاہور، ص ٢۵٩

[2] ایضاً: ص ٣۴٦

کوئی سزا نہ تھی اور اثباتِ جرم کے سوا کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے جرم کی چھان بین تھا وہ نرمی کے چنداں روادار نہ تھے۔" [1]

انگریزوں کا مقصد اس فوجی نظامِ عدالت سے یہ تھا کہ بچے کھچے باشندوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ بعد میں کوئی سر اُٹھانے کا تصور بھی دل میں نہ لانے پائے۔ اکثر کو ماخوذ کر لینے کے بعد سزائے موت کی سزا ہی دی جاتی تھی۔ طریقہ ہائے اذیت ایسے وحشت ناک اور غیر انسانی تھے کہ بعض انگریز بھی اُن پر اظہارِ ملامت کیے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ٹامپسن صفحہ ۴۳ سے ایک انگریز کا بیان یوں منقول ہے:

"ہندوستانیوں کے لیے تعذیبات، یہ مسلمانوں کو (پھانسی دینے سے پہلے) سؤروں کے چمڑوں میں سینا یا اُن کے جسموں پر سؤروں کی چربی ملنا اور اُن کے جسموں کو جلانا یا ہندوؤں کو بھرشٹ ہونے پر مجبور کرنا، یہ تمام حرکات سراسر خفقانہ اور غیر مسیحی ہیں اور ہمارے لیے باعثِ بے عزتی ہے۔ انجام کار یہ ہم پر مصیبت بن کر گریں گی۔ ان روحانی اور ذہنی تعذیبات کے بعد یورپ والوں کو منہ دکھانے کے قابل (ہم) نہیں رہ سکتے۔" [2]

فتح دہلی کے دو ماہ بعد لارڈ لارنس نے دہلی میں فوجی کمانڈر کے نام ایک آرڈر بھیجا جس کا ایک اقتباس ولیم میور کی کتاب جلد اوّل صفحہ ۲۲۹ سے یوں نقل کیا گیا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریق پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے اُس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہوگا۔ بہرحال دو مہینے کی لوٹ کو کافی سمجھنا چاہیے۔ میرے پاس اس بارے میں بمبئی سے بھی شکایتیں پہنچ رہی ہیں ..... میں نے یہ بھی سُنا ہے، اگرچہ یقین نہیں آتا

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۲

[2] ایضاً: ص ۳۲۹

کہ افسر باہر نکل کر دیسی باشندوں کو بیدردی سے قتل کر رہے ہیں۔۔۔۔
اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی چیرہ دستیوں سے باز رکھیں باغیوں اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑانے کے لیے مجھ سے زیادہ کوئی مستعد نہ ہوگا، لیکن ہمیں دوست دشمن میں امتیاز کرنا چاہیے۔ موجودہ صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں اور چھاپہ مار جنگ شروع ہو جائے، ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا ہی ممکن نہ رہے۔" [1]

سکھوں نے بھی انگریزوں کے دوش بدوش حریت پسندوں کو بلا امتیاز ہندو مسلم کے جسمانی اور روحانی اذیت پہنچانے اور دونوں قوموں کو برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے جو مورسے ٹامس نے ہنری کاٹن کو بتایا اور ٹامپسن صفحہ ۴۸ سے جناب غلام رسول مہر نے اپنے لفظوں میں اسے یوں بیان کیا ہے:

"اندھیرا ہو چکا تھا، ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کرنے کے بعد بولا کہ ہم نے قیدیوں سے جو سلوک کیا ہے، میں سمجھتا ہوں آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے۔ مجھے (ہنری کاٹن کو) شبہ ہوا۔ فوراً اٹھا اور حوالات میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بدبخت مسلمان آخری دموں پر ہیں۔ ان کی مشکیں کسی ہوئی ہیں، کپڑے اترے ہوئے ہیں اور تانبے کے پیسے گرم کر کے ان کے جسموں کو سر سے پاؤں تک داغا جا چکا ہے۔ میں نے خود انھیں گولی سے ہلاک کر دیا، تاکہ ان کی اذیتیں ختم ہوں۔" [2]

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۲
[2] ایضاً، ص ۲۴۴

ن سکھ ذہنیت کا مظاہرہ ہندوؤں کے بارے میں بھی ملاحظہ ہو کہ اجنالے میں کیپ
ماہرہ کیا:

"اجنالے کے اردگرد پہرے کھڑے کر دیے گئے تاکہ کوئی آدمی تھانے کی طرف نہ آنے پائے۔ دس دس کے جتھوں میں قیدیوں کو باہر لایا جاتا، ان کے نام اور پتے لکھے جاتے اور اُس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سکھ سپاہی اُنھیں گولیاں مارنے کے لیے متعین تھے۔ کوپر نے خود لکھا ہے کہ اُنھیں قتل گاہ کی طرف بھیجا جاتا تو وہ غصّے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے کہ ٹھہرو! تمھارے ساتھ بھی یہی سلوک ہوگا۔ کبھی سکھوں کو طعنہ دیتے، کبھی گنگا جی کو مدد کے لیے پکارتے۔" ۱؎

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں بعض انگریز افسروں نے جو بہیمیت اور درندگی کا ثبوت ، اہلِ ملک کے ساتھ محض اِس وجہ سے غیر انسانی برتاؤ کیا کہ اُنھوں نے آزادی حاصل نے کا تصور بھی کیوں کیا؟ انگریزوں کو دوسروں کے ملک پر قبضہ جما لینے، وہاں کی دولت ٹنے، صنعتیں تباہ کرنے، اِس کی دولت سے انگلستان کو صنعتی اور ترقی یافتہ بنانے قدرتی اور انسانی حق حاصل تھا لیکن دیسی باشندوں کا کوئی حق نہیں تھا کہ جب اُن کا ملک ارت ہو رہا تھا تو اُنھوں نے اُف کیوں کی؟ صنعتیں تباہ کی جا رہی تھیں تو کیوں بلبلائے؟ عیسا ئنے کی سر توڑ کوشش کر کے اگر انگریزوں نے اُن کے دلوں پر آرے چلائے تو سینوں سے ہ بے بسی کی آواز کیوں نکلی؟ یہ تھی متحدہ ہندوستان میں بسنے والوں کے جرائم کی فردِ سیہ انگریزوں کے نزدیک یہ جرم قابلِ معافی تھے؛ لیکن اخلاق اور انسانیت کی رُو سے دیسی رم تھے یا انگریز؟ اہلِ خانہ اپنے گھر کو بچانا چاہتے تھے تو مجرم ٹھہرے لیکن ڈاکو اسی گھر صرف متواتر لُوٹنا چاہتے تھے بلکہ اُس پر قبضہ جمائے رکھنے پر مُصر تھے اور ایسا کرنا اُن کا ظر میں نہ جرم تھا نہ معیوب۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ انگریزوں کے جن جرنلوں اور دیگر

۱؎ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۳۳۹

فوجی افسروں نے زیادہ سے زیادہ درندگی کا ثبوت دیا، سفاکی، وحشت اور بربریت کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ ۱۸۵۷ء میں متحدہ ہندوستان کے اندر توڑ دکھائے اُنھیں ہیرو قرار دیا گیا۔ اُنھیں اور اُن کی اولاد کو پنشنوں اور جاگیروں سے نوازا گیا۔ انگلستان کی تاریخ میں اُن ننگِ انسانیت افراد کو نمایاں کر کے دکھایا گیا۔ گویا پوری برطانوی قوم کی ذہنیت ڈاکوؤں جیسی اور ڈاکو نوازی کی رہ گئی تھی۔ انگریزوں کی اسی ذہنیت اور ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا، اُس کے پیشِ نظر جناب غلام رسول مہر کیسا پیارا سوال کرتے اور باشندگانِ پاک کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں:

"اب سوچیے کہ جن کے دل میں ۱۸۵۷ء کے واقعات مجروحہ کی یاد تازہ ہوگی، کیا اُس میں انگریزوں کے لیے کسی بھی خوشگوارخیال کی گنجائش باقی رہے گی؟ شعلوں کو کون پھول سمجھتا ہے اور خارزار کو کون حریر و پرنیاں کا فرش قرار دیتا ہے؟ تاریخ قوموں کے اعمال کا مرقع ہے۔ انگریز جب اُس میں اپنا نامۂ اعمال دیکھیں گے اور اُس کے اوراق پر ۱۸۵۷ء کے خونِ ناحق کا دھارا متلاطم نظر آئے گا، تو اُن کی حالت کیا ہوگی؟ وہ نیل، نکلسن، ہوڈسن یا اُن جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اس دنیا کا ہر ذرہ ذرہ پکار کر کہے گا کہ انگریزوں نے وہ حرکتیں کیں جو انسانیت ہی نہیں بلکہ جنگلی درندوں کے لیے بھی باعثِ ننگ تھیں۔"[1]

مولانا غلام رسول مہر کے مذکورہ بالا سوال اور وضاحت سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں اور خاموش رہنے والوں کے ساتھ، بغیر کسی امتیاز کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے اُوپر مظالم کے پہاڑ ڈھائے، اندھا دُھند گولیاں چلائیں، دیہات جلائے، گولا لاٹھی لگا کر درختوں سے اُلٹے لٹکائے، سوّر اور گائے کا خون فرشِ زمین سے چاٹ کر صاف کروایا، توپ سے اُڑایا، اسباب چھینا، گھر بار سے

---

[1] غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۴

، جائدادیں ضبط کیں، کالے پانی کی سزائیں دیں! ایسے بے شمار طرح طرح کے مظالم ایجاد کیے جن کے
منظر کوئی انصاف پسند انھیں پھول نہیں بلکہ شعلہ سمجھنے پر مجبور ہوگا۔ اُن کی ظاہری عنایات
مریدوں پر نیاں کا فرش نہیں بلکہ خار زار ہی قرار دے گا۔ خود بعض انگریز مورخوں اور
انصاف پسند افسروں نے اپنی قوم کے اِن مظالم کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا اور
سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

اِس باب کے گزشتہ اوراق میں ہم نے متحدہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط،
مار اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے بربریت کے جو المناک مناظر پیش کیے۔
ان کیا جس کی غرض یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انگریزوں کے مظالم پیش کیے جائیں اور
ان بعض صاحبانِ جُبّہ و دستار اور علمبردار کے امین کہلانے والوں کے اس
راہ کتاب کے بابِ چہارم میں ایسے بیانات و اعلانات بھی قارئین کرام کے سامنے
جائیں، جن میں اُنھوں نے انگریز کو خار نہیں بلکہ پھول بتایا ہے۔ ظالم نہیں بلکہ عادل
یا ہے، اُنھیں اپنا پشت پناہ اور حامی و ناصر سمجھا یا ہے۔ ایسے بیانات اور حوالے
رکے ہم قارئین کرام سے انصاف چاہیں گے اور فیصلے کے طلبگار ہوں گے۔
غلام رسول مہر کا سوال اپنی جگہ پر بجا ہے لیکن یہ یقین نہیں آتا کہ ایسے وسیع النظر
سے وہ تاریخی چہرے پنہاں ہوں جنھوں نے انگریزوں کو خار نہیں بلکہ پھول بتایا ہے
انھیں خبر ہوگی اور اُن جیسے کتنے ہی اہلِ علم اِس حقیقت سے آگاہ ہیں، لیکن
سمجھنے سے ہم آج تک قاصر رہے کہ ایسے حضرات خار کو پھول بتانے والوں کے
کیوں بنے رہتے ہیں!

علمائے کرام اور جنگِ آزادی: آخر میں چند اُن علمائے کرام کا ذکرِ خیر کرنا بھی مناسب
ہو سکتا ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ مولانا احمد اللہ
نوں نے بریلی اور شاہجہاں پور وغیرہ کے معرکوں میں انگریزوں کے نامی گرامی
ناکو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا اور حریت پسندوں میں نئی رُوح پھونک کر اُس
سے انگریزوں کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ اِن کے جنگی کارناموں کی ایک جھلک

گزشتہ صفحات میں دکھائی جا چکی ہے۔ موصوف ۱۸۴۰ء سے برطانوی اقتدار کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر سرگرم عمل تھے۔ چنانچہ موصوف کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی یوں رقمطراز ہیں:

"۱۸۴۰ء میں مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ بن محمد علی، نواب چیناپٹن، جے پور میں میر قربان علی، گوالیار میں محراب شاہ قلندر سے بیعتِ جہاد کرتے ہوئے دلی گئے۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے مشورہ سے آگرہ آئے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر کے یہاں مقیم ہوئے۔ مجلسِ علماء کی تشکیل کی اور بیعتِ جہاد کا سلسلہ شروع کر دیا۔"[1]

مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ) جو ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد کے محرک اور جاری کرنے والے تھے، اُن کے بارے میں زمانۂ حال کے قابلِ فخر مؤرخ پروفیسر محمد ایوب قادری یُوں رقمطراز ہیں:

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، جزیرۂ انڈمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔"[2]

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اس سلسلے میں فتویٰ جہاد اور علامہ کی حریت پسند سرگرمیوں کا ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے لفظوں میں یُوں تذکرہ کیا ہے:

کمپنی کے عمّال کی بدعہدی، خودغرضی اور بدنیتی نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔ عوام اعراض کرنے لگے تھے تو خواص کا کیا عالم ہو گا۔ دیسی

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیرآبادی اور پہلی جنگِ آزادی، مطبوعہ کراچی، ص

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر: ترجمہ اُردو تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۴

بدلیسی کی کشمکش کی یہ زبردست مگر بالکل فطری تھی اور آخر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو
دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ نکلا۔ عوام کی اِس بے چینی کا اثر مولانا
(فضل حق خیرآبادی) پر بھی پڑے بغیر نہ رہا۔ وہ دہلی آتے ہی قلعہ میں گئے۔
بہادر شاہ سے اگلی راہ و رسم تھی۔ بادشاہ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔
انھوں نے ایک اشرفی نذر کی، موجودہ صورت حال کے متعلق بادشاہ سے
گفتگو کی، بادشاہ کی اُمنگیں ختم تھیں، دُوسرے شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ
اور تخت شاہی کی تمنائیں باہمی رقابت کا میدان گرم کیے ہوئے تھیں۔ مولانا
نے دیکھا کہ عمائدِ شہر میں بھی دو گروہ تھے، ایک بادشاہ کا ہمنوا، دُوسرا
حکومتِ کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں کا جائزہ لیا۔ حریت پسندوں کی دو جماعتیں
ایسی بھی تھیں جو ایک مقصد کو لیے ہوئے جان پر کھیل رہی تھیں۔ ایک جماعت
مجاہدین کی تھی، دوسری جماعت روہیلوں کی۔ یہ لوگ جنرل بخت خاں سردار
روہیلہ کی زیر کمان تھا۔ مولانا کی خبر سُن کر جنرل بخت خاں ملنے آئے۔
چنانچہ مولانا نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد
میں علماء کے سامنے تقریر کی اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں جز بز
ہوئے۔ مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد بدایونی،
ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبرآبادی، سید مبارک شاہ رامپوری وغیرہ نے دستخط
کر دیے۔ مگر مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آزردہ) بالخیر کو بالجبر لکھ گئے۔
اِس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش بڑھ گئی۔ دہلی میں نوّے ہزار
سپاہ جمع ہو گئی تھی۔ [1]

علامہ فضل حق خیرآبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) معقولات کے امام و مجتہد، فنِ شعر
میں لاثانی، متبحر عالم دین اور ماہر قانون تھے کیونکہ سر رشتہ دار سے صدر الصدوری تک کے عہدہ

۱۔ انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیرآبادی اور جنگ آزادی، ص ۳۵

امتیازی شان سے ادا کر چکے تھے۔ جب علامہ گرفتار ہو گئے اور مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو لطف کی بات یہ ہے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں بلکہ آپ سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے۔ برطانوی قانون کے شکنجے کو آپ تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر عدالت کو رہائی پر مجبور کر دیتے تھے۔ سرکاری وکیل کو ہر بار لاجواب کر کے آپ اس طرح کھلا رہے تھے جیسے بلی کسی چوہے کو منہ میں دبا کر بعض اوقات ڈھیلا کر دیتی ہے۔ مثلاً:

"سیرۃ العلماء میں ہے کہ ۱۸۵۷ء میں سلطنتِ مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش میں مولانا موصوف (فضل حق خیر آبادی) ماخوذ ہو کر سیتا پور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسیسر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وکیل سرکار کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کرتے اور خود ہی مثل تارِ عنکبوت عقلی و قانونی بحث سے توڑ دیتے تھے۔ جج یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا، وہ مولانا کی عظمت اور تبحر سے واقف بھی تھا، وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں، اسے بیحد ہمدردی تھی۔ اس وقت تک صورت بھی یہی تھی کہ مولانا پر جرم ثابت نہیں ہو رہا تھا اور امید تھی کہ بری ہو جائیں گے وکیل لاجواب تھے۔"[1]

ماہرِ قانون اور امامِ عقلیات ہونے کی بنا پر سرکاری وکیل کو لاجواب تو کر دیا، قانون کی رو سے عدالت جرم ثابت نہیں کر پائی لیکن حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ فتویٰ جہاد آپ ہی کا جاری کردہ تھا۔ بہادر شاہ ظفر، جنرل بخت خاں، مولانا احمد اللہ شہید اور حضرت محل کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں اہم مشورے، جنگی تیاریوں، مقابلے کی صورتوں اور اپنی خامیوں کو پورا کرنے کے بارے میں تجویزیں پیش کرتے رہے۔ علماء کا جو بورڈ تشکیل دیا گیا تھا اس میں آپ بھی شامل تھے۔ لکھنؤ سے دہلی آتے ہوئے راستے میں شہروں اور دیہات میں انگریزوں کے خلاف

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی: مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، ص ۲۰

کرنے کے لیے کمربستہ ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے آئے تھے۔ اگر قانون کے ذریعے عدالت
میں وہ کسی امر کو بھی گواہوں کے ذریعے ثابت نہ کر سکی تو نہ سہی لیکن اس سے حقیقت تو
نہیں بدل گئی تھی۔ اس حق پسندی اور صداقت کی داد کہاں تک دی جائے کہ قانون کو لاجواب
کر دینے کے باوجود، بری ہونے کے نزدیک پہنچ کر خود اعلان کرتے ہیں کہ فتویٰ میرا تھا، علما
نے میرے کہنے سے اس کی تصدیق و تائید کی تھی۔ اس اقرار کا نتیجہ صاف ظاہر تھا لیکن علامہ
نے ثابت کر دکھایا کہ میں نے قانون کے شکنجے کو توڑ دیا ہے لیکن جس کام کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر
کیا ہے، آج اس کا اظہار نہ کر کے، خدا کے اس انعام اور اپنے شرعی فریضے کی ادائگی سے
انکار کر کے عظیم اخروی سعادت سے خود کو محروم کیوں قرار دوں؟ علامہ کے اس تاریخی فیصلے
نے انھیں اہلِ عزیمت کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب موصوف
لکھتے ہیں:

"دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رد کر دیے۔ پھر
پلٹا کھایا اور کہا: جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں توثیق و
تصدیق کرتا ہوں، میرا ہی لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورہ سے علما نے دستخط
کیے۔ پہلے اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے
میری صورت سے مرعوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور میں جانا ہے
غلط بات مذہب کے مسئلہ میں نہیں بول سکتا۔ جج اس بیان سے حیران ہو گیا
گھڑی گھڑی مولانا کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ رنگ دوسرا ہو چکا تھا
جج کو رعایت کی (اقبالِ جرم کی قانونی صورت میں) کوئی گنجائش ہی نہیں
رہی تھی۔ بعد رنج و غم حبسِ دوام کا حکم سنایا۔ مولانا نے بڑی مسرت سے
حکم کو منظور کیا ..... آخر شش مولانا انڈمان روانہ ہو گئے۔" [1]

مولانا کی اس عزیمت کی قدر اہلِ کمال ہی کر سکتے ہیں۔ قانونی طور پر رہائی یقینی ہو چکی تھی

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی، مولوی فضل حق خیرآبادی اور پہلی جنگِ آزادی، ص ۲۹

جس جرأت واستقلال سے فتویٰ جاری کیا، اسی عزم و استقامت سے تمام قانونی شکنجوں کو توڑ کر، وکیلِ سرکار کو لاجواب کر کے خود اقرار کرتے ہیں۔ اس اقرار کے نتائج سامنے ہیں۔ قانونی سزا معلوم ہے مگر دنیا کی زندگی میں ہر تکلیف اٹھانے اور ہر سخت سے سخت سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اگرچہ دنیاوی راحتیں جو اب بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ قانونی رہائی کے پسِ پردہ علامہ کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں، آپ کی قدم بوسی کی منتظر تھیں لیکن آفرین ہے اس جرأتِ رندانہ پر کہ ایسی رہائی اور دنیاوی تمام راحتوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا کر اپنے عظیم کارنامے فتویٰ جہاد کا، جو حریت پسندوں کے لیے صورِ اسرافیل اور فرنگی اقتدار پر صاعقہ تھا، خود اقرار کر لیتے ہیں اور ہر دنیاوی تلخی کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہنے کے لیے از خود تیار ہو جاتے ہیں۔ قافلہ سالارِ عشق سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صبر و استقامت کی اس آخری دور میں جھلک دکھا دینے والے اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہٗ کی جرأتِ رندانہ کی یاد پھر تازہ کر دکھانے والے اس خیر آبادی مردِ قلندر کو باری تعالیٰ اپنی خاص نعمتوں سے نوازے، اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے۔ آمین یا الٰہ العالمین ؎

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

جب علامہ کو بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی، جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تو اس شاہانہ زندگی گزارنے والے، ناز و نعم میں پلنے اور پروان چڑھنے والے، کہ دولت جس کی لونڈی تھی اور پالکی کی سواری جیسے دربار اور سرکاروں میں راہ و رسم تھی، اس علامہ سے انڈمان میں کیا کام لیا جاتا تھا؟ یہ مفتی صاحب مذکور سے پوچھیے:

"مولانا کو انڈمان میں خدمت بہت ذلیل سپرد کی گئی تھی، بارکوں کی صفائی کیا کرتے تھے۔" [1]

---

[1] انتظام اللہ شہابی، مفتی، مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی، ص ۴۱

مولانا فیض احمد بدایونی بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مردانہ وار حصّہ لینے والے علما سے سے ایک ہیں۔ موصوف کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں

"مولانا فیض احمد، مولوی عبدالقادر (بدایونی بن مولانا فضل رسول) کے پھوپھی زاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ مولانا فیض احمد نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصّہ لیا۔" [1]

مولانا فیض احمد بدایونی کے متعلق دُوسری جگہ موصوف نے یُوں تفصیلی وضاحت کی ہے

"مولانا فیض احمد بدایونی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہدین میں ہیں۔ مولوی رحمت اللہ کیرانوی اور پادری فنڈر کے درمیان جو مناظرہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں ہوا، اُس میں بھی مولانا فیض احمد بدایونی کی سرگرمیوں کو دخل تھا۔ مولانا اُس زمانہ میں وہاں بورڈ آف ریونیو میں سررشتہ دار تھے ۔۔۔ جب جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تو ڈاکٹر وزیر خاں کے ہمراہ سیدھے دہلی پہنچے اور بادشاہِ دہلی کی طرف سے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز رہے۔ سقوطِ دہلی کے بعد روہیل کھنڈ کا رُخ کیا۔ بدایوں (نگلاں) اور بریلی وغیرہ میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ اس کے بعد اودھ کی طرف نکل گئے اور پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے اور کیا حشر ہوا۔" [2]

مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی جو اہلسنت وجماعت کے جیّد عالم دین اور عاشقِ رسول تھے، انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء میں پوری سرگرمی در جوش وخروش سے حصّہ لیا تھا۔ اِسی جرم کی پاداش میں آپ گرفتار ہوئے، سزائے موت کا حکم ملا اور پھانسی دی گئی۔ پروفیسر موصوف نے آپ کے کارناموں کا یُوں اعتراف کیا ہے:

"مولانا کفایت علی نام، کافی تخلص تھا، مرادآباد کے رہنے والے تھے۔

---

[1] محمد ایوب قادری : تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۸۴

[2] ایضاً، ص ۳۸۶

تحصیل علم بدایوں، رامپور اور لکھنؤ میں کی۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ مراد آباد کے صدر الشریعہ بنائے گئے۔ مراد آباد پر جب انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مئی ۱۸۵۸ء میں ان کو پھانسی دی گئی۔ قبر عقب جیل ہنوز موجود ہے۔ ہمیشہ نعت لکھتے تھے۔ شرحِ شمائل ترمذی کا نظم میں ترجمہ کیا۔ مولانا کفایت علی کافی کے ہاتھ کا تحریر کردہ شمائل ترمذی کا پہلا مسودہ خاکسار مترجم کے پاس محفوظ ہے۔"[۱]

مفتی صدر الدین خاں آزردہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) دہلی میں صدر الصدوری کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں فتاویٰ جہاد کی تصدیق و تائید کی اور آپ کی وجہ سے اس فتوے کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔ جب حریت پسند ناکام رہے اور فرنگی دوبارہ غالب آئے تو انھوں نے موصوف کے ساتھ جو سلوک کیا، ملاحظہ ہو:

"۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانہ میں فتویٰ جہاد کے اہتمام میں منصب اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ ان سے چھین لی گئی۔ چند مہینے نظر بند بھی رہے۔ تحقیقات کے بعد رہا ہوئے۔ جائداد غیر منقولہ واپس مل گئی اور جائداد منقولہ جو نیلام ہو چکی تھی نہ ملی۔"[۲]

مفتی صاحب موصوف کے بارے میں یہی پروفیسر محمد ایوب قادری آگے یوں وضاحت فرماتے ہیں:

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد پر دستخط کیے۔ اس کی وجہ سے گرفتاری، عزلِ منصب اور ضبطی جائداد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد رہائی ہوئی، بعض جائداد واگزاشت ہوئی ۔۔۔۔۔ تین لاکھ روپے کی مالیت کا کتب خانہ ۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گیا، اس کے حصول کے لیے لارڈ لارنس کے پاس

۱؎ محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۴۳، ۲۴۴

۲؎ ایضاً، ص ۲۴۷

لاہور پہنچے، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔[1]

مفتی عنایت احمد کاکوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۳ء) بھی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مردانہ وار لڑے، فتویٰ جہاد کی تشہیر کی اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف خوب ابھارتے رہے۔ کالے پانی کی سزا ملی اور جزیرہ انڈمان بھیجے گئے۔ مفتی صاحب کے بارے میں قادری صاحب نے ضمناً لکھا ہے:

"مفتی لطف اللہ ولد شیخ اسد اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ پندرہ برس کی عمر کے بعد مفتی عنایت احمد کاکوروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مفتی صاحب (مفتی عنایت احمد کاکوروی) اس زمانہ میں مفتی و منصف تھے۔ عہدۂ افتاء کے سبب تو مفتی عنایت احمد صاحب سلسلۂ درس و تدریس بھی جاری رکھتے تھے۔ جب مفتی عنایت احمد صاحب کا تبادلہ بحیثیت صدر امین علی گڑھ سے بریلی ہوا تو مولوی لطف اللہ صاحب بھی مفتی صاحب کے ہمراہ پہنچے، وہاں چند کتب درسیہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ بعد فراغ مفتی صاحب نے اپنے ہی اجلاس کا سررشتہ دار مقرر کر لیا۔ اسی زمانہ میں جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب مفتی عنایت احمد انڈمان سے واپس آئے تو مدرسہ فیضِ عام کانپور میں انھوں نے مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس دوم رکھ لیا، پھر مدرس اوّل ہو گئے۔"[2]

مفتی عنایت احمد کاکوروی علیہ الرحمہ، بریلی میں خان بہادر خاں کے مشیر اور جنرل بخت خاں کے ہمراہ رہے تھے۔ مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو جہاد کمیٹی بنائی تھی آپ بھی ان حضرات میں شامل تھے۔ بلبوہ و بلوائے شورش کی سزا ملی اور جزیرہ انڈمان بھیجے گئے تھے لیکن ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء میں وہاں سے رہا کر دیئے گئے اور واپس گھر آ پہنچے۔ جب آپ حج بیت اللہ

---

[1] ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند (اردو)، ص ۲۴۳

[2] ایضاً، ص ۳۵۱

اور زیارتِ روضۂ مطہرہ کی غرض سے جا رہے تھے تو جدہ کے قریب اُن کا جہاز کسی چٹان سے ٹکرایا اور نماز پڑھتے ہوئے ۱۰ شوال ۱۲۷۹ھ / ۱۰ اپریل ۱۸۶۳ء کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا رسول بخش کاکوروی شروع میں نواب واجد علی شاہ والیٔ اودھ کی فوج میں ملازم تھے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر آپ نے کاکوری اور اس کے نواح میں تقریریں کر کے انگریزوں کے خلاف ایک لشکرِ جہاد تیار کر لیا تھا۔ اودھ کے فوجیوں کا کافی حصہ آپ کے جھنڈے تلے آ کر جمع ہو گیا تھا۔ تیاریاں جب مکمل ہو گئیں اور حملہ کرنے کی تجویزیں کی جا رہی تھیں، تو انگریزوں نے اس عظیم مجاہد کو اُس کے ستّر ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا اور شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر ان جملہ مجاہدینِ جنگِ آزادی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت عمر کی اڑتالیس منزل طے کر چکے تھے۔ آپ خان بہادر خاں کے صرف مشیر بلکہ سرپرست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں کی ہدایات کے بموجب خان بہادر خاں کبھی مولانا رضا علی خاں کی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ موصوف کا وصال ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا نقی علی خاں (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) ابن مولانا رضا علی خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہما جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت آپ خان بہادر خاں کے دستِ راست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں اور مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو "جہاد کمیٹی" بنائی تھی اُس میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا رضا علی خاں بریلوی سرِ فہرست تھے۔ مولانا نقی علی خاں بریلوی کی ڈیوٹی مجاہدین کے لیے رسد کا انتظام کرنا تھا۔

مولانا وہاج الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے عدو مراد آباد میں امیر المجاہدین اور مولانا کفایت علی کافی رامپوری اِن کے دستِ راست تھے ان بزرگوں نے مراد آباد سے انگریزی تسلط کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مولانا وہاج الدین نے جنرل بخت خاں اور صوبیدار بریلی خان بہادر خاں سے مکمل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی معیت میں مراد آباد کے آخری معرکے میں شکست کھائی، روپوشی کی حالت میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

له وانا الیه راجعون ۔

ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین اجمیری ، مولانا ارشاد حسین رامپوری ، مولانا
یب الرسول ، مولانا رحمت اللہ کیرانوی ، مولانا امام بخش صہبائی ، مولانا تراب علی خواجہ ،
نا ریاض الدین ، مولانا غلام جیلانی ، مولانا کریم اللہ ، مولانا علام احمد شہید ، مفتی عبدالوہاب
یانشوی ، مولانا ڈاکٹر وزیر خان اکبرآبادی ، مفتی انعام اللہ خان ، مولانا سرفراز علی
جہان پوری ، مولانا لیاقت علی الہ آبادی ، مولانا اعتقاد علی بیگ ، مولانا نور الحسن ،
نا رضی الدین بدایونی اور دیگر سینکڑوں علمائے دین نے سرگرم حصہ لیا ۔ بعض میدان جنگ
مارے گئے تو بعض کو گولی کا نشانہ بنایا گیا ۔ کتنے ہی تھے جو پھانسی پر لٹکائے گئے اور کسی
ات کو بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی ۔

یہاں ایک حقیقت کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی
یف ۱۸۵۷ء کے صفحہ ۲۰۵ پر مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں کو وہابی بتا کر ان حضرات
دوں کو تڑپانے کی مذموم سعی کی ہے حالانکہ یہ مولانا شہید تو سید قربان علی شاہ جے پوری
الرحمہ کے مرید تھے اور خرقۂ خلافت آپ نے پیر محراب شاہ قلندر گوالیاری رحمۃ اللہ علیہ سے
تھا ۔ جب علامہ فضل حق خیرآبادی دہلی پہنچے تو جنرل بخت خاں اُن سے خود ملنے آئے تھے ۔
بخت خاں کے قلب و دماغ میں اگر وہابیت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو علامہ خیرآبادی
دشمنِ خارجیت و وہابیت سے مل کب گوارہ کیا جاتا بلکہ دہلی میں وہابی علماء بھی موجود تھے
کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بخت خاں اُن کے پاس گئے ہوں یا وہ حضرات خود آئے ہوں
نی حمایت کا یقین دلایا ہو ۔ ان سب باتوں پر طرّہ یہ کہ مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں
علماء کی " جہاد کمیٹی " بنائی تھی اس کے سرخیل علامہ فضل حق خیرآبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/
ء) ، مفتی عنایت احمد کاکوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء) ، مولانا رضا علی خاں بریلوی
فی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء) اور مولانا فیض احمد بدایونی (المتوفی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء) تھے ۔
حضرات وہابی ہوتے تو جہاد کمیٹی کے سربراہ علمائے اہلسنّت کیوں بنائے جاتے ، کیا
علماء پر مشتمل " جہاد کمیٹی " نہ بنائی جاتی ؟ معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہابیوں میں شاید

جھوٹ بولنے کو عیب شمار نہیں کیا جاتا ، یا ہو سکتا ہے کہ یہ امکانِ کذبِ باری تعالیٰ کے عقیدے کا اثر ہو کہ جب وہ اپنے معبود کو جھوٹا مانتے ہیں تو خود جھوٹ سے کیوں پرہیز کریں؟ ہو سکتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر جیسے بھاری بھر کم مورخ نے اِسی وجہ سے یہاں جتنا جھوٹ بولنا کوئی عیب یا تاریخ پر ظلم نہ شمار کیا ہو۔

ایک تاریخی مغالطے کا حل

اِسی سلسلے میں ایک اور تاریخی مغالطے کا ازالہ بھی از حد ضروری نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض علماء کے بارے میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہی بتایا جاتا رہا ، انھوں نے خود یہی کہا کہ برٹش گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انھوں نے مطلق حریت پسندوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اگر کسی سے ہو سکا تو خفیہ یا اعلانیہ انگریزوں کی نصرت میں کی ورنہ خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں نوّے سال بعد جب انگریز یہاں سے دوڑ گئے تو بعض حضرات نے اپنے قلم کا زور اِس امر پر صرف کرنا شروع کیا کہ ہمارے وہ علماء تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو بلکہ انگریزوں کے اصل بھگانے والے اور ملک کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے والے تھے۔ اِس سلسلے میں ہم اُن علماء کے بارے میں دونوں قسم کے بیانات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام اِس تصویر کے دونوں رُخ دیکھ کر آسانی سے فیصلہ کر سکیں:

تصویر کا ایک رُخ

۱۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں گنگوہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام شیخ ہدایت احمد ولد پیر بخش[1] ہے . . . . حضرت حاجی امداد اللہ کے مرید

---

[1] پیر بخش نام رکھنا تو تقویۃ الایمان، فتاویٰ رشیدیہ، اور بہشتی زیور حصہ اول وغیرہ کتابوں میں شرک لکھا ہے۔ یہ فقہی مسئلہ تو علمائے دیوبند ہی حل فرما سکتے ہیں کہ والد اجداد کے مشرک ہونے سے اولاد کے نسب میں تو کوئی فرق نہ آئے گا؟

ہوئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں معرکہ شاملی میں شریک ہوئے۔ جس کے نتیجے میں چھ ماہ قید و بند کے شدید مصائب جھیلے۔ دارالعلوم اسلامیہ دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں رہے۔ ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔[۱]

۳۔ مظاہرالعلوم سہارنپور کے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث یعنی مولانا محمد مظہر نانوتوی المتوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں تحریر فرماتے ہیں:

۲۔ "مولوی محمد مظہر نانوتوی بن حافظ لطف علی ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن اپنے والد سے کیا۔ پھر مولانا مملوک علی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی (یعنی دہلی کالج میں)۔ علم حدیث شاہ عبدالغنی سے حاصل کیا۔ تحصیل علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔ جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیا۔ جہاد شاملی میں شریک ہوئے۔ پیر میں گولی لگی۔ کچھ دنوں بریلی رہے۔ معافی عام پر رہا ہوئے۔"[۲]

مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے اس واقعہ کو تفصیل سے مولانا حسین احمد فیض آبادی سابق صدر دارالعلوم دیوبند کی تصریح کے مطابق "نقش حیات" جلد ثانی کے صفحہ ۳۹ تا ۴۴ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

۳۔ "جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش و خروش میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ وہ انگریزوں کے افعال ماضیہ اور احوال حاضرہ پر بخوبی مطلع تھے اس تمام جماعت میں حضرت شاہ ضامن صاحب قدس سرہ العزیز زیادہ

---

[۱] محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۰۰

[۲] ایضاً، ص ۵۰۳

پیش پیش تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہمنوا ضرور تھے مگر پیش پیش اور اس قدر جوش میں نہ تھے ..... بدقسمتی سے مولانا شیخ محمد تھانوی کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔

اِس اختلاف اور قنوتی کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو اُن کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلا لیا ..... حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ، میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ، علم و تصوف اور تشرع کا بہت زیادہ شہرہ تھا .....
اُس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی، عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جن کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے مگر یہ ہتھیار پرانی وضع کے تھے۔ بندوقیں توڑے دار تھیں، کارتوسی رائفلیں نہ تھیں، یہ صرف انگریزی فوجوں کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے گئے ..... جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی صاحب نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لاکر ڈال دیا۔ اِس سے ان حضرات کی ..... ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔

شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اُس پر حملہ

کیا جائے۔ چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو قت پولیس اور فوج کی وہاں تھی مغلوب ہو گئی۔

حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔" ؎

حکیم محمد ایوب قادری صاحب نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے کا اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور اس کے قرب و جوار کے مسلمانوں نے حضرت حاجی صاحب کو امیرِ جہاد مقرر کر کے شاملی ضلع مظفر نگر میں انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا، جس میں حافظ محمد ضامن صاحب شہید ہوئے۔ اس معرکۂ جہاد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی اور قاضی عنایت علی تھانوی وغیرہ حضرات شریک تھے۔ جنگِ آزادی کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔ حاجی امداد اللہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور اپنی سرگرمیوں کا مرکز مکہ معظمہ کو بنا لیا۔ مکہ معظمہ ہی میں ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں انتقال ہوا۔" ؎

ناظرینِ کرام! مذکورۃ الصدر علماء کے بارے میں تصویر کا ایک رنگ پیش کر رہا ہے کہ ان حضرات نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا۔ بہر حال اس دعوے کو سامنے رکھیے اور اسی تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے۔

اسی تصویر کا دوسرا رُخ

مولوی محمد احسن نانوتوی جو ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء سے بنارس کالج میں فارسی کے مدرس اوّل رہے اور ۱۲۶۰ھ/...

؎ عزیز الرحمٰن منصور پوری، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۶ تا ۲۸۔

؎ محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۱۲۳

۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی کالج آ گئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت بھی برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ رہے جیسا کہ پروفیسر محمد ایوب قادری تصریح فرماتے ہیں

۵۔ "۲۲ مئی (۱۸۵۷ء) کو نمازِ جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ قانون ہے۔ نواب بہادر خاں، کمشنر بریلی مسٹر الیگزینڈر کے بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد تھا۔ اس سلسلے میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے: "پچھلے صدی کے ...... محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خاں بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پوری پوری تائید کی اور (بریلی) کالج سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے مسجد میں تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔" [1]

موصوف کی اس تقریر نے بریلی کے مسلمانوں میں آگ لگا کر رکھ دی۔ مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف غیظ و غضب کا ایک طوفان اُمڈ آیا کیونکہ یہ مسلمانوں کے جذبۂ حریت کے لیے کھلا ہوا چیلنج، اُن کی دینی غیرت کو للکارنا اور تعلیماتِ الٰہیہ کو بازیچۂ اطفال بنانا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب لکھتے ہیں:

۶۔ "اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کوتوالِ شہر شیخ بدرالدین کی فہمائش پر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس تقریر کا ردِ عمل یہ بھی ہوا کہ ۲۵ مئی ۱۸۵۷ء کو بروز عید نو محلہ کی مسجد میں مولوی رحیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی اور اس موقع پر بخت خاں بھی موجود تھے۔ مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا مگر کوتوال

---

[1] محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۶ء، ص ۵۰

نے اپنی حکمت عملی سے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ لہ
کی جنگ آزادی کے وقت بعض علماء و عمائد دیوبند کا ایک ہنگامی اجلاس ہوتا ہے
آزادی کے بارے میں غور کیا گیا۔ گفتگو کیا ہوئی، ملاحظہ فرمائیے:

"تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہوئے (جنھوں نے ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو بریلی میں تقریر کرتے ہوئے برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو خلاف شرع بتایا تھا) مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا: جب قاضی عنایت علی جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس (جنگ آزادی) میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کار فرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور بے سروسامانی کو عدم جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔" لہ

نا اشرف علی تھانوی جو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے چھ سال بعد ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں ہوئے تھے انھوں نے بھی جب اس جنگ آزادی کے جملہ حالات و کوائف پر نظر کی تو یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ یہ محض ایک لڑائی تھی، اسے جہاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔
یوب قادری صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے بظاہر تو اس (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء) کو جہاد کا درجہ

لہ ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۱
لہ ایضاً، ص ۵۲

نہیں دیا جا سکتا۔ [1]

بعض علمائے دیوبند نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو امیر المومنین مقرر کر کے اپنے علاقے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ حکومت اس لیے قائم کی گئی تھی کہ انگریز ہندوستان کے مختلف و متعدد مقامات سے جنازہ نکل گیا تھا۔ اپنے موافقین کو حکومت نے مطلع کر دیا کہ اب تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑے گی کیونکہ حکومت تو آپ ہی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ چنانچہ تھانہ بھون کے گرد و نواح میں علمائے دیوبند نے حریت پسندوں کی یلغار سے خود کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ اس حقیقت کو مشہور دیوبندی عالم اور مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کے سوانح نگار مولوی عاشق الٰہی میرٹھی نے بیان کر کے یوں حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہوا ہے:

۹۔ "اس بدامنی کی حالت میں جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔ عام باشندگانِ قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا مربی و منتظم بادشاہ (برٹش گورنمنٹ) سر سے اٹھ گیا اور شرعی وطبعی ضروریات و مخصمات میں بھی کوئی خبر گیر نہ رہا، جس کی رائے پر عمل کریں۔ پس یہ لوگ اعلیٰحضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور بذریعۂ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لیے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں، اس لیے دنیاوی تنظیم حکومت کا بھی بار اپنے سر پر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰحضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک

---

[1] محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۲ حاشیہ

قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرماتے۔ اسی تقشہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی
راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔" [1]

انگریزی حکومت اٹھ جانے اور برٹش گورنمنٹ کے اعلان پر عمل کرنے کی غرض سے
علمائے دیوبند نے جو بیعت گورنمنٹ قائم کر لی تھی اور حریت پسندوں کی یلغار سے خائف
اور منتظر ہوتے تھے کیونکہ حریت پسند ان اشخاص کو عموماً مجبور کرتے یا لوٹ لیا کرتے تھے جو
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر انگریزوں کی حمایت کرتے یا تحریکِ آزادی میں حریت پسندوں
یا خود بھاگتے تھے۔ علمائے دیوبند کا ایک مرتبہ حریت پسندوں سے مقابلہ بھی ہو گیا تھا،
جس کو بعد والوں نے تو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے لیکن مولوی عاشق الٰہی میرٹھی یوں
صراحت کرتے ہیں:

۱۔ "ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی)
اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولانا محمد قاسم نانوتوی) اور طبیب جانی
اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے
مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے
بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اسی لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ
گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ
جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں
چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے
گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن
صاحب زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔" [2]

انگریزوں نے جب دوبارہ غلبہ پا لیا تو مخبروں نے مولانا رشید احمد گنگوہی پر برٹش گورنمنٹ سے
باغی ہونے اور دیوبندی اصطلاح کے مفسدوں یعنی حریت پسندوں کی معاونت کرنے کی
تہمت لگا دی، جس کا ان کے سوانح نگار نے یوں شکوہ کیا ہے:

---

۱ عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۴

۲ ایضاً، ص ۷۵

۱۱۔ "شروع ۱۲۷۶ ہجری نبوی / ۱۸۵۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔"[1]

موصوف نے آگے اس الزام تراشی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی فرمائی ہے:

۱۲۔ "جب بغاوت وفساد کا قصہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشے سے سرکاری خیرخواہ اپنے کو ظاہر کریں انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات (علمائے دیوبند) پر بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے۔"[2]

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) پر ۱۸۵۷ء میں حکومت کے باغیوں کا ساتھ دینے یا خود بغاوت کرنے کا جس شخص نے پاک و ہند میں سے الزام لگایا، وہ واحد شخص قاضی محبوب علی خاں تھے۔ اگرچہ آج ان پر یہی الزام عائد کرنے والے کتنے ہی حضرات ہیں اور وہ مولانا گنگوہی پر الزام تراشی کر کے ان کے متبع ہونے کا دم بھرتے اور اس کے باوجود اپنا شمار موصوف کے عقیدت مندوں میں کرتے ہیں، حالانکہ گنگوہی صاحب کے سوانح نگار نے لکھا ہے:

۱۳۔ "حاکم کے انتظام کا اٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے ابھرنے لگی جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا کہ جدھر دیکھو مارپیٹ اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ۔ اسی بلاخیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد واقع ہوا جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مخبری سے حضرت مولانا (رشید احمد

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۳

[2] ایضاً: ص ۷۶

گنگوہی) پر مقدمہ قائم ہوا

۔ مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر
ہ مقدمہ شروع ہوا تو عدالتی کارروائی کس مزے کی ہوئی یہ موصوف کے زبردست تبع و
معتقد مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری کی زبانی سنیئے :

۱۔ "حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ، حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی)
اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے ۔
آپ (گنگوہی صاحب) اپنی وادھیال رامپور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی
خبر رسانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے ۔
یہ زمانہ ۱۲۷۳ھ یا ۱۸۵۷ء کا تھا ۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارنپور جیل کی
کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی ، مقدمہ
چلتا رہا ، حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں ؟ آپ نے
تسبیح دکھلا کر فرمایا : "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے ۔" سہارنپور جیل سے آپ کو
مظفر نگر جیل منتقل کیا گیا ۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا ، رہا کر دیا گیا ۔" [۲]

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں کا
ساتھ دیا اور اپنے گروہ کی زبانی مفسدوں میں شریک رہے تھے یا حکومت کے خیر خواہ ہے ؟ اس
سوال کے جواب میں خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار ، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے یوں
جواب دیا ہے :

۔ "جیسا کہ آپ حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) اپنی مہربان سرکار کے دلی
خیر خواہ تھے تا زیست خیر خواہ ہی ثابت رہے ۔" [۳]

۱۔ عاشق الٰہی میرٹھی ، مولانا : تذکرۃ الرشید ، جلد اول ، ص ۷۴ ۔
۲۔ عزیز الرحمٰن بجنوری ، مفتی : تذکرہ مشائخ دیوبند ، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء ، ص ۱۷۱
۳۔ عاشق الٰہی میرٹھی ، مولانا : تذکرۃ الرشید ، جلد اول ، ص ۷۹ ۔

مولانا رشید احمد گنگوہی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا یا سکوت کیا؟ آپ سامراجی گورنمنٹ کے وفادار رہے یا مالکِ وقت کے؟ اِس کا جواب خود گنگوہی صاحب کی زبانی ملاحظہ ہو:

۱۶۔ "میں (گنگوہی صاحب) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار رہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اُسے اختیار ہے جو چاہے کرے" [۱]

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

قارئین کرام! یہ صدر رہا سولہ بیانات و عبارات علمائے دیوبند کی تصانیف سے ہی پیشِ خدمت ہیں۔ اختصار کے پیشِ نظر اِن پر اکتفا کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ فیصلہ کرنا تو قارئین حضرات کا کام ہے لیکن بغرضِ سہولت ہم مذکورہ عبارتوں کا مفاد اور جہاں متضاد باتیں ہیں اُن کی مطابقت پیش کرتے ہیں۔ وباللہ التوفیق:

۱۔ جب گنگوہی صاحب خود اعلان فرما رہے ہیں کہ میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار ہوں، ۱۸۵۷ء کی لڑائی کے وقت بھی وفادار رہا تھا اور انگریزوں کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا تھا، اِس کے باوجود بھی جو یہ کہتا ہے کہ اُنھوں نے انگریز سے بغاوت یا اُن سے لڑائی کی تھی وہ موصوف پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ آپ کی اِس ذاتی تصریح کے بعد جیسا کہ آخری عبارت سے معلوم ہو رہا ہے، کسی کا دعویٰ کہ گنگوہی صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا سراسر بے معنی اور خلافِ واقعہ ہو کر رہ جاتا ہے یا نہیں؟

۲۔ گنگوہی صاحب کے اِس ذاتی بیان سے پہلی چاروں عبارتیں غلط اور اُن کے دعوے بے بنیاد ثابت ہو کر رہ گئے۔ گنگوہی صاحب کے انکار کے سامنے کسی دوسرے کا بیان کہاں قابلِ قبول ہے؟

۳۔ تذکرۃ الرشید کتاب، جو مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانح حیات ہے وہ موصوف

---

[۱] عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۸۰

کی زندگی میں ہی لکھی گئی، اُن کے خاص معتمد و معتقد نے لکھی، جو دیوبندی جماعت کے ایک
جید عالم بھی تھے اور یہ کتاب پہلی مرتبہ میرٹھ سے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں چھپی۔ کسی دیوبندی
عالم نے اس کے مندرجات پر تنقید نہیں کی بلکہ بسروچشم تسلیم کرتے آئے۔ دریں حالات
۱۹۶۱ء میں چھپنے والے "تذکرہ علمائے ہند اردو" میں اگر تذکرۃ الرشید کی طباعت کے
چھپن سال بعد اپنے اکابر کی حقیقت کو بدل کر پیش کیا جائے، اس طرح کہ رات کو
دن اور دن کو رات کہنے اور کہلوانے کی مہم شروع کر دی جائے، اس سے اگرچہ
حقیقت نفس الامری تو نہ بدل سکے گی لیکن جس جماعت کا اپنے روز اول سے طریقہ و
دستور یہی ہو کہ "جمنا گئے تو جمنا داس، گنگا گئے تو گنگا رام" اگر وہی جماعت انگریز
کے چلے جانے کے بعد اپنے اکابر کی تاریخ میں ادل بدل نہ کرے تو آخر دنیا والوں
کو منہ کیسے دکھائے؟

۴۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی جب ۱۹۰۵ء میں علی الاعلان لکھ رہے تھے کہ اکابر دیوبند
تمام عمر برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ رہے، کسی دیوبندی عالم نے اس خیال کی
تردید نہیں کی جیسا کہ عبارت نمبر۱ سے ظاہر ہے۔ دریں حالات اُن پر برٹش گورنمنٹ سے
لڑنے یا اُس کی بدخواہی کا دعویٰ کرنا سراسر الزام ہے یا نہیں؟

۵۔ جب علمائے دیوبند کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے
لڑنے والے باغی اور مفسد ہیں جیسا کہ عبارت نمبر۱ اور نمبر۱ سے ظاہر ہے تو معلوم
نہیں آجکل کے دیوبندی علماء کیوں اپنے اکابر کی توہین کے مرتکب ہونے لگے
اُن حضرات کو باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مُصر ہیں۔

۶۔ جب علمائے دیوبند کے نزدیک یہ جنگ آزادی شرعی نقطۂ نظر سے جہاد نہ تھا جیسا
عبارت نمبر۸، ۹ اور ۱۰ میں ہے، دیوبندیوں کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی
کا بھی یہی فیصلہ ہے جیسا کہ عبارت نمبر۹ سے ظاہر ہے، ان حالات و حقائق کے
پیش نظر عبارت نمبر۹ میں اس لڑائی کو معرکۂ جہاد کہنا کس وجہ سے ضروری سمجھا گیا

۷۔ اگر علمائے دیوبند نے باغ میں بیٹھے ہوئے انگریزی فوج سے لڑائی کی تھی، توپ خانہ

چھینا تھا اور تھانہ بھون قصبے سے بھی انگریزی فوج کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا، بلکہ بقول مولانا حسین احمد فیض آبادی انگریزی توپ خانے کو کھینچ کر حاجی صاحب کے پاس پہنچانے والے خود گنگوہی صاحب تھے جیسا کہ عبارت نمبر ۲ میں ہے تو عبارت نمبر ۱۴ ملاحظہ فرمائیے کہ یہاں گنگوہی صاحب عدالت کو تسبیح دکھا کر فرما رہے ہیں کہ حضور! ہمارے پاس تو صرف یہ ہتھیار ہے بلکہ آگے تصریح موجود ہے کہ گورنمنٹ کو کوئی ثبوت اس بات کا نہ مل سکا کہ گنگوہی صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حکومت کے خلاف کوئی حصہ لیا تھا اور اسی وجہ سے مجبور ہو کر رہا کرنے پڑے تھے لیکن پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد آج ان کے معتقدین کو کہاں سے ثبوت مل گیا کہ موصوف بھی انگریزوں سے معرکہ آرا ہوئے تھے؟

۸۔ اگر واقعی علمائے دیو بند اور عالیجناب گنگوہی صاحب نے انگریزی فوج سے باغ میں چھپ کر اور قصبہ تھانہ بھون میں لڑائی کی ہوتی، بلکہ توپ خانہ تک چھینا ہوتا تو انگریزی عدالت کے پاس سینکڑوں گواہ اس امر کی شہادت دیتے، توپ خانہ جیسی چیز چھن جانے پر بھی حکومت کو ثبوت نہ ملنا، ایک ایسی عبارت ہے جو کسی ذی ہوش کی سمجھ میں مشکل ہی سے آ سکتی ہے نیز گنگوہی صاحب پر ہی کیا منحصر اگر علمائے دیو بند نے باغ میں اور تھانہ بھون قصبے کے اندر بھی کچھ کیا ہوتا تو ۱۸۵۷ء میں ہی انگریزوں نے کتنے ہی علمائے دیو بند کو پھانسی دے دی ہوتی لیکن انگریزوں نے تو ۱۹۴۷ء تک ان سے یہ بھی نہ کہا کہ اے ہمارا توپ خانہ چھیننے والو! اے قصبہ تھانہ بھون سے ہماری فوج کو بھگا دینے والے روحانی پیشواؤ! ہمارا توپ خانہ واپس کرو اور پھانسی پر لٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آخر ایسا کیوں نہ کہا گیا؟

۹۔ ۱۸۵۹ء میں جب بعض حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تو ساری دیوبندی جمعیت میں سے اور پورے پاک و ہند کو انگریزی اقتدار سے بزعم خود نجات دینے اور دلانے والوں کے لشکر جرار کے ایک راس مجاہد بنام رشید احمد، ساکن قصبہ گنگوہ کو تسبیح سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ وہ بھی از خود نہیں بلکہ قاضی محبوب علی خاں کی مخبری پر گرفتار ہوئے

ورنہ اس تکلف کی بھی حکومت کو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اگر ان حضرات نے اس جنگ میں واقعی انگریزوں کے خلاف کوئی حصہ لیا ہوتا، جس طرح کہ پہلی چار رپورٹوں میں تاثر دیا گیا ہے تو ۱۸۵۷ء کے آخر سے ۱۸۵۹ء تک ان حضرات کو مہلت کیسے دی جاتی؛ کیا حکومت اپنے باغیوں کو اتنی مہلت دے سکتی تھی؟

۱۰۔ ان حضرات کو مجاہد بنانے کی عمارت جنگِ شاملی کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس لڑائی کا تذکرہ، پیش کردہ عبارت ۱، ۲، ۳، ۴ اور ۸ میں موجود ہے۔ پہلی چار عبارتوں کا نقطۂ نظر عبارت ۸ کے خلاف ہے۔ یہاں علمائے دیوبند کی مذکورہ بالا عبارتوں میں تطبیق دینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورتِ حال سامنے آجائے۔

۱۱۔ عبارت ۲، ۳ اور ۸ میں ایک بات مشترک ہے کہ حافظ محمد ضامن صاحب جنگِ شاملی میں مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ صرف یہی جانی نقصان ہوا۔ باقی سب خیریت رہی۔

۱۲۔ باقی رہا یہ تعین کہ جنگِ شاملی کہاں ہوئی تھی، عبارت ۸ جو تذکرۃ الرشید کی ہے میں تو یہی تصریح کی گئی ہے کہ شاملی کے نزدیک جب یہ حضرات باغ میں پہنچے اور اس وقت قصداً یا اتفاقیہ جو لڑائی ہو گئی یا لڑنا پڑ گیا، اسی کا نام جنگِ شاملی ہے اور اسی باغ والے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے لیکن مولانا فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحبان فرماتے ہیں کہ باغ کی معرکے کے بعد یہ روحانی گروہ قصبہ شاملی میں انگریزی فوج سے بھی جا کر لڑا تھا، وہ انگریزی فوج کو بھگا کر اپنا قبضہ بھی جمایا تھا اور اس آخری معرکے میں جو شاملی کے اندر ہوا، حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر اور اس کی عطا سے پھر اس کا محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ لیکن ہمیں تو توقف ہوتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کا بیان ہی درست ہے کیونکہ مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کے بیانات سے صریحاً بغاوت کی بو آرہی ہے۔ اگر غیر جانبداری سے ذرا بھی دماغ پہ زور دیا جائے تو معاملے کی تہہ تک

قطعاً مشکل نہیں رہتا۔ مثلاً :

۱۳۔ اگر باغ کی لڑائی کے علاوہ اِن حضرات نے شاملی قصبے میں جاکر انگریزی فوج کو جگایا ہوتا تو غلبہ پانے کے بعد انگریز فوراً اِن حضرات کو گولی کا نشانہ بنا دیتے یا پھانسی پر لٹکا دیتے کیونکہ اِس حالت میں گواہوں کی کمی نہ ثبوت کی۔ لیکن ان حضرات کے ساتھ حکومت نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اِس سے ثابت ہُوا کہ علمائے دیوبند شاملی قصبے میں جاکر ہرگز انگریزوں سے نہیں لڑے بلکہ صرف باغ والی لڑائی کا واقعہ ہی درپیش آیا تھا اور حافظ ضامن صاحب باغ والے معرکے میں شہید ہُوئے تھے۔

۱۴۔ عبارت ۲ میں فیض آبادی صاحب نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ شاملی قصبے کے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہُوئے تھے۔ لیکن تذکرۃ الرشید کی عبارت ۵ میں باغ والے معرکے کو شاملی کی لڑائی بتایا اور اِسی میں حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا لکھا ہے۔ لہٰذا معلوم یہی ہوتا ہے کہ لڑائی صرف باغ والی ہُوئی، یہیں حافظ صاحب شہید ہُوئے اور اِسی کو مولانا حسین احمد صاحب نے شاملی قصبے تک بغیر کسی ثبوت کے محض اپنے جوشِ عقیدت سے پھیلا دیا، پھر دُوسرے حضرات نے اِسی فرضی بنیاد پر ہوائی قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

۱۵۔ اِس سلسلے میں یہ بات تصفیہ طلب رہ گئی کہ لڑائی تو صرف باغ میں چھپ کر ہُوئی تھی لیکن وہ لڑائی کِس سے لڑی گئی؟ انگریزی فوج سے یا حریت پسندوں سے؟ عبارت ۱ اور ۲ اشارۃً اور عبارت ۳ اور ۴ صراحتاً یہ بتا رہی ہیں کہ اِن حضرات نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی، جن میں سے تین بیانات قیام پاکستان کے بعد کے ہیں یعنی ۱، ۲ و ۵ کے اور صرف ایک بیان ایسا ہے جو قیام پاکستان سے شاید پہلے دیا ہو لیکن کانگریس کی ہمنوائی اور گاندھی کی پیشوائی کا سہارا لے کر انگریز دشمنی کا اعلان کیا گیا کہ صرف ہم اپنے ہندو بزرگوں اور بھائیوں کے زیرِ سایہ انگریزوں سے لڑنے کو تیار ہیں بلکہ ہمارے تو اکابر بھی برٹش گورنمنٹ سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ مقصد صرف ہندوؤں کا اعتماد حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں اگر ان حضرات نے انگریزوں سے

لڑائی کی ہوتی تو کم از کم دس بیس بڑے بڑوں کو ضرور انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا ہوتا لیکن معاملہ برعکس ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سال بعد صرف ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو پکڑا گیا اور چھ ماہ کے بعد وہ بھی رہا کر دیئے گئے کہ ان کی انگریز دشمنی کا کوئی معمولی سا بھی ثبوت خود حکومت کو نہ مل سکا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر عبارت ف[1] درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرات برٹش گورنمنٹ کی حمایت میں حریت پسندوں سے لڑے تھے اور حکومت کے باغیوں کا قلع قمع کرنے کی غرض سے باغ میں چھپے ہوئے تھے۔

۲۱۔ ہو سکتا ہے یہاں کوئی صاحب یہ سوال کریں کہ اگر علمائے دیوبند حریت پسندوں سے لڑے تھے تو مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کو گرفتار کیوں کیا گیا؟ نیز اعلیٰحضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (المتوفی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کے وارنٹ گرفتاری کیوں جاری ہوئے تھے؟ معلوم تو کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کا قصہ ہی من گھڑت ہے اور اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو شاید ایسا ہوا ہو گا کہ حکومت کے پاس ان حضرات کے خلاف جتنا ریکارڈ تھا جس کی بنا پر وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے تھے، اس سارے ریکارڈ اور وارنٹ گرفتاری کے جملہ حروف علمائے دیوبند کی عظیم روحانی طاقت نے مٹا دیے ہوں گے اور خالی کاغذات کو دیکھ کر حکومت کے کارندے کوئی انتقامی کارروائی کرنے سے عاجز رہ گئے ہوں گے۔ اس شبہ کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ قبلہ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ تو چھپ چھپا کر مکہ معظمہ کی طرف نکل گئے تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی تو ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۰ء تک متحدہ ہندوستان میں ہی رہے اور دار العلوم دیوبند کے بانی کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے لیکن ان بائیس سالوں میں بھی حکومت کے جاری کردہ وارنٹ گرفتاری مولانا کی روحانیت سے خائف ہو کر ان پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

باقی رہا مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کی گرفتاری کا معاملہ، تو اس سلسلے میں گزارش یہی ہے کہ موصوف کو اس بنا پر ہرگز گرفتار نہیں کیا

کہ انھوں نے انگریزوں سے ۱۸۵۷ء میں کوئی لڑائی بھڑائی کی تھی بلکہ انھیں تو تقریباً
ڈیڑھ سال بعد محض مخبروں کی تسکینِ خاطر کی غرض سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں
حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ کسی کے مال جان کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ حالات
ایسے موڑ پر آ پہنچے ہیں کہ اب ہر کوئی اپنی حفاظت آپ کرے۔ اِس اعلان کے
پیشِ نظر تھانہ بھون اور اس کے گرد و نواح میں اپنے انتظامی امور سرانجام دینے کی
غرض سے ایک انتظامیہ کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اِس کمیٹی کی بنا پر بعض حاسدوں نے
انگریزی حکام کے کان بھرے تو انہیں مطلع کرنے کی غرض سے پُرے علاقے میں ہے
ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ کے بعد حکومت نے موصوف کو
اپنا سچا وفادار تسلیم کر کے صاف بری کر دیا۔ اِن جملہ حقائق کو پیش کردہ عبارت ۱۵ میں
ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے۔ اسی عبارت کا یہ آخری جملہ کتنا معنی خیز ہے "اِسی قصہ نے
مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا"

۱۷۔ عبارت ۱۶ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں چھپ کر جب ان بانکے جانثاروں نے
حریت پسندوں پر فائرنگ کی تھی اس وقت شاید رات تھی جیسا کہ اِن الفاظ سے
مترشح ہوتا ہے کہ "جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے
یکدم فیر کیا، پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں"
اگر یہ رات کا وقت نہیں تھا تو یہ صورت رہی ہوگی کہ باغ میں سے چھپ کر ہی فائر
کرتے رہے ہوں گے سامنے مقابلے پر نہیں آتے ہوں گے جس سے اِن کی تعداد
کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جا سکتا۔

۱۸۔ عبارت ۱۷ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ صرف چند حضرات تھے، یا ہاتھوں میں تلواریں
لیے پھر رہے تھے کیونکہ اپنے علاقے کے حاکم بن بیٹھے تھے کہ حریت پسندوں سے
کم از کم اپنی حکمرانی کو محفوظ رکھیں۔ حریت پسندوں یعنی اپنی انگریزی سرکار کے
باغیوں کو دیکھ کر ان حضرات کے جذبۂ جاں نثاری نے جوش مارا اور اُن سے بھڑ گئے

۱۹۔ جہاں تک اِن حضرات کی جوانمردی و شجاعت کا تعلق ہے تو وہ ہر قسم کے شک و شبہ

بالاتر ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کے یہ الفاظ ترجمانی کے لیے کافی ہیں:" بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اسی لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پہ جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں"

اس عبارت کا ایک ایک لفظ ان حضرات اکابر دیوبند کے اقوال و افعال کی ترجمانی کا واقعی پورا پورا حق ادا کر رہا ہے۔ اپنے اکابر کی شجاعت و جوانمردی اور برٹش گورنمنٹ پر جاں نثاری کے جذبے کی اس سے بہتر شاید کوئی بھی دیوبندی عالم الفاظ کے آئینے میں تصویر نہ دکھا سکا ہو گا۔ ہر منصف مزاج ان لفظوں کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے: ؎

کرشمہ لفظوں میں ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

۲۔ عبارت ۳ تو بتا رہی ہے کہ ان حضرات کے جھنڈے تلے ہزاروں مجاہد جمع ہو گئے تھے لیکن عبارت ۲ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اپنی طرز کے مجاہدوں میں یہی چند فقیر (علمائے دیوبند) تھے۔ بہر حال تعداد کچھ بھی سہی اتنا ضرور ہے کہ حافظ ضامن صاحب کے شہید ہونے سے پہلے ان حضرات نے گورنمنٹ کی مخالفت یا حمایت میں کوئی لڑائی نہیں لڑی اور جس معرکہ میں حافظ صاحب شہید ہوئے تھے اس کے بعد باقی مجاہد خواہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے یا کم و بیش، لیکن سب کی شجاعت و جوانمردی کا تلاطم خیز طوفان تھم گیا تھا اور صرف ایک آدمی کے شہید ہو جانے کی وجہ سے باقی سب نے خاموشی اختیار کر لی، علانیہ غیر جانب دار ہو کر معتکف ہو بیٹھے تھے۔ اس حقیقت کو مولانا حسین احمد ٹانڈوی صاحب (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے کیسے حسرت بھرے الفاظ میں بیان کر کے ان حضرات کے مجاہدانہ عزائم اور شجاعت و دلیری کا سکہ بٹھا دیا ہے:" حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا" موصوف کا اس طرح آہ سرد بھرنا ضرورت حال کی پوری پوری

غمازی کر رہا ہے۔

۲۱۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ علمائے دیوبند برٹش گورنمنٹ کے ہرگز مخالف نہیں تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر جاں نثار سپاہی بھی بن جاتے تھے کیونکہ یہ پودا بھی انگریزی حکومت کا خودکاشتہ تھا اور اسے اپنی پرورش کے لیے سخت ضرورت تھی کہ حکومت اپنا دستِ شفقت اِس کے سر پر رکھے۔ ۱۸۵۷ء میں اِس زنانیہ گروہ نے پورا پورا ثبوت اپنی انگریز دوستی کا فراہم کر دیا تھا۔ نہ انھوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے اور نہ ایسا کوئی فتویٰ خود جاری کیا۔ نہ بادشاہ کی حمایت کا کوئی اعلان کیا اور نہ انگریزوں کے خلاف ایک لفظ کسی دیوبندی عالم نے منہ سے نکالا۔ نہ یہ حضرات جنرل بخت خاں، مولانا احمد اللہ شہید یا کسی بھی دُوسرے حریت پسند کی زیر کمان انگریزوں سے لڑے اور نہ کسی بھی مرحلے پر اُن سے رابطہ قائم کر کے اُنھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جو حضرات گاندھی کو پیشوا مان بیٹھے اُنھوں نے تو ترنگے جھنڈے کے زیرِ سایہ ہندوؤں کی ہمنوائی میں انگریزوں کے خلاف ضرور لب کشائی شروع کی باقی جملہ علمائے دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو ہمیشہ غدر کہا، حریت پسندوں کو باغی اور مفسد ہی ٹھہراتے رہے۔ یہ وہ امور ہیں جو تاریخ سے ثابت ہیں، کوئی دیوبندی عالم اِس کے برعکس آج تک ثابت نہیں کر سکا ہے، اگرچہ پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب بعض اوقات اکابرِ دیوبند کو محض سجادہ نشین عارفانہ کے بطور اور علمائے دیوبند کو خوش کرنے کی غرض سے مجاہدینِ جنگِ آزادی لکھ دیا کرتے ہیں ویسے حقیقت میں اُن کے نزدیک بھی علمائے دیوبند وہی کچھ ہیں جو کچھ وُہ حضرات تھے اور جو کچھ ۱۹۴۷ء سے پہلے خود اُن کے متعلق کہا جاتا رہا۔ باری تعالیٰ شانہٗ کی حکمت نرالی ہے۔ جس محمد ایوب قادری صاحب کے بل بوتے پر آج علمائے دیوبند اپنے اکابر کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہد منوانے کی مہم چلا رہے ہیں، آں موصوف کے قلم سے ہی قدرت نے وُہ الفاظ لکھوا دیے جن کے آئینے میں علمائے دیوبند کی حقیقی تصویر نظر آ رہی ہے اور کم از کم احقر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف کی اِس عبارت کا ہر جملہ معنی خیز اور حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ گزشتہ صفحات

ہیں اگرچہ عبارت نمبر ۵ کے تحت موصوف کے وہ خیالات پیش کیے جا چکے ہیں لیکن ہماری نظر میں بھی چونکہ علمائے دیوبند کی پوزیشن یہی کچھ ہے جو محمد ایوب قادری صاحب نے اس عبارت میں پیش کی ہے۔ لہٰذا اس عبارت کو آخر میں فیصلہ کن بیان کے طور پر پھر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> تھانہ بھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہوئے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا: "جب قاضی عنایت علی، جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کار فرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور بے سر و سامانی کو عدم جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔"[۱]
>
> ؎ حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے
> کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

وضاحت بعض حضرات یہاں یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ مجدد مائۃ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرتے ہوئے ...وں کا ذکر کس غرض سے کیا گیا اور اس کا یہاں کیا جوڑ تھا؟ احقر یہ گزارش کرے گا کہ تجدید ...ورت تخریب کے وقت پیش آتی ہے۔ انگریز نے جس عیاری اور فن کاری سے پاک و ہند ...چایا، اسی طرح مقدس اسلام کو مٹانے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ ...ین میں تخریب کاری انگریزوں نے براہِ راست نہیں کی بلکہ اپنے زرخرید علماء سے

---

[۱] ...ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۵

یہ خدمت لی تھی، لہٰذا اِس راز کو سمجھنے کے لیے انگریزوں کے اُن کارناموں کا مجملاً اظہار ضروری سمجھا گیا جن سے انگریزوں کی ذہنیت کا اندازہ ہو سکے۔ چونکہ اگلے ابواب میں تحریک کار علماء کا بیان ہے بایں وجہ پہلے انگریزوں کی فطرت پر قلم اٹھانا پڑا۔ یعنی : ؎

حافظ بخود نہ پوشید ایں جامۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن! معذور دار ما را

باب دوم

ارمغانِ حجاز

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟
(علامہ اقبال)

حکومت نے مسلمانوں کو اسلام سے کیوں بے بہرہ کیا؟

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایسٹ انڈیا کمپنی کا غلبہ جب روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور برصغیر پاک و ہند میں اس کے مقبوضات کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں اور پورے ملک پر غلامی کے بادل منڈلا رہے تھے، اس وقت بھی دیسی ریاستوں کے درمیان ڈپلومیسی کا جال پھیلانے والے انگریز، اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے کہ اس ملک میں وہ قوم بھی آباد ہے جس نے قیصر و کسریٰ کی عظمتوں کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا تھا، جس کے مٹھی بھر جوانوں نے صلیبی جنگوں میں نہ صرف یورپ کو شکست دی تھی بلکہ قبلۂ اوّل کو تثلیث پرستوں کے چنگل سے بچانے کی خاطر پوری دنیائے عیسائیت کی مجموعی طاقت و قوت کو کچل کر بیت المقدس میں ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا تھا، جس کے راستے میں پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندروں کی گہرائیاں بھی حائل نہ ہو سکی تھیں، جو قوم افغانستان کی طرف سے چل کر متعدد بار پاک و ہند کو نہ صرف پامال کرتی اور روندتی رہی تھی بلکہ صدیوں تک انتہائی جاہ و جلال کے ساتھ پورے ملک پر حکمرانی کرتی رہی ہے۔ یہ تاریخی حقائق اُنھیں زنّار داروں کی طرف سے تو مطمئن کر دیتے لیکن مسلمانوں کی جوانمردی، جہانبانی اور قوتِ ایمانی کا تصور اُن کی نیندیں حرام کر دیا کرتا تھا۔

انگریزوں نے بخوبی اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی جوانمردی اور جہانبانی حقیقت میں ان کی ایمانی قوت کے ثمرات ہیں، اگر اس گنجِ گراں مایہ اور سرمایۂ حیات کو ان کے دلوں سے کسی طرح خارج کر دیا جائے تو مسلمانوں اور دیگر اقوام میں کوئی ایسا امتیاز باقی نہ رہے گا جو اقوام و ممالک کو ان کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے اور جس کی بدولت قوموں اور ملکوں کی تقدیریں ان کی نوکِ شمشیر سے لکھی جاتی رہی ہیں۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے تو پاک و ہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کا وسیع پیمانے پر جال بچھایا گیا۔ اس

میدان میں جب ناکامی کا سامنا ہوا تو مسلمانانِ پاک و ہند کی آئندہ نسلوں کو اسلامی تعلیمات سے محروم رکھنے اور اِن کی جمعیت و قوت کو منتشر و پریشان کرنے کی غرض سے فرقہ بازی کا بیج بونے کی ٹھان لی۔ یہ تخریبی منصوبہ عیسائی بنانے والے منصوبے سے بھی بدتر، اور دور رس نتائج کا حامل اور ضرر رساں تھا، کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اِس تخریب کو تعمیر، بگاڑ کو بناؤ، دشمنی کو دوستی، بیخ کنی کو رواداری، فساد کو اصلاح اور مداخلت فی الدین کو عدمِ مداخلت سمجھتے آرہے ہیں؛ اور انگریزوں کے اِس تخریبی منصوبے پر کاربند ہو کر مسلمانانِ پاک و ہند اپنے ملی خصائص اور قوتِ ایمانی کو مٹانے میں ایک آٹومیٹک مشین کی طرح آج تک سرگرمِ عمل چلے آرہے ہیں۔

اِس منصوبے کے تحت حکومت نے اپنے جاری کردہ اسکولوں اور کالجوں سے دینی تعلیمات کو خارج از نصاب کر کے رعیت کا ذاتی معاملہ قرار دے دیا۔ ملازمتیں انگریزی اسکولوں کی تعلیم پر منحصر ہو کر رہ گئیں تو نتیجہ ظاہر ہے کہ دینی مدارس ویران ہونے لگے۔ اشک شوئی کیلیے اسکولوں میں برائے نام دینیات کو شامل رکھا، جس میں چند بزرگوں کی کہانیاں پڑھائی جاتی تھیں یا اُن اینگلو انڈین علماء کے فضائل و مناقب ذہن نشین کروائے جاتے تھے جو برٹش گورنمنٹ کے اِس تخریبی منصوبے کو بڑی ہوشیاری، رازداری اور کمال نمک حلالی سے پروان چڑھا رہے تھے۔ رہبری کے پردے میں قوم کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے۔ لیکن جن حضرات نے ملتِ اسلامیہ کی پاک و ہند میں حقیقی خدمات انجام دیں اُن مجاہدوں، بادشاہوں، شہیدوں اور رہنماؤں کو رشتۂ طاقِ نسیاں بنوا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کی اکثریت کا یہی عالم ہونا تھا اور آج بھی جب کہ حقیقی اسلام سے بڑی حد تک ناآشنا، نئے نئے اسلاموں کے ماننے والے، اینگلو انڈین علماء کے معتقد اور مغربی تہذیب کے دلدادہ۔ اِن بظاہر پڑھے لکھے مسلمانوں کی حقیقی حالتِ زار پر، اسلامی عینک سے دیکھنے والی آنکھیں یوں اشکبار ہوتی ہیں: ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہو جانے کے باعث، جب ایمان جیسی متاعِ عزیز

بھی شروع ہوگئی - جس ایمان کو بچانے کی خاطر یہی مسلمان سب کچھ لٹا دیا کرتے تھے وہ اُسے بے سود سمجھ کے چند روزہ زندگی کے راحت و آرام کے بدلے ایمان جیسی دولت لٹانی شروع کر دی - دوسری طرف دینِ اسلام میں خود علمائے دین کے ہاتھوں وہ عملِ جراحی اور اصلاح کے نام پر شریعت مطہرہ میں اس طرح ترمیم و اضافہ کروایا گیا کہ اپنی طرف سے ان سرکاری علماء نے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا - الغرض کتابِ اسلام کے مختلف ماڈرن ایڈیشن ایسی آب و تاب اور نظر فریب دلکشی کے ساتھ شائع ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسلام ان برطانوی اسلاموں کے نرغے میں گھر گیا - نئے نئے اور چمکیلے اسلاموں کی ظاہری چمک دمک نے ناواقفوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تو اصل دین کی اصلیت اُن کی نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہ گئی - جب عوام کی نظروں سے اصل اور نقل، حقیقی اور جعلی کا فرق اوجھل ہونا شروع ہوا تو ہر کوئی اپنی پسند کا اسلام چن کر اُس کا پیروکار بننا شروع ہو گیا - یوں مسلمانوں کی جمعیت پریشان ہو گئی، وہ فرقوں میں بٹ گئے اور انگریزوں کا مقصد، جسے وہ حاصل کرنے سے عاجز تھے بعض صاحبانِ جبہ و دستار کی بدولت پورا ہو گیا۔

ایسا کرنے سے برٹش گورنمنٹ کی مراد دو طرح بر آئی، اوّلاً جماعتوں اور فرقوں میں مسلمانوں کو اس طرح بانٹ دیا اور اختلافات کی خلیج اتنی وسیع کروا دی کہ یہ سوال ہی مٹ گیا کہ کبھی متحدہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر حکومت کے لیے دردِ سر کا باعث ہو سکتے ہیں یا انگریزی اقتدار کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں - ثانیاً: اسلامی تعلیمات سے ایک کثیر تعداد کو نابلد رکھ کر اور جعلی اسلاموں کا پیروکار بنا کر بھی حکومت نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا کیونکہ اسلام کے حقیقی فیوض و برکات سے بڑی حد تک مسلمانانِ ہند پہلے ہی خود کو محروم کر چکے تھے۔ ایمانی قوت کمزور ہو گئی، شوقِ جہاد اور جوشِ عمل کا رُخ حکومت کی وفاداری کی طرف پھر گیا - ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اگر انھوں نے بہادری بھی دکھائی تو بھی برٹش گورنمنٹ کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرتے رہے یا ہندوؤں کے معاون بن کر ان کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑی جوانمردی بس آ

دکھائی جا سکی کہ اسلام کا نام لے کر غریب مسلمانوں کے ووٹوں سے پاکستان بنا لیا لیکن جس قسم کی اسلام دوستی انگریز سکھا گئے تھے اُس نے اپنا پورا رنگ دکھایا کہ چوتھائی صدی گزر گئی لیکن کوئی حکومت پاکستان میں اسلامی قانون رائج کرنے کی جرأت نہ کر سکی بلکہ پورا زور متواتر اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ حقیقی اسلام کو محبوس رکھا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ غرضیکہ انگریزوں سے جو کمی رہ گئی تھی اُسے اب مسلمان خود پورا کر رہے ہیں۔ اس بے راہ روی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ عذابِ الٰہی سروں پر مسلط ہے لیکن کیا مجال کہ ہمارے دانشور اور اصحابِ اقتدار قوم کو اس غلط روش سے ہٹانے کی ضرورت بھی محسوس کریں۔ باری تعالیٰ شانہٗ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل ہمیں راہِ راست پر چلائے اور ہماری غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین۔

اس باب میں چونکہ فرقہ بازی کے بارے میں تاریخی طور پر کچھ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ انگریزوں کی دُوررس نگاہوں نے دہلی کے مایۂ ناز علمی و دینی گھرانے کے ایک منچلے، جوشیلے اور نوجوان عالمِ دین کو تاڑ لیا، یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (ف ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کو اور پاک و ہند کی سرزمین میں فرقہ سازی کا سنگِ بنیاد موصوف سے رکھوایا گیا۔ فرقہ بازی کے پاک و ہند میں جو فلک بوس محل نظر آ رہے ہیں اُن کی بنیاد رکھنے کا سہرا اُن موصوف ہی کے سر ہے۔ آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کے پوتے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) و شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کے بھتیجے اور شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند تھے۔ منچلے پن نے خوب گُل کھلایا۔ علمی میدان میں بازی ہار گئے تو انگریزوں کے کہنے پر سکھوں کا نام لے کر سرحد کے مسلمانوں کے خون سے ہولی جا کھیلے، اُنھیں ملعونین اشرار، کلاب النار اور مستحل الدم ٹھہراتے رہے۔ اُن کے ننگ و ناموس پر دست درازی کرتے رہے۔ پٹھانوں نے آخرکار مجبور ہو کر میزبانی سے ہاتھ اٹھایا اور اس جمعیت کے اکثر افراد کو ان کے اصلی مقام پر پہنچایا۔ ایک ہی رات کے اندر جتنے ہاتھ آ سکے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جو باقی بچے

انھیں سکھوں نے آدبوچا اور جو چند اشخاص بھاگ سکے اُن کے علاوہ سب کو بالاکوٹ کے مقام پر ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء کو ذبح کر کے اِس المناک ڈرامے کا پہلا پارٹ ختم کر دیا۔

تیرھویں صدی میں خارجیت نے نجد کی سرزمین سے سر اٹھایا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) اِس بلائے ناگہانی کے ٹھیکیدار بنے تھے۔ جب وہابیت کو اِس زمینِ مقدس میں قدم جمانے کی جگہ مل گئی تو اِسی گمراہی کو وہاں پہنچایا گیا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اِس مشن کو دل و جان سے قبول کر لیا اور اِس کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہے چونکہ حقیقت میں یہ وہی خارجی فرقہ ہے جس کی خبر مخبرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے دی تھی کہ قیامت تک یہ فرقہ مختلف ناموں سے ظاہر ہوتا رہے گا اور اِس کا آخری گروہ دجال کے ساتھ ہو گا۔ لہٰذا موصوف کی کارگزاری پر گفتگو کرنے سے پہلے، جن جن رنگوں میں خوارج آج تک نمایاں طور پر ظاہر ہوتے رہے ہیں، اُن کے بارے میں اختصار سے کچھ تاریخی طور پر عرض کر دیا جائے تاکہ ایک منصف مزاج کے لیے صورتِ حال کو سمجھنے میں وقت یا پیچیدگی باقی نہ رہ جائے۔

انگریزی دور سے چونکہ یہ دھاندلی جاری ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ کا ایک نیا ہی مکتبۂ فکر گھڑا ہوا ہے اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی چونکہ حضرت شاہ صاحب مدظلہ کے پوتے ہیں لہٰذا انھیں ولی اللّٰہی مکتبۂ فکر کا ایک عظیم علمبردار ٹھہرا دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں دعوے محض گھڑنت اور فرضی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کا کوئی نیا مکتبۂ فکر نہیں بلکہ وہ سُنّی حنفی عالمِ دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ شاہ صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے دینی عقائد میں بعد المشرقین ہے کیونکہ مولانا نے نہ صرف دیابنہ کی تخلیق بلکہ سرزمینِ پاک و ہند میں وہابیت کا سنگِ بنیاد رکھنے والے اور اِس کے آب و اِدراک آپ ہیں۔ موصوف کا اپنے خاندان سے دینی و مذہبی انقطاع بھی اُسی طرح ہے جس طرح نجد کے بانیٔ وہابیت کا دینی سلسلہ اپنے خاندان سے حتیٰ کہ والد ماجد مولانا عبدالوہاب (المتوفی ۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰ء) سے نہیں ملتا۔ کیا محض حسب سامنے رکھ کر کنعان کا دینی و مذہبی رشتہ نوح علیہ السلام سے جوڑا جا سکتا ہے؟

ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کا مذہب اختیار کیا تھا، محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) نے ابن تیمیہ حرانی کا مذہب اپنایا، ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے ابو یعلی وغیرہ سلفی حضرات کا مذہب قبول کیا تھا اور ابو یعلی قاضی وغیرہ نے مسلک خوارج کو اپنا دین ٹھہرایا تھا۔

خوارج

اب راقم الحروف اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آخری رسول، نبی الانبیاء، فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوارج کے بارے میں مسلمانوں کو کیا ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ناچیز جو سب سے زیادہ اپنے آقا و مولیٰ، سرور کون و مکان، محبوب انس و جان، نبی مختار، حبیب پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا محتاج ہے، ان ایسے لوگوں کے بارے میں پیارے نبی کے چند پیارے پیارے کلمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید کوئی خوش نصیب یہ سوچ سکے کہ جس نبی کا کلمہ پڑھتے ہیں جس کے اُمتی ہونے کا دم بھرتے ہیں، جب خود اُس آقا کی نگاہوں میں یہ جماعتیں ایسی ہیں تو بعض علماء کے جبّہ و دستار پر کیوں جائیں؟ بہتر یہی ہے کہ آقائے دو جہاں کے قدموں سے لگ جائیں۔ اگر ایک بھی خوش نصیب راہِ راست پر آگیا تو الحمد للہ، احقر کی محنت ٹھکانے لگی۔ اب پیارے مصطفیٰ کے پیارے ارشادات کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجیے کہ پیشگوئی کس پر صادق آتی ہے:

سمعت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم باذنی و رأیتہ بعینی اتی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بمال فقسمہ فاعطی من عن یمینہ ومن عن شمالہ ولم	سنا میں (ابو برزہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنے کانوں سے اور دیکھا میں نے اپنی آنکھوں سے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کچھ مال حاضر کیا گیا، آپ نے تقسیم فرمایا۔ داہنی اور بائیں طرف والوں کو عطا فرمایا اور پیچھے والے کو نہ دیا۔ تو پیچھے والوں سے ایک

يعطى من ورائه شيئاً فقام رجل من ورائه فقال يا محمد ما عدلت في القسمة. رجل اسود مطموم الشعر عليه ثوبان ابيضان فغضب رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم غضباً شديداً وقال والله لا تجدون بعدى رجلاً هو اعدل منى ثم قال يخرج في آخر الزمان قوم كان هذا منهم يقرؤن القرآن لا يجاوز تراقيهم يمرقون من الاسلام كما يمرق السهم من الرمية سيماهم التحليق لا يزالون يخرجون حتى يخرج آخرهم مع المسيح الدجال فاذا لقيتموهم هم شر الخلق والخليقة۔

(نسائی، مشکوٰۃ، باب قتل اہل الردۃ)

آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا، اے محمد! آپ نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا۔ وہ آدمی سیاہ رنگ اور گھنڈے ہوئے سر والا تھا۔ اس نے بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: خدا کی قسم میرے بعد تم مجھ سے زیادہ انصاف کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔ مزید فرمایا: آخری زمانے میں ایک قوم نکلے گی، گویا یہ بھی اسی قوم کا ایک فرد ہے، وہ قرآن بہت پڑھیں گے لیکن قرآن کا اثر اُن کے دلوں کی طرف نہیں جائیگا۔ اسلام سے وہ ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے۔ سر منڈانا اُن لوگوں کی نشانی ہوگی۔ وہ ہر دور میں ظاہر ہوتے رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کی آخری جماعت دجال کی ساتھی ہوگی۔ جب تم اُن لوگوں کو پاؤ تو سمجھ لینا کہ وہ بدترین مخلوق ہیں۔ (نعوذ باللہ من شرورھم)

آخری زمانے کی جس قوم کا اس حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے اس کے بارے یہ تو معلوم ہو گیا کہ مدعیٔ اسلام ہونے کے باوجود وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گا۔ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو بدترین مخلوق قرار دیا تھا۔ ساتھ ہی اُس گروہ کی چار نشانیاں بھی ہمیں بتا دی ہیں:

۔ وہ شانِ رسالت میں گستاخانہ کلمات استعمال کیا کریں گے۔

۱- زیادہ تر سر منڈائیں گے۔

۲- قرآن خوب پڑھیں گے لیکن اُن گستاخانِ رسول کے دِلوں پر قرآن کا اثر نہیں ہوگا۔

۳- وہ قوم پرور دیں کافروں کی معین و مددگار بن کر رہے گی حتیٰ کہ دجّال کا ساتھ بھی یہی لوگ دیں گے۔

نین کرام! شانِ رسالت میں گستاخانہ عبارتیں لکھنے والے بالکل ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے
بیا الفاظ بھی سید الانبیاء علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں جاری کر دیے جن کی
ہی بدترین دشمنوں اور سکّھ کافروں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ جماعت یا
بھی بالکل ظاہر ہے جو اپنی اور بُت پرستوں کی ایک قوم بناتی اور متحدہ قومیت کا گیت گاتی
ی ہے۔ کیا اس فرمانِ رسالت کے مطابق کھرے اور کھوٹے کو پہچاننے میں کوئی شبہ
باتا ہے؟ ہرگز نہیں رہتا۔ اب دوسرا ارشادِ گرامی ملاحظہ ہو۔

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ
تعالیٰ عنہ قال بینا نحن عند
رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم وہو یقسم قسماً اتاہ
ذو الخویصرۃ وہو رجل من
بنی تمیم فقال یا رسول اللہ
اعدل فقال ویلک فمن یعدل
اذا لم اعدل قد خبت وخسرت
ان لم اکن اعدل فقال عمر
ائذن لی اضرب عنقہ فقال
دعہ فان لہ اصحابا یحقر
احدکم صلاتہ مع صلاتہم
وصیامہ مع صیامہم یقرؤن

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے
روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسولِ خدا
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ بیکس پناہ
میں حاضر تھے اور آپ اُس وقت مال تقسیم
فرما رہے تھے۔ اسی اثناء میں ذو الخویصرہ
آیا جو بنی تمیم سے تھا۔ اُس نے کہا، اے
اللہ کے رسول! انصاف کرو۔ آپ نے فرمایا:
کمبخت! اگر میں انصاف نہیں کرتا تو اور کون
انصاف کرے گا؟ تیرے اس گمان کی وجہ سے کہ
میں بھی عدل نہیں کرتا، تو صریح زیاں کار ہو گیا۔
حضرت عمر نے عرض کیا، یا رسول اللہ! اجازت
دیجیے میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے ارشاد
فرمایا: اسے جانے دو، اس کے ساتھی بہتیرے

القرآن لا یجاوز تراقیهم یمرقون من الدین کما یمرق السهم من الرمیة۔
(مشکوٰۃ، باب المعجزات)

تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے مقابلہ میں حقیر جانوگے۔ یہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ (دائرۂ اسلام کے باوجود) یہ لوگ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔

یہ واقعہ دوسری روایت میں یوں مذکور ہوا ہے:

اقبل رجل غائر العینین ناتئ الجبین کث اللحیة مشرف الوجنتین محلوق الرأس فقال یا محمد اتق اللہ فقال فمن یطع اللہ اذا عصیته فیأمننی اللہ علی اهل الارض ولا تأمنونی فسأل رجل قتله فمنعه فلما ولی قال ان من ضئضئ هذا قوما یقرءون القرآن ولا یجاوز حناجرهم یمرقون من الاسلام مروق السهم من الرمیة فیقتلون اهل الاسلام و یدعون اهل الاوثان لئن ادرکتهم لاقتلنهم قتل عاد (ایضاً)

ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی، پیشانی اٹھی ہوئی، داڑھی گھنی، رخسار اونچے اور سر منڈا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا: اے محمد! اللہ سے ڈر۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اگر بقول تمہارے، میں بھی خدا کی نافرمانی کرتا ہوں تو کون ہے جو اس کے احکام کی اطاعت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے اہلِ زمین پر امین بنایا ہے اور تم مجھے امین نہیں مانتے۔ ایک مرد نے اس کو قتل کرنے کی اجازت مانگی لیکن اسے منع کر دیا گیا۔ جب وہ گستاخ واپس لوٹ گیا تو سرکار نے ارشاد فرمایا: اس کی اصل سے ایک قوم ہوگی، وہ لوگ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے نرخروں سے نیچے نہ اترے گا۔ جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے وہ اسی طرح اسلام سے نکل جائیں گے۔ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کریں گے۔ اگر میں اس قوم کو

پاتا تو اُنھیں اِس طرح ہلاک کر دیتا جیسے قوم عاد کی گئی۔

قارئین کرام! اِن دونوں روایتوں میں مذکورہ گستاخ ٹولے کی مزید نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ اُمتِ محمدیہ اُنھیں پہچان کر خبردار ہوجائے۔ اُن کی باتیں سُننا یا اُن کے گروہ میں اُنھیں مسلمان سمجھ کر مل جانا تو دُور کی بات ہے، مسلمان اُن کے سائے سے بھی بچیں۔ اُن کے ظاہری حال اور ادّعائے مسلمانی پر نہ جائیں۔ پہلی روایت کے تحت چار نشانیاں نمبروار پیش کر دیں، مزید ملاحظہ ہوں:

۵۔ پابندی اور ادائیگی نماز روزہ وغیرہ عبادات میں یہ اصلی مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر نظر آئیں گے۔

۶۔ مختلف حیلے بہانے تراش کر مسلمانوں کو قتل کرنا ان کی مردانگی ہوگی۔

۷۔ بُت پرستوں سے بگاڑیں گے نہیں بلکہ اُن کے یار و مددگار رہیں گے۔

مسلمانو! سچے خدا کے سچے نبی نے (جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) جس گروہ کی یہ سات نشانیاں بیان فرمائی ہیں، کیا ان نشانیوں کے ذریعے آپ اُس گروہ کو پہچان نہیں سکیں گے؟ یہ گروہ دورِ حیدری سے شروع ہوگیا تھا، ہر دَور میں مختلف رنگ بدل کر ظاہر ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ اِس گروہ کی آخری جماعت دجّال کی معین و مددگار ہوگی۔ کیا اُسی جماعت کو آپ نے ماضی قریب میں چھوٹے دجّالوں کے ساتھ نہیں دیکھا؟ کیا مسلمانوں کے مفادات پر وہ آج بھی ضربیں نہیں لگا رہے؟ کیا اب اُنھوں نے چھوٹے دجّالوں کو دجّال مان کر اُس روش سے کنارہ کر لیا ہے؟ آئیے اب دیکھیں کہ پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہِ انور میں اِس گروہ کی قدر و قیمت اور شرعی پوزیشن کیا ہے:

۱۔ یہ گروہ اسلام سے خارج ہے جیسا کہ تینوں مذکورہ روایتوں میں ہے۔

۲۔ یہ بدترین مخلوق ہیں جیسا کہ پہلی روایت میں ہے۔

۳۔ اللہ کا رسول اِن سے سخت ناراض ہے۔ پہلی روایت

۵۔ رسولِ خدا کے نزدیک یہ گروہ زیاں کار ہے —— دوسری روایت

۶۔ صحابۂ کرام کے نزدیک یہ لوگ قابلِ گردن زدنی ہیں جیسا کہ حضرت عمر کی درخواست سے واضح ہے —— دوسری روایت

۷۔ یہ قومِ عاد کی طرح ہیں اور اسی کی طرح ہلاک کیے جانے کے سزاوار —— تیسری روایت

۸۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انھیں پاتے تو ان کے خلاف جہاد فرماتے —— تیسری روایت

مسلمان بھائیو! کلمۂ طیبہ کے ہمراہیو! اللہ تعالیٰ کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے پیارے پیارے الفاظ پیش کر کے خوارج کی چند جماعتوں کی سات نشانیاں اور ان کے بارے میں سات احکام ان روایتوں سے ہی اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیئے۔ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں، کسی مخالف جماعت کی کھینچ تان نہیں، اسی آقا کے ارشادات ہیں جس کا کلمہ یہ حضرات بھی پڑھتے ہیں، جن کے امتی ہونے کا لوگ بھی دم بھرتے ہیں، دیکھیے ان ارشادات کو سن کر کس کروٹ گرتے ہیں؟ یا جس گھر سے نکل کر جا رہے تھے پھر اسی کا رخ کرتے ہیں؟ اے میرے رب! اے ساری کائنات کے رب! ہدایت فرما کہ یہ لوگ بھی اندھیرے کو چھوڑ کر اسلام کے اجالے میں آئیں اور اپنی عاقبت کو برباد ہونے سے بچا لیں۔ آمین یا اللہ العالمین بحق سید المرسلین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ حبیبہ محمد و آلہ و صحبہ اجمعین۔

خوارج باقاعدہ جماعتی شکل میں پہلے پہل مولائے کائنات، تاجدارِ شش جہات، شہسوارِ ولایت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جنگِ صفین کے بعد ظاہر ہوئے۔ قبل ازیں یہ آپ کے ساتھی اور تبع تھے لیکن مسئلہ تحکیم کی آڑ میں بگڑے اور اپنا اصلی رنگ روپ ظاہر کرنے لگے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

"عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علی کو تحکیم کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر ایک خاص حَکم مقرر کرنے پر تل گئے، جلد ہی اپنے خیالات سے منحرف ہو گئے اور تحکیم کو ایک جرم قرار دینے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جس طرح ہم نے تحکیم کو قبول کر کے ارتکاب کفر کیا تھا اور پھر اس سے تائب ہوئے آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کا اعلان کریں۔ عرب کے بدو بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ کے نعرہ کو اپنا شعار بنایا اور حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا۔[1]

خوارج کے گروہ کی یہ اپنے روزِ اوّل سے ہی فطرت چلی آتی ہے کہ جو حضرات اسلام کا عملی نمونہ پیش کر رہے تھے، جو بابِ مدینۃ العلم تھے اور جن حضرات، قدسی صفات سے بہتر اسلام کی مکمل عملی تفسیریں چشمِ فلک کسی نے بھی آج تک غیر انبیاء کے گروہوں میں نہیں دیکھیں، خوارج نے اُن حضرات کو بھی اسلام سے خارج ٹھہرانے اور کافر بتانے بلکہ اُن کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کی اکابر دشمنی پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ابو زہرہ مصری مزید یوں وضاحت کرتے ہیں:

"لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہ کے الفاظ ہر آن اُن کے پیشِ نظر رہتے۔ یہی اُن کا دین تھا جس سے مخالفین پر آوازے کستے اور ہر بات کو ختم کر کے رکھ دیتے۔ جب حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو مصروفِ گفتگو دیکھتے یہی نعرہ لگاتے۔ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور ظالم حکام سے اظہارِ بیزاری کا خیال اُن پر حاوی رہتا تھا۔ یہ چیز اُن کے قلب و دماغ پر چھا گئی۔ اُن کے لیے حق تک رسائی حاصل کرنے کے سب دروازے بند کر دیے تھے۔ عثمان و علی، طلحہ اور زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور قائلینِ بنی اُمیہ سے برأت کا اظہار کرنے والے کو اپنے زمرہ میں شامل کر لیتے تھے اور بعض دُوسرے اصول و مبادی میں نسبتاً اس سے نرم سلوک کرتے، حالانکہ وُہ مسائل اِن سے اہم ہوتے اور اُن میں مخالفت کا ارتکاب کرنے سے وُہ اِن سے

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۰۰ء، ص ۸۴

زیادہ دُور رہنا پڑتے اگر اظہارِ برأت کی مخالفت میں یہ خطرہ نہ تھا۔۔۔۔
برأت کا خیال اُن کے اعصاب پر بُری طرح سوار تھا اور جمہور مسلمانوں کی
جماعت میں داخل ہونے سے مانع تھا۔" ؎۱

ریح یہود کی خواہ گردن اُڑا دی جائے لیکن وُہ موت کی تمنا نہیں کرے گا اِسی طرح
ں کی خواہ جان جاتی رہے لیکن مسلمانوں اور اُن کے اکابر کو مشرک اور خارج عن الاسلام
سے نہ کبھی باز آئے اور نہ تا قیامت باز آئیں گے۔ یہی سلوک اِن بدبختوں نے اپنے
زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کو مسلمان شمار کرنے والوں کے ساتھ
ا تھا۔ حضرت حیدرِ کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے دیگر ساتھیوں نے اپنے عمل سے
اُمتِ محمدیہ کو یہ دکھا دیا تھا کہ خوارج اُن کے نزدیک واجب القتل ہیں کیونکہ خود ارشادات
بس پر شاہد ہیں۔ اِس سلسلے میں فاضل ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں :

"یہی حال خوارج کا تھا، سیدنا علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اُن کے
خطیوں بلکہ نمازمیں تنگ کرتے تھے۔ یہ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ
عنہما) کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں کو چیلنج کرتے اور انھیں مشرک قرار
دیتے تھے۔ اِن لوگوں نے جب عبداللہ بن خباب الارت (رضی اللہ تعالیٰ
عنہ) کو قتل کیا اور اُن کی لونڈی کا پیٹ پھاڑ ڈالا تو حضرت علی (رضی اللہ
تعالیٰ عنہ) نے اُن سے کہا: "عبداللہ بن خباب کے قاتلوں کو ہمارے
حوالے کر دو" خوارج نے جواب دیا "عبداللہ بن خباب کو ہم سب نے
قتل کیا ہے۔" آخر حضرت علی (کرم اللہ وجہہٗ) کو اُن سے لڑنا پڑا، یہاں تک
کہ اُن کا تقریباً قلع قمع ہی کر دیا، تاہم جو بچ نکلے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے
طریقہ سے ہٹے نہیں بلکہ پُوری دلیری اور شجاعت کے ساتھ اپنی دعوت میں
مصروف رہے۔" ؎۲

؎۱ ابو زہرہ، اسلامی مذاہب، ص ۸۵

؎۲ ص ۸۶

خارجی حضرات اپنے روزِ اوّل سے ہی نرالا تدین و اخلاص پیش کرتے آئے ہیں لیکن یہ بھینت دوسروں کی آنکھوں میں تنکے ہی دیکھتے رہتے ہیں اپنی آنکھوں کے شہتیروں کو دیکھنے کی یہ حضرات کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کیا کرتے۔ خوارج کی اوّلین جماعت نے اپنی اس مخصوص فطرت کا ایک یہ ثبوت بھی پیش کیا تھا:

"فہمِ دین کی کوتاہی نے اخلاص کے باوجود انھیں گمراہ کر دیا اور یہ اسلام کے جوہر اور روح کو پامال کرنے لگے۔ انھوں نے عبداللہ بن خباب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو مشرک تصور نہیں کرتے تھے مگر قیمت ادا کیے بغیر ایک عیسائی کی کھجوریں لینے سے انکار کر دیا تھا۔" [1]

دوسرے پر تنقید و نکتہ چینی کرنے کی بیماری تو عام ہے لیکن بعض اوقات انسان غیر شعوری طور پر یا کسی گمراہ پارٹی سے اپنا خلافِ واقعہ اختلاف دکھانے اور اس سے اپنی برأت کا نام نہاد اظہار کرنے کی خاطر، خود اپنے ہی عقاید و نظریات پر تنقید کر جاتا ہے۔ زمانۂ حال کے خارجیوں اور وہابیوں میں سے کبھی کبھی بعض حضرات بھی یہی طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور دیوبندی عالم مولوی بدر عالم میرٹھی نے خوارج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اُن (خوارج) کے اقوال و عقاید دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درکِ مقاصد، فہمِ معانی، استنباط و استخراج کا اُن میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا انھیں شوق ضرور تھا مگر اس کے معانی کی انھیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن اُن کی زبانوں پر تھا مگر اُن کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے۔ اُن کی اس علمی بے مائیگی کی طرف حدیث کے الفاظ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے "یقرؤن القران لا یجاوز حناجرھم"

---

[1] غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۲۵، ۲۶

یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف اُن کی زبانوں پر ہوگا، اُن کے قلوب میں علم و فہم کا کوئی ذرہ نہ ہوگا۔

دوسری علامت اُن کے علم نما جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ: یقتلون اهل الاسلام و یدعون اهل الاوثان "بُت پرستوں کو چھوڑ کر اہلِ اسلام کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور نفس میں تقشف پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ان سے مناظرہ کے لیے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ اُنھوں نے فرمایا ہے، وُہ یہ تھا، میں ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہوں جس میں یہ قرآن اُترا ہے اور جو براہ راست آن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں۔ اگر انصاف کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کی صحیح مراد وُہ لوگ زیادہ جانتے تھے جن میں سب سے پہلے قرآن اُترا اور جنھوں نے براہِ راست صاحب کتاب سے اِس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اِس پر عمل کا طریقہ دیکھا۔"[1]

کاش! امر صوف یا اُن کے ہم خیال علماء بھی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں اپنے دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے والے، اِس کی سچی بات اور لطیف مضامین سے محروم رہنے والے، کہیں آجکل وُہ حضرات ہی تو نہیں ہیں جو قرآنِ کریم سے پروردگارِ عالم کو جھوٹا بنانے اور اس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین کے دلائل فراہم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اوّلین خوارج نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشرک اور اسلام سے خارج کہا تھا لیکن موجودہ خوارج کے ہدفِ تحقیق سے انبیائے کرام ہی نہیں بلکہ اللہ خالقِ کائنات۔ اِس کے ساتھ ہی اُن جماعتوں یا افراد کو بھی دیکھ لیتے جو علی الاعلان بُت پرستوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں، مسلم مفادات کی

---

[1] بدر عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنہ، جلد اول، مطبوعہ دہلی، بار اول ۱۳۵۲ھ، ص ۳۰۳

مخالفت کرنا ہمیشہ شیوہ رہا ہے اور مسلمانوں کے خون کے دھبے ابھی تک جن کے دامنوں پر صاف نظر آرہے ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان ہے اُن کے ارشادات عالیہ کو درست تسلیم کرتے ہیں، تو پیارے نبی کے اِس پیارے اعلان پر عمل کرتے "یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان" کے جن کو مصداق پاتے، بغیر کسی رُو رعایت کے اُنھیں خوارج زمانہ تسلیم کرتے اور اُن سے کنارہ کش ہو جاتے۔ کیا خوارج پر ان تنقید کرنے والوں نے حق و باطل میں تمیز کرنے کی ایسی زحمت برداشت کی؟ تاریخ اِس کا جواب نفی میں دے رہی ہے کیونکہ مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "ثم لا یعودون" بھی تو فرمایا تھا۔ ایسے حضرات سب کچھ کہہ جاتے ہیں لیکن حق کی طرف آنے کی آن، باطل پر ڈٹے رہنے کے ارمان، واللہ ھوالمستعان۔

وجہ یہ ہے کہ موجودہ حضرات کا کہ خوارج کی ہمیشہ ہی یہ کیفیت رہی ہے کہ تصویر کا جو رُخ اُن کے سامنے ہوتا اُسی کو دیکھتے اور دُوسری طرف نظر دوڑانا بھی معیوب سمجھتے تھے۔ اپنے نظریات کو غلطی سے قطعاً مبرّا اور دُوسروں کے عقاید کو سراسر غلط ماننا گویا خارجیت کی اوّلین شرط ہے اور اِس سے ذرا اِدھر اُدھر ہٹ جانا اُن کے نزدیک دین سے نکل جانے اور جہنّم میں گر جانے کے مترادف رہا ہے۔ پروفیسر ابُو زہرہ مصری اِس حقیقت کو یُوں بیان کرتے ہیں:

> "یہ حقیقت ہے کہ خوارج کے مناظرات و مناقشات پر تعصب کا رنگ نمایاں ہوتا ہے، وُہ کبھی نہ خصم کی دلیل کو تسلیم کرتے ہیں نہ اُس کے نظریات کی صحت کا اعتراف کرتے، وُہ حق سے کسی قدر بھی قریب کیوں نہ ہو۔ مخالف جس قدر زیادہ قوی دلیل پیش کرتا اُسی قدر یہ اپنے عقیدے پر زیادہ راسخ ہو جاتے اور اپنی تائید میں دلیلیں دیتے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے افکار اُن کے نفوس پر چھائے رہتے تھے اور اُن کے نظریات و معتقدات اُن کے قلوب کی گہرائی تک جاگزیں ہو چکے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن کی قوتِ فکر و نظر کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں اور اُن کے ادراکات و احساسات،

میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہی۔ بایں ہمہ خوارج میں شدتِ نزاع و خصومت کا جذبہ کارفرما رہتا تھا۔۔۔۔ یہ اسباب ستے جن کی بنا پر خوارج کے افکار میں بڑی تنگ نظری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اُن کی جانب صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھا کرتے تھے اور دوسروں کے نظریات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔" [۱]

خوارج قرآن کریم کے مفہوم و مطالب کو جس طرح اخذ کیا کرتے تھے اُس کے بارے میں موصوف یوں تصریح کرتے ہیں:

"خوارج ظواہرِ قرآن سے تمسک کرتے تھے اور اُس کے معانی و مفہوم کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش نہ کرتے۔ نصوص پر سطحی قسم کی نگاہ ڈالنے سے جو سرسری مفہوم ذہن میں بیٹھ جاتا بس اُسی کے ہو رہتے اور اُس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر سرکنا گوارا نہ کرتے۔" [۲]

خوارج میں موصوف کے نزدیک وضعِ احادیث کا مرض بھی سرایت کیے ہوئے تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"مذہب و مسلک کی اندھا دھند تائید کا جذبہ بعض اوقات خوارج کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دروغ گوئی کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ایک خارجی جس نے اپنے عقیدہ سے توبہ کر لی تھی، علماء سے کہا کرتا تھا کہ احادیثِ نبویہ کی اچھی طرح چھان بین کریں کیونکہ خوارج کو جب کوئی دلیل نہ ملتی تو وہ خود ساختہ کلام کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔" [۳]

خوارج کے نظریات و عقائد چونکہ تعصب، تنگ نظری اور کج فہمی پر مبنی تھے یہی وجہ ہے کہ وہ طبائع کے اختلاف کی بنا پر مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن ازارقہ کہلانے والے خارجی

---

[۱] غلام احمد حریری، اسلامی مذاہب، ص ۹۹، ۱۰۰

[۲] ایضاً، ص ۱۰۰

[۳] ایضاً، ص ۱۰۰

باقی سب سے تعداد میں زیادہ اور مضبوط تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے دیگر خوارج سے ان کے چند امتیازی عقاید کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار یہ ہیں :

"(الف) یہ اپنے مخالفین کو صرف خارج از ایمان ہی قرار نہیں دیتے بلکہ ان کو مشرک اور دائمی جہنمی تصور کرتے ہیں، ان کا قتل وقتال بھی ان کے نزدیک روا ہے۔

(ب) غیر خوارج مسلمان کا ملک دارالحرب ہوتا ہے اور وہاں پر ہر وہ کام مباح ہے جو دارالحرب میں مباح ہوتا ہے مخالفین کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا اور انہیں لونڈی غلام بنانا جائز ہے۔ جنگ سے جی چرانے والوں (قتل مسلم سے پرہیز کرنے والے خارجیوں) کو قتل کرنا روا ہے۔

(ج) مخالفین کے بچے بھی مشرک ہیں اور ابدی جہنمی ہیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ مخالفین کا کفر صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ان کے بچوں تک بھی پہنچ جائے گا، باوجودیکہ انہوں نے اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ خوارج کا یہ نقطۂ نظر ایک عظیم فکری انحراف کی آئینہ داری کرتا ہے۔

(د) گناہ صغیرہ یا کبیرہ کا ارتکاب انبیاؑ سے بھی ہو سکتا ہے۔" [1]

ازارقہ خوارج کے مذکورہ عقیدے کے بارے میں موصوف نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے :

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے ایک طرف تو وہ کبائر کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دیتے اور دوسری جانب انبیاؑ سے بھی ان کا صدور جائز سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں انبیاؑ کفر کا ارتکاب کرکے توبہ کیا کرتے ہیں۔" [2]

---

[1] غلام احمد حریری : اسلامی مذاہب، ص ۱۰۳

[2] ایضاً، ص ۱۰۳

اسلام کے بارے میں بحیثیت مجموعی پروفیسر صاحب مذکور اپنے خیالات یوں ظاہر کرتے ہیں :

"در اصل خارجی مذہب کی بنیاد تشدد اور غلو پر ہے۔ دین اور فہم دین کے معاملہ میں یہ لوگ بہت زیادہ غالی اور متشدد تھے۔ اِس چیز نے انھیں گمراہی کے راستے پر لا ڈالا تھا اور عامۂ مسلمین کو بھی گمراہ کرنے کے درپے رہتے تھے" ۱ے

وہ زمانے کے خارجی حضرات باوجود اتمام حجت کے اور دلائل کے میدان میں عاجز آجانے پر بھی اپنے عقاید و نظریات سے ایک انچ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتے لیکن حیرت اُس وقت دُور ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اِن حضرات کی اوّلین جماعت سے امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے یوں اتمام حجت فرمائی :

"ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہم عصر خوارج کے مزعومات کے دندان شکن اور مدلّل جواب دیے۔ اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

" اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ میں خطا وار ہوں اور گمراہ ہوں تو میری گمراہی اور غلطی کی سزا اُمتِ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیوں دیتے ہو ؟ تم نے اپنے کندھوں پر تلواریں لٹکا رکھی ہیں اور انھیں موقع بے موقع بے نیام کرتے ہو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ گنہگار کون ہے اور بے گناہ کون ؟ دونوں کو تم نے ایک ساتھ ملا رکھا ہے۔

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا، پھر اُس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی، اُس کے اہلِ خانہ کو اُس کا وارث بھی تسلیم کیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے قاتل کو جرمِ قتل میں قتل کیا لیکن اُس کے اہل کو اُس کی میراث سے محروم نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چور کے ہاتھ کاٹے اور غیر شادی شدہ زانی کو دُرّے مارے لیکن دونوں کو مالِ غنیمت

۱ے غلام احمد حریری، اسلامی مذاہب، ص ۸۰۔

میں سے حصہ بھی دیا۔ آپ نے گنہگاروں کے مابین اللہ تعالیٰ کا حکم قائم کیا، لیکن اسلام نے مسلمانوں کو جو حصہ دیا تھا اس سے اُن گناہ گاروں کو محروم نہیں کیا، نہ اُن کا نام دائرۂ اسلام سے خارج کیا۔" لہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اِس اتمامِ حجت کے بارے میں پروفیسر ابو زہرہ مصری نے یُوں لکھا ہے:

"حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اِس مدلل اور عمدہ تقریر کا خوارج کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اُس موقع پر کتابِ الٰہی سے دلیل لانے کے بجائے عملِ رسول سے دلیل پیش کی، کیونکہ عمل کی تاویل نہیں ہو سکتی۔ اِس کو درست طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے اور جس میں خوارج کے سطحی نظریات اور فکرِ خام کے لیے کوئی گنجائش نہ نکل سکتی تھی۔ سطحی فکر تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتا ہے۔ اُس کی نظر ایک جزئیے پر ہوتی ہے اور فہمِ عبادات و اسالیب میں جزئی میلان سے گمراہی تو حاصل ہو سکتی ہے، مقصد تک پہنچنا مشکل ہے۔ امورِ کلیہ پر نظر رکھنے سے حق کا ادراک کیا جا سکتا ہے اور درست فیصلہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ نظر بریں حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا عمل پیش کیا تاکہ اُن پر تاویل کے دروازے بند کر دیے جائیں، بغیر اِس کے کہ اُن کی تلبیساتِ فاسدہ کے لیے حیرت و اضطراب کا کوئی رخنہ باقی نہ رہنے دیا جائے۔" لہ

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے خوارج کو راہِ راست کی طرف بُلانے اور اتمامِ حجت کی غرض سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو اُن کے پاس بھیجا۔ آپ کا

لہ غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۹۴

لہ ایضاً: ص ۹۵

خوارج سے جو گفتگو ہوئی اُسے حافظ ابن عبد البر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۴۶۳ھ)
کے حوالے سے مولوی بدر عالم میرٹھی دیوبندی نے یوں بیان کیا ہے:

"جب خوارج حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر چڑھائی کر کے آئے تو لوگ
آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے امیر المومنین! دیکھیے
یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلے میں آمادۂ پیکار کھڑے ہیں۔ آپ نے جواب
دیا کہ پہلے انھیں جنگ کر لینے دو۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک
دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجیے، میں اُن لوگوں (خوارج)
سے گفتگو کر لوں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھیڑ لگ رہی ہے۔
شب بیداری کی وجہ سے اُن کے چہرے سیاہی مائل ہیں۔ سجدوں کے
نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اُونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیکیں
پڑ گئی ہیں۔ دُھلی ہوئی قمیض پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن عباس (رضی
اللہ تعالیٰ عنہما) کو دیکھا تو بولے۔ ابن عباس! کیسے آئے اور یہ حُلّہ
کیسا پہن رکھا ہے؟ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کہتے
ہیں، میں نے جواب دیا تمہیں اِس حُلّہ پر کیا اعتراض ہے؟ میں نے
خود آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے یمنی کپڑے دیکھے
ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: "قل من حرم زینۃ
اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق" آپ کہہ دیجیے کہ
یہ زینت اور اچھی اچھی غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے
بنائی ہیں، کس نے حرام کیں؟ پھر اُنھوں نے دریافت کیا: کہو کیوں
آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا
نہیں جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ میری آمد کا

مقصد یہ ہے کہ اُن کی باتیں تم تک اور تمھاری باتیں اُن تک پہنچا دوں۔
اُنھوں نے آپس میں کہا: ان سے بات مت کرو کیونکہ یہ قریشی ہیں اور ان کے
حق میں قرآن کہتا ہے "بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ" بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔

بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے۔ اِس کے بعد اُن میں سے دو تین
شخص سامنے آئے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر تمھیں
کیا اعتراض ہے؟ اُنھوں نے کہا: تین اعتراض ہیں۔ میں نے کہا بتاؤ۔
اُنھوں نے کہا، پہلی بات تو یہ ہے کہ اُنھوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں
کو حَکَم بنایا، حالانکہ قرآن کریم میں ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: فیصلہ
صرف خدا کا ہے۔ میں نے کہا، چلو ایک بات ہوئی، اور بولو۔ کہنے لگے،
حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)
سے جنگ کی، پھر کسی کو قید کیا اور نہ مالِ غنیمت لوٹا۔ اب اگر اُن کی جماعت
مسلمان تھی تو اُن سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح اُن کے ساتھ
جنگ درست تھی، قید کرنا بھی درست تھا۔ میں نے کہا، اچھا اور کچھ؟ بولے
تیسری بات یہ ہے کہ اُنھوں (امیرالمومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)
نے اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا؟ اِس لیے اگر وہ مومنین کے امیر
نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہوئے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

میں نے کہا اگر میں اِن سب باتوں کا تمھیں خود قرآن و سنت سے ہی
جواب دے دوں تو کیا واپس چلے جاؤ گے؟ اُنھوں نے کہا: کیوں نہیں۔
اِس پر میں نے کہا، اچھا تو سنو۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن
ہی میں دوسروں کو حَکَم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے چنانچہ حالتِ احرام میں
کوئی شخص شکار کرے تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر جزا مقرر کی ہے اور اُس کا
فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے، جو وہ کہہ دیں گے وہی قابلِ تسلیم
ہو جائے گا۔ اِسی طرح خلع میں طرفین کے دو شخص بلا کر فیصلہ اُن کی رائے

پر رکھ دیا ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابل تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں تسلیم نہیں ہوگا؟ اب بتاؤ تمہارا اعتراض جاتا رہا یا نہیں؟ کہنے لگے: جی ہاں۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتاؤ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تمہاری ماں تھیں یا نہیں؟ اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد اُن کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں؟ اگر اس کا اقرار کرتے ہو، تو بھی کافر ہو، کہو اس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: اب تیسری بات کا جواب سنو۔ صلح حدیبیہ میں ابوسفیان و سہیل کے اصرار پر کیا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا؟ پھر اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا؟ سوال و جواب کے بعد اُن میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہو گئے اور جو رہ گئے وہ قتل کر دیے گئے۔[1]

مذکورہ بالا طویل حوالہ ہم نے اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ خوارج کے عقاید، ذہنیت اُن کے ساتھ صحابۂ کرام کا سلوک وغیرہ بہت سے گوشے قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔ حدیث میں اُن کی جو نشانیاں مذکور ہوئیں وہی مشاہدہ میں آئیں مثلاً:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی ہستی کو توحید کا مخالف ٹھہرانا اور ہر اُس مسلمان کو کافر و مشرک قرار دینا جو حضرت امیر المومنین کو مشرک نہ کہے اور اُن سے اپنی براءت کا

---

[1] بدر عالم میرٹھی، مولوی: ترجمان السنۃ، جلد اول، مطبوعہ دہلی، ص ۴۴

اظہار نہ کرے۔

۲۔ صحابۂ کرام کے نزدیک خوارج کا عقیدۂ توحید جیسا کہ اُنھوں نے اُس کی پیش نظر خود ساختہ حدود متعین کی ہوئی تھیں قرآن وسنت کے خلاف اور اسلامی توحید کے منافی تھا۔

۳۔ بات بات میں قرآن سے استدلال کرنا خوارج کا طرۂ امتیاز تھا لیکن قصورِ فہم کے باعث قرآنی آیات کو اپنے مخصوص عقاید و نظریات کا تابع رکھنے کے عادی تھے۔

۴۔ عبادت گزاری اور شب بیداری میں یہ مسلمانوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

۵۔ اپنے فیصلے کے روبرو یہ خدا اور رسول (جل جلالہٗ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے فیصلے کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت اور اُن کا جنتی ہونا خود قرآن کریم سے ثابت، حضور جانِ نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُنھیں عشرہ مبشرہ میں شامل فرمایا، اہلِ بیت میں ٹھہرایا اور آپ کے ایسے ایسے فضائل جو خصائص بتائے جن میں آپ منفرد بھی ہیں اور اپنے گوناں گوں فضائل و کمالات کی بنا پر اُمتِ محمدیہ میں آپ کو ہمیشہ انتہائی عقیدت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اسی طرح دیگر صحابۂ کرام کے فضائل قرآن وسنت سے ثابت لیکن خوارج نے اپنی ساختہ توحید کا اِن حضرات کو دشمن ٹھہرایا، باری تعالیٰ شانہٗ اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلے کو اپنے توحیدی جوش میں پس پشت پھینک کر اسلام کے علمبرداروں اور اُمتِ مرحومہ کے سرداروں کو بھی مشرک قرار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ موجودہ زمانے کے خوارج بھی اپنی ساختہ توحید کی ایسی ہی حدود متعین کیے ہوئے ہیں، جن کے پیشِ نظر اُمتِ مرحومہ کا کوئی فرد موحد نہیں ثابت کیا جاسکتا بلکہ ان کی اصطلاح میں مشرک ہی قرار پاتا ہے اور اس طرح یہ اُمتِ مرحومہ گویا مشرکوں کا ایک گروہ یا اُمتِ ملعونہ بن کر رہ جاتی ہے (نعوذ باللہ من شرورہم)

۶۔ جو خارجی اپنی ساختہ توحید سے تائب ہو کر حقیقی اسلام کے پیروکار نہیں وہ صحابۂ کرام کے نزدیک مستحق الدم ہیں جیسا کہ خوارج کا حشر امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا۔

خارجی صرف خود کو اسلام کا صحیح متبع مان سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی
ہستی پہ تنقید کرنے، اُس کی شان میں کیڑے نکالنے، اُسے خوفِ خدا سے عاری
یا سنتِ رسول کا مخالف کہتے ہوئے انھیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی جیسا کہ
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حلیے پر اعتراض کیا تھا۔

اس کے علاوہ اور جتنے گوشے ہیں وہ مذکورہ بالا عبارت سے خود ہی واضح ہیں۔

خوارج کا تشدد حد سے بڑھا تو ذوالفقارِ حیدری نیام سے باہر نکل آئی۔ مسلمانوں
خوارج کا زور توڑ کر رکھ دیا۔ چُن چُن کر انھیں قتل کیا۔ بہت تھوڑے بچ سکے ورنہ سب کو
موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نہ انھیں کلمہ گو شمار کیا، نہ اہلِ قبلہ، نہ صحابۂ کرام و تابعین حضرات
ان کے جُبّوں قُبّوں کو دیکھا اور نہ اُن کے ظاہری تدین کو، نہ اُن کا مثالی قاری ہونا انھیں
لمان ثابت کر سکا اور نہ پیشانیوں پر پڑے ہوئے سجدوں کے نشان اُن کے اہلِ اسلام
نے کی دلیل بن سکے، نہ شب بیداری نے انھیں کفریہ عقاید سے بچایا اور نہ خانہ ساز
ید نے، وہ صحابۂ کرام و تابعین عظام کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ نہ صرف خارجین کو اُن
سے تہِ تیغ کیا بلکہ اس ناپاک گروہ کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنے کی خاطر اس ساختہ توحید
علمبرداروں کو چُن چُن کر ذبح کیا اور ملکِ عدم کی سیر کرائی۔ کذٰلک العذابُ ولعذاب
الآخرۃ اکبر ط لو کانوا یعلمون ۝

خوارج کے غیر اسلامی عقاید و نظریات کا مرکزی نقطۂ نظر یہی تھا کہ وہ اپنا ذوقِ تکفیر
کرنے کی غرض سے، اُن آیات کو جو بتوں اور بت پرستوں کے بارے میں نازل
ہوئی تھیں انھیں بزرگانِ دین پر چسپاں کر کے مسلمانوں کو انبیائے کرام و اولیائے عظام
عقیدت و محبت کے باعث مشرک قرار دیتے تھے اور آج تک یہی کچھ مظاہرہ کیا جا رہا ہے
رج کی اس عادت کا مشہور دیوبندی عالم، مولوی بدرِ عالم میرٹھی نے یوں تذکرہ کیا ہے:

"خوارج کا نقطۂ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں
انھیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انھیں کافر قرار دیتے، پھر اس جاہلانہ
بنیاد پر اُن سے آمادۂ جنگ ہو جاتے تھے۔" [1]

---

[1] بدرعالم میرٹھی، مولوی، ترجمان السنۃ، جلد اول، ص ۴۴

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے بارے میں اُس مردِ حق آگاہ کی رائے گرامی کا اظہار بھی کر دوں جو علم کی وافر دولت سے ہی مالا مال نہ تھے بلکہ روحانیت کے لحاظ سے تو دنیائے کرام میں اپنی مثال آپ ہوئے۔ میری مراد شہنشاہِ بغداد، قطب الاقطاب، غوث الاعظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"وقد وصفهم النبي صلى الله عليه وسلم بانهم يمرقون من الدين كما يمرق السهم من الرمية ثم لا يعودون فيه فهم الذين مرقوا من الدين والاسلام وفارقوا الملة و شردوا عنها وعن الجماعة وضلوا عن سواء الهدى و السبيل وخرجوا عن السلطان وسلوا السيف على الائمة و استحلوا دماءهم واموالهم وكفروا من خالفهم يشتمون اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم واصهاره ويتبرؤن منهم ويرمونهم بالكفر والعظائم ويرون خلافهم ولا يؤمنون بعذاب القبر ولا الحوض ولا الشفاعة ولا يخرجون احدا من النار ويقولون من كذب كذبة او اتى صغيرة

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر نشانے سے، اور پھر دین میں واپس نہیں آئیں گے۔ پس یہ وہی لوگ ہیں کہ دینِ اسلام سے خارج ہو گئے۔ ملتِ اسلامیہ میں تفرقہ کی اور اُس سے بھاگے اور مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر رہ گئے۔ ہدایت کے سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔ سلطانِ وقت کے باغی ہوئے اور ائمۂ مطہرین پر تلوار اٹھائی اور اُن حضرات کا خون بہانا اور مال لوٹنا حلال ٹھہرایا۔ اپنے مخالفوں کو کافر کہتے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اصحاب اور خسروں کو گالیاں دیتے، اُن پر تبرا بازی کرتے اور اُن حضرات پر کفر اور کبیرہ گناہوں کی تہمت لگاتے اور غیر خوارج کو ستم کرتے۔ یہ عذابِ قبر، حوضِ کوثر، شفاعت اور دوزخ سے کسی کے نکالے جانے کا انکار کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے جس نے ایک جھوٹ بولا یا گناہ صغیرہ

اوکبیرۃ من الذنوب فمات	یا کبیرہ کیا اور بغیر توبہ کیے مرگیا، تو ایسا آدمی
من غیر توبۃ فھو کافر وفی النار مخلد[۱]	کافر ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

حضرت غوث صمدانی، محبوب سبحانی، سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۶۱ھ) نے آگے خوارج کے پندرہ فرقے، اُن کے بانیوں کے نام اور ہر فرقے کے مخصوص عقائد کا ذکر کر کے آخر میں جملہ خوارج کی قدر مشترک یعنی ایسے دو غیر اسلامی معتقدات تحریر فرماتے ہیں، جن پر نجدات کے سوا سب خارجیوں کا اتفاق ہے۔ فرماتے ہیں:

واتفقت جمیع الخوارج علی	خوارج کے تمام فرقوں کا بوجہ مسئلہ تحکیم حضرت
کفر علی رضی اللہ عنہ لاجل	علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کفر اور کبیرہ گناہ کے
التحکیم وعلی کفر مرتکب الکبیرۃ	مرتکب کو کافر کہنے پر اتفاق ہے، ماسوائے
الا النجدات فانہا لم یوافقھم	نجدات فرقے کے کیونکہ اس بارے میں
علی ذالک۔[۲]	وہ دیگر خوارج سے متفق نہیں ہے۔

امام الائمہ حضرت سیدنا ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نے جو بلاشبہ امام المسلمین ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں اپنا اور جمہور مسلمین کا عقیدہ نیز مرتکب کبائر کا شرعی حکم یوں بیان فرمایا ہے:

افضل الناس بعد النبیین علیھم	جملہ انبیاء کرام علیھم الصلوٰۃ والسلام کے بعد
الصلوٰۃ والسلام ابوبکر الصدیق	تمام انسانوں میں افضل ترین حضرت ابوبکر صدیق،
ثم عمر بن الخطاب الفاروق	ان کے بعد حضرت عمر فاروق، پھر ان کے بعد
ثم عثمان بن عفان ذوالنورین ثم	حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین پھر ان کے
علی ابن ابی طالب المرتضیٰ	بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین
رضوان اللہ تعالیٰ علیھم اجمعین	ہیں۔ یہ سب عبادت گزار، حق پر ثابت قدم اور

---

[۱] عبدالقادر جیلانی، غوث اعظم، غنیۃ الطالبین، شائع کردہ مکتبہ سعودیہ کراچی، ص ۲۱۰، ۲۱۱

[۲] ایضاً، ص ۲۱۵، ۲۱۶

عائدين على الحق ومع الحق نتولاهم جميعا ولا نذكر احدا من اصحاب رسول الله (صلى الله عليه وسلم) إلا بخير ولا نكفر مسلما بذنب من الذنوب وان كان كبيرة اذا لم تستحلها ولا نزيل عنه اسم الايمان ونسميه مومنا حقيقة۔ [له]

حق کے ساتھ تھے۔ ہم ان سب سے محبت رکھتے ہیں اور ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (صحابۂ کرام) کو بھلائی کے ساتھ ہی یاد کرتے ہیں اور ہم کسی مسلمان کو کسی بھی گناہ کی وجہ سے اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، کافر نہیں کہتے، جب تک کہ وہ اُس کو حلال نہ سمجھے اور ہم اُس کو ایمان کے وصف سے نہیں نکالتے بلکہ ہم اُسے حقیقتاً مومن ہی گردانتے ہیں۔

خارجی سلفی

چوتھی صدی ہجری میں اتباعِ سلف کا دعویٰ کرتے ہوئے بعض حضرات نمودار ہوئے جو خود کو امام احمد ابن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۴۱ھ) کا پیروکار کہتے اور دینِ حق کا علمبردار ٹھہرا کر مسلمانوں کو اسلام سے خارج بتایا کرتے تھے۔ حقیقت میں یہ خارجیت کے علمبردار تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں:

"اتباعِ سلف سے مراد ہمارے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سلفی المشرب کہتے تھے اگرچہ ہم ان کے بعض عقائد و افکار کی نسبت اسلاف کی جانب صحیح نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ حنابلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اُن کے تمام اقوال و آراء امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں۔ جنہوں نے عقائدِ سلف کو حیاتِ نو بخشی اور اُن کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے مخالفین کے سامنے سینہ سپر رہے

[له] نعمان ابن ثابت، امام اعظم، الفقہ الاکبر، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۴۴، ۴۵

"۔۔۔۔۔۔ یہ حنابلہ مسئلہ توحید اور قبروں سے اُن کے ربط و تعلق پر گفتگو کرتے تھے۔ آیاتِ تاویل و تشبیہ کا مسئلہ بھی ان کے یہاں اکثر زیرِ بحث آتا۔ ان کا ظہور چوتھی صدی ہجری میں ہوا۔ یہ اپنے عقائد و افکار کو امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ بعض حنابلہ (جو حقیقت میں حنبلی تھے) ان عقائد کی نسبت امام احمد کی جانب درست نہیں سمجھتے، اس ضمن میں ان سے جدل آزما ہوتے تھے۔"[1]

سلفی حضرات نے جب خارجیت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی غرض سے اپنے عقایدِ فاسدہ کی نسبت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۴۱ھ) کی طرف کرنے لگے تو علمائے اہلسنّت کے ساتھ ہی وہ حنبلی علمائے کرام بھی ان لغیوں کی تردید میں انتہائی سرگرمی دکھانے لگے جو حقیقت میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متبع تھے۔ امام ابن جوزی حنبلی نے ان کا سب سے بڑھ کر تعاقب کیا تھا۔ مثلاً:

"حنابلہ نے چوتھی صدی ہجری میں بعینہٖ انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور انہیں سلف کی جانب منسوب کیا۔ علماء اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس سے خدا کی تجسیم و تشبیہ (خدا کا مخلوقات کی طرح جسم دار ہونا) لازم آتی ہے۔ وجہِ لزوم یہ ہے کہ جب خدا کی جانب حسّی اشارہ کیا جا سکتا ہے تو وہ ضرور مجسم ہوگا۔ حنابلہ کے انہی نظریات کی بنا پر مشہور حنبلی فقیہہ و خطیب ابن جوزی اُن کی مخالفت پر تُل گئے۔ انہوں نے کہا: امام احمد بن حنبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یہ افکار و آراء نہیں رکھتے تھے۔"[2]

مزید ابن جوزی حنبلی کی سرگرمیوں کے بارے میں موصوف نے کچھ آگے یوں وضاحت کی ہے:

---

[1] علامہ محمد ابو زہرہ: اسلامی مذاہب، ص ۲۵۱

[2] ایضاً، ص ۲۶۳

"ابن الجوزی نے اقوالِ حنابلہ (یعنی سلفی حضرات) کے ابطال میں
شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ابن جوزی نے جن اقوال کی تردید پر قلم اٹھایا
اُن کے قائل مشہور حنبلی فقیہ (سلفی)، قاضی ابو یعلیٰ (المتوفی ۴۵۸ھ) ہیں۔
قاضی موصوف اس دور میں شدید نقد و جرح کا نشانہ بنے تھے، یہاں تک
کہ بعض حنابلہ کو کہنا پڑا: وقد شان ابو یعلی الحنابلۃ شینا لا یغسلہ
ماء البحار۔ ابو یعلیٰ نے حنابلہ کو اس قدر داغدار کر دیا ہے کہ سمندروں کا
پانی بھی اُن دھبّوں کو دُور نہیں کر سکتا۔ فقیہ ابن زاغونی حنبلی (المتوفی ۵۲۷ھ)
سے بھی قاضی ابو یعلیٰ کے بارے میں اسی قسم کا قول منقول ہے۔ بعض
حنابلہ کا قول ہے: ان فی قولہ من التشبیہ ما یحار النبیہ۔"
ابو یعلیٰ کے اقوال میں تشبیہ و تجسیم کے اس قدر وافر پائے جاتے ہیں کہ ایک
دانشمند آدمی اُن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔"[1]

جب علمائے اہلسنت یعنی حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ نے ان خوارج زمانہ کا پورا
سرگرمی سے تعاقب جاری رکھا تو یہ فتنہ دب گیا اور دو سو سال تک پھر یہ آواز کہیں سے سُنائی
چنانچہ ابو زہرہ مصری نے لکھا ہے:

"چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں حنابلہ نے ان رجحانات کو نفرت و
حقارت کی نگاہ سے دیکھا، اسی وجہ سے حنبلی مسلک (سلفی حنابلہ) نظروں
سے اوجھل ہو گیا۔"[2]

خارجی حرّانی

پانچویں صدی ہجری میں یہ خارجی سلفی فتنہ مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا لیکن جب جماعت

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۶۶
[2] ایضاً، ص ۲۶۶

کے لشکر میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے اُسے بھلا کون مٹا سکتا ہے۔ چنانچہ
صدی ہجری میں اِس فتنے نے پھر سر نکال لیا۔ اِس دفعہ علامہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی
کی سرکردگی میں خارجیت کے جراثیم پھیلانے کی مہم شروع ہُوئی۔ اپنی تیز طبیعت سے
ابن تیمیہ نے کتابِ خارجیت کے موجودہ ایڈیشن میں چند اضافے کرکے، جو پہلے ہی
خا آسمان پر چڑھا دیا۔ اِس بارے میں پروفیسر ابُوزہرہ مصری نے یُوں وضاحت
ہے:

"ساتویں صدی ہجری میں یہ لوگ ایک مرتبہ پھر معرضِ ظہور میں آئے۔ یہ حیاتِ نَو ان کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے باعث حاصل ہُوئی جو سلفیت کے سرگرم داعی تھے۔ ابن تیمیہ نے بعض دیگر مسائل کی دعوت و تبلیغ کا بھی بیڑا اُٹھایا جو آپ کے عصر و عہد کی پیداوار تھے۔" [1]

علامہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے خارجیت کے متن پر وُہ بے نظیر حاشیہ
توحید کے مسئلہ کی حدود ایسی وضع کردیں کہ گزشتہ سات صدیوں کے مسلمانوں میں سے
ایک فرد کو موحّد ثابت کر دکھانا ناممکن ہوکر رہ گیا۔ جناب ابوزہرہ مصری نے اِس
بے میں یُوں وضاحت فرمائی ہے:

"سلفیہ کی رائے میں مسئلہ توحید اساسِ اسلام ہے یہ بات حق ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں۔ سلفیہ مسئلہ توحید کی جو تشریح و توضیح کرتے ہیں وُہ جمہور اہلِ اسلام کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہے مگر وُہ چند امور کو منافیٔ توحید سمجھتے ہیں جو جمہور مسلمانوں کے نزدیک توحید سے متعارض و متصادم نہیں۔ سلفیہ کے وہ مخصوص مسائل یہ ہیں:

۱۔ فوت شدگان سے توسل کرنا وحدانیتِ خداوندی کے منافی ہے۔

۲۔ روضۂ نبوی کے رُوبرُو ہوکر اس کی زیارت کرنا توحید کے خلاف ہے۔

---

[1] ابوزہرہ: اسلامی مذاہب، ص ۲۵۶

۳۔ روضۂ نبوی کے اِردگرد دینی شعائر و احکام (مثلاً طواف) کا بجالانا توحید کے منافی ہے۔

۴۔ کسی نبی یا ولی کی قبر کے اُوپر خدا سے دعا مانگنا، خلافِ توحید ہے۔

۵۔ سلف صالحین کا مذہب یہی تھا، اِس کی خلاف ورزی کرنیوالے بدعات کے مرتکب اور توحید کے مخالف ہیں۔"[1]

وہ محبوبِ پروردگار جو باعثِ ایجادِ کائنات اور وجہِ قیامِ مخلوقات ہے، اُن کے روضۂ مطہرہ کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حنبلی (المتوفی ۷۲۸ھ) مبلغ خارجیت نظریئے کو مزید یوں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

"ابن تیمیہ اسی لیے فرماتے ہیں کہ از راہِ تبرک روضۂ نبوی کی زیارت جائز نہیں اس لیے کہ آنحضور نے اپنی قبر کو مسجد بنانے سے روک دیا تھا، جس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ آپ کا روضہ زیارت گاہِ خلائق نہ بن جائے۔"[2]

پروفیسر ابُوزہرہ مصری نے موصوف کے اِس نظریہ کے بارے میں یوں اپنا عندیہ ظاہر کیا ہے:

"مسئلہ زیرِ نظر (زیارتِ روضۂ انور) میں امام ابن تیمیہ کا موقف جمہور اہلِ اسلام کے خلاف ہے بلکہ اُن کے نظریات کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ قبورِ صلحا اور اُن کی منت و زیارت کے مسئلہ میں ہم کسی حد تک ابن تیمیہ کے ہمنوا ہیں مگر روضۂ نبوی کی زیارت کے مسئلہ میں ہم اُن کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔"[3]

موصوف کی اس کتاب کے مترجم لیعنی لائلپور زرعی یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۶۰

[2] ایضاً: ص ۲۸۲

[3] ایضاً: ص ۲۸۲، ۲۸۳

پروفیسر جناب غلام احمد حریری نے روضۂ نبوی کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حرّانی
متوفی ۷۲۸ھ کے نظریے کی حمایت اور پروفیسر ابوزہرہ مصری کے موقف پر، جیسا کہ
مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، چیں بجبیں ہو کر یوں تنقید کی اور دھاندلی مچائی ہے:

"مصنف کا یہ قول مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے (یعنی جمہور اہلِ اسلام کے
خلاف بتانا)۔ حدیثِ نبوی "لا تشد والرحال" کے پیشِ نظر محدثین
کی اکثریت امام ابن تیمیہ کی ہمنوا ہے اور تبرک و تیمن کے نقطۂ نظر سے
روضۂ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔" ۱

چونکہ برٹش گورنمنٹ کے عہدِ اقتدار سے آج تک مدعیانِ اسلام کو ایسی آزادی راست
حاصل ہے کہ خدائی کے دعویدار بن بیٹھو یا نبوت کے مدعی ہو جاؤ، باری تعالیٰ شانہٗ کو
جھوٹا ٹھہراؤ یا انبیائے کرام کو چماروں سے بھی ذلیل کہتے پھرو۔ سرورِ کون و مکاں اور عالمِ علومِ
اولین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز میں خیال لانا گدھے بیل کے تصور میں ڈوب
جانے سے بدتر اور شرک بتاؤ یا اُن کے کثیرہ، وافرہ، مختصہ علومِ غیبیہ کو بچوں، پاگلوں
اور جانوروں کے معلومات کے برابر ٹھہراؤ، نبیِ آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل
زمانہ آخری نبی ہونے کا انکار کرتے پھرو یا اُن کے جملہ اقوال و افعال پر خطِ تنسیخ کھینچ کر
بھروسے سے اُن کے قابلِ حجت یا لائقِ استناد ہونے ہی کا انکار کر بیٹھو، کوئی پوچھنے والا
بھلا کون ہے؟ عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفوی کا دفاع کرنے کی کسی صاحبِ اقتدار کو
ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟ ایسے پُرفتن دور میں کون کسی کی زبان پر پہرہ بٹھاتا
ہے؟ ہاں جس وقت قرآن و حدیث سے غیر اسلامی عقائد و نظریات کو اسلامی عقائد کا جامہ پہنایا
جانے لگا، وہاں دلائل کے میدان میں ایسی دھاندلی کا راز فاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے
اور علمائے اسلام نے ایسا دفاع ہر دور میں مثالی طور پر کیا ہے۔

پروفیسر غلام احمد حریری نے چونکہ یہاں حدیث "لا تشدوا الرحال" سے است

---

۱ غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۸۲

کر کے ایک بہت بڑا دعویٰ کر دیا ہے جو سراسر محتاجِ دلیل ہے۔ موصوف نے دعویٰ تو کر دیا ہے کہ محدثین کی اکثریت علامہ ابن تیمیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کی ہمنوا ہے اور اس غرض سے روضۂ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔ لیکن ہمیں فاضل مترجم کے اس دعویٰ سے اختلاف ہے کیونکہ اس حدیث کے پیشِ نظر محدثین نے روضۂ نبوی کی زیارت کو ہرگز ناجائز نہیں کہا اور نہ علامہ ابن تیمیہ حرّانی کی قطعاً ہمنوائی کی۔ موصوف اگرچہ محدثین کی ہمنوائی کا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ انھیں دلائل کے میدان میں محدثین کے مبارک طبقہ میں سے کوئی ایک بھی قابلِ ذکر ہستی ایسی نہ ملے گی جس نے علامہ ابن تیمیہ کی ہمنوائی کی ہو ماسوائے گروہِ خوارج کے جو اسلامی عقاید و نظریات کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج ثابت ہوتا رہا ہے۔

مقابرِ بزرگانِ دین کی زیارت اور اُن کے توسّل کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حرّانی کا نظریہ یہ تھا:

"جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ قبروں کی مٹّیں قضائے حاجات کا ذریعہ ہیں! اُن سے ازالۂ تکلیفات ہوتا، رزق کے دروازے کھلتے اور شہر مامون و محفوظ رہتا ہے، وہ مشرک ہونے کی وجہ سے واجب القتل ہے۔"[1]

موصوف کے اس نظریہ کے بارے میں پاکستان کے مشہور اہلِ قلم اور حق و انصاف کے عظیم علمبردار، سیدی وسندی و مرشدی حضرت مفتیِ اعظم ہند شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) کی زندہ یادگار، مخدومی و مکرمی پروفیسر محمد مسعود احمد زید مجدہٗ یوں رقمطراز ہیں:

"ابن تیمیہ نے ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء میں اولیاء و انبیاء کے مزارات پر حاضری کے خلاف ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس کی پاداش میں کافی عرصہ بعد ۷۲۶ھ/۱۳۲۶ء میں سلطانِ وقت نے اِن کو قید کیا اور اُسی قید و بند میں انتقال ہوا

---

[1] غلام محمد حریری، اسلامی مذاہب، ص ۲۸۱

ابنِ تیمیہ مزارات پر حاضری کے علاوہ استغاثہ کے بھی خلاف تھے۔ چنانچہ یوسف النبہانی نے اپنی کتاب "شواھد الحق فی الاستغاثۃ بسید الخلق" میں ابنِ تیمیہ کے اِس عقیدے کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔"[۱]

سلفی حضرات کا طرزِ عمل تو یہ تھا کہ وُہ خود کو حنبلی ظاہر کر کے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد و نظریات کی نشر و اشاعت کو اپنا نصب العین بنا کر خارجیت کو پھیلانے میں مصروف رہا کرتے اور فقہاء و محدثین و متکلمینِ اُمتِ محمدیہ پر تنقید کرنے سے باز رہتے تھے۔ علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) پہلے مبلغِ خارجیت ہیں جنھوں نے گروہِ اکابر کے بڑے بڑے علمائے کرام و علمائے عظام حتیٰ کہ ائمہ دین تک کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ کسی بڑی سے بڑی اور مسلّم ہستی کی شہرت کو داغدار کرنے اور چھلنی بنانے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ علامہ ابنِ تیمیہ کی اِس روش کے بارے میں جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب یوں وضاحت کرتے ہیں:

"ابنِ تیمیہ صوفیائے کرام اور متکلمین سے بھی نالاں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اِنھوں نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں (المنقذ من الضلال اور احیاء العلوم الدین) پر بڑی جرح کی ہے۔ یہ وہی امام غزالی ہیں جن کی شان میں شیخ ابوالفضل نے گستاخانہ کلمات کہے تھے تو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فوراً اُس کی مجلس سے اُٹھ کر چلے آئے تھے اور معلوم ہے کہ مجدد الف ثانی کون بزرگ تھے؟ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے: ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان

جب تک فیضی نے معافی نہیں مانگ لی، آپ اُس کی مجلس میں تشریف نہیں لے گئے۔ اُنھیں امام غزالی اور دوسرے صوفیہ کرام کے متعلق ابنِ تیمیہ کہتے ہیں

---

[۱] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۷۰ء، ص ۹۸

"صوفی اور متکلمین ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔"[1]

علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے یوں ان کی سوانح حیات بیان کی ہے:

"مگر ایک زمانہ وہ آتا ہے جب اختلاف رائے ایک خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور علمائے کرام کے طبقے سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جن کے افکار و خیالات ملت اسلامیہ میں غیر مختتم تفریق کا باعث ہوئے۔

اس سلسلے میں ہم ایک عالم کا ذکر کریں گے یعنی تقی الدین ابو العباس احمد بن شہاب الدین عبد الحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ الحرانی الحنبلی (۶۶۱ھ - ۷۲۸ھ) یہ عالم بلا کے ذہین و فطین تھے۔ سترہ برس کی عمر میں فتویٰ نویسی کا آغاز کیا تقریباً پانچ سو کتابوں کے مصنف ہوئے۔ جب ابن تیمیہ نے مناظروں میں اپنے افکار و خیالات کا آزادانہ اظہار کیا تو راسخ العقیدہ علمائے اہلسنت وجماعت میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور وہ ان کے سخت مخالف ہو گئے یہاں تک کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور بعض علماء نے تو یہ کہہ دیا کہ جو ابن تیمیہ کو ملحد نہ سمجھے وہ خود ملحد ہے۔"[2]

علامہ ابن تیمیہ کی تنقید کا نشانہ صرف ائمۂ دین ہی نہیں ہے بلکہ حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر و اعاظم بھی اس اندھا دھند تیر اندازی و ناوک فگنی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

"ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ابن تیمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے الصالحیۃ الجبل کی مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر کہا "حضرت عمر بن الخطاب نے بہت سی غلطیاں کیں"۔ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواخذ مظہری، ص ۹۷

[2] ایضاً، ص ۹۹

کہ اُنھوں نے کہا: "علی بن ابی طالب نے تین سو غلطیاں کیں۔" [1]

ابن تیمیہ حرانی کے عقائد و نظریات کی تردید تو کتنے ہی اکابر اہلسنت نے کی اور متاخرین علمائے اہلسنت نے اُن کے نظریات سے ہمیشہ برأت کا اعلان ہی کیا اور اُنھیں دین و مذہب کی موت قرار دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ اُن عقاید سے بچنے کی تلقین ہی کرتے رہے۔ اہلسنت کے مایۂ ناز محدث شیخ احمد شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن تیمیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کے مخصوص عقاید و نظریات کے پیش نظر شرعی فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے:

"ابن تیمیة عبد خذله الله واضلّه واعماه واصمّه واذلّه وبذلك صرح الائمة الذين بينوا فساد احواله وكذب اقواله ومن اراد ذلك فعليه بمطالعة كلام الامام المجتهد المتفق على امامته وجلالته وبلوغه مرتبة الاجتهاد ابی الحسن السبكی وولده التاج والشیخ الامام العز ابن جماعة واهل عصرهم وغيرهم من الشافعية والمالكية والحنفية ولم يقصر اعتراضه على متاخری الصوفية بل اعترض على مثل عمر بن الخطاب وعلی بن ابی طالب رضی الله عنهما كما ياتی والحاصل

ابن تیمیہ ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے رسوا کیا، گمراہ کیا، اندھا کیا، بہرا کیا اور ذلیل کیا۔ اسی لیے ائمہ دین نے اس امر کی صراحت کی اور اس کے فسادِ احوال اور جھوٹے اقوال کو بیان کیا۔ جو تصدیق کا ارادہ رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ اس امام و مجتہد کی تصانیف کا مطالعہ کرے جن کی امامت، جلالت اور مرتبۂ اجتہاد تک رسائی پر سب کا اتفاق ہے یعنی شیخ ابوالحسن سبکی نیز ان کے فرزند ارجمند علامہ تاج الدین سبکی اور اماموں کے شیخ حضرت عز بن جماعہ اور ان کے معاصرین اور دیگر علمائے شافعیہ مالکیہ اور حنفیہ وغیرہ کی۔ ابن تیمیہ نے صوفیہ متاخرین پر اعتراض کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے حضرت عمر بن خطاب اور علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر صحابہ پر بھی اعتراضات کیے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اس کا

[1] [illegible]

ان لا يقام لكلامه وزن بل يرمى في كل وعر وحزن و يعتقد فيه انه مبتدع ضال ومضل جاهل غال عامله الله بعدله واجارنا من مثل طريقته وعقيدته وفعله آمين[۱]

کلام کوئی وزن نہیں رکھتا بلکہ ویرانے میں پھینکے کے لائق ہے۔ ابن تیمیہ کے بارے میں عقیدہ رکھنا چاہیے کہ وہ بدعتی گمراہ، گمراہ کن، جاہل اور حد سے نکل جانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ اپنے عدل سے معاملہ کرے اور ہمیں اُس کے جیسے طریقے اور عقیدے سے بچائے آمین۔

مزید فخر المحدثین آگے چل کر ابن تیمیہ، اُن کی تصانیف اور اُن کے متبعین کے بارے میں لوگوں کو اُن کی خیر خواہی کے پیش نظر یوں فہمائش کرتے اور حکیم شرح بیان فرماتے ہیں:

"وایاك ان تصغى الى ما في كتب ابن تيمية وتلميذه ابن القيم الجوزية وغيرهما ممن اتخذ الهه هواه واضله الله على علم وختم على سمعه وقلبه وجعل على بصره غشاوة فمن يهديه من بعد الله وكيف تجاوز هؤلاء الملحدون الحدود وتعدوا الرسوم وخرقوا سياج الشريعة والحقيقة فظنوا بذلك انهم على هدى من ربهم وليس كذلك بل هم على اسوأ الضلال واقبح

ابن تیمیہ اور اُس کے شاگرد ابن قیم جوزی وغیرہ کی کتابوں پر کان رکھنے سے بچ کیونکہ اُنھوں نے اپنی خواہش نفسانی کو معبود بنا لیا تھا اور خدا نے اُس کو علم کے ذریعے گمراہ کیا اور اُس کے کان اور دل پر مُہر کی اور اُس کی آنکھ پر پردہ ڈال۔ پس کون ہے جو اس کے بعد اسے ہدایت دے۔ ان ملحدوں نے کس طرح اسلامی حدود سے تجاوز اور رسوم سے تعدی کی اور شریعت وحقیقت کی چادر کو پھاڑ کر بھی گمان کیا وہ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں حالانکہ وہ راہِ راست پر نہیں ہیں بلکہ وہ بدترین گمراہی اور قبیح ترین خصائل اور انتہائی بدنصیبی"

---

[۱] شہاب الدین بن حجر مکی، امام۔ فتاویٰ حدیثیہ، ص ۹۹

لضلال والاثم المقصود الخسران واسهى الكذب و البهتان فخذل اللہ متبعهم وطهر الارض من امثالهم[1]

خسارے اور جھوٹ بہتان میں مبتلا ہیں۔ اللہ اُن کے پیروکاروں کو رُسوا کرے اور اُن جیسے عقیدے رکھنے والوں سے زمین کو پاک کرے۔

خارجی وہابی

ساتویں صدی میں اٹھا ہُوا یہ خارجیت کا فتنہ آخر کار علمائے اہلسنت شکر اللہ سعیہ مساعی جمیلہ سے ختم ہو کر رہ گیا۔ علامہ ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن قیم وغیرہ کی تصانیف حد تک ناپید ہو گئیں۔ بارھویں صدی میں یہ ناسُور پھر چوتھی دفعہ اُبھر آیا۔ نجد میں محمد بن عبد نامی ایک عالم نے خوارج کے مذہب کو ابن تیمیہ کی تصانیف سے حاصل کر کے اس کی واشاعت شروع کر دی۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اس سلسلے میں یُوں وضاحت کرتے ہیں:

”اتباعِ محمد بن عبد الوہاب نے مسلک ابن تیمیہ کو ازسرِ نو زندگی بخشی۔ اس تحریک کے بانی و رئیس محمد بن عبد الوہاب تھے جن کی وفات ۱۷۸۷ء میں ہُوئی۔ محمد بن عبد الوہاب تصانیف ابن تیمیہ سے مستفید ہو چکے تھے۔ انھوں نے بنظرِ غائر اُن کتب کا مطالعہ کیا اور اُن کو فکر و نظر کی حدود سے نکال کر عمل کے دائرہ میں داخل کیا۔ جہاں تک عقاید کا تعلق ہے اِنھوں نے عقاید ابن تیمیہ پر ذرّہ بھر اضافہ نہ کیا اور اُن کو جُوں کا تُوں اپنا لیا۔ البتہ اِنھوں نے امام ابن تیمیہ کی نسبت زیادہ تشدد سے کام لیا اور ایسے عملی امور کو ترتیب دیا، جن سے ابن تیمیہ نے تعرّض نہیں کیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امور اُن کے عصر و عہد میں مشہور نہ تھے۔“[2]

---

[1] احمد شہاب الدین بن حجر مکی، محدث، فتاوی حدیثیہ، ص ۱۴۴

[2] غلام احمد حریری، اسلامی مذاہب، ص ۲۸۸

فیسر محمد مسعود صاحب نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ابتدائی حالات یوں تحریر کیے ہیں:

"شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی عیینہ کے ایک علمی گھرانے میں ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا اور سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے استغاثہ کے خلاف آواز بلند کی، نتیجۃً معاصرین علماء اور خود اُن کے والد بزرگوار کی مخالفت کی وجہ سے ابتدا میں ابن عبدالوہاب کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی، لیکن جب ۱۱۵۲ھ/۱۷۴۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو اس تحریک میں ذرا گرمی پیدا ہو گئی۔"[١]

اس کے ساتھ ہی موصوف نے تحریک وہابیت کا ابن تیمیہ سے تعلق اور دیگر امور کا تاریخی پر ذکر کیا ہے:

"تحریک وہابیت کے بانی محمد بن عبدالوہاب نجدی تھے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ تحریک، بانی تحریک کے والد بزرگوار کے نام پر معنون ہوئی جو اس تحریک کے آغاز کے بعد سے مرتے دم تک اس کے مخالف رہے اور اسی بیزاری کے عالم میں اُن کا انتقال ہوا۔ ابن عبدالوہاب، ابن تیمیہ سے پوری طرح متاثر ہیں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ جو چیز ابن تیمیہ نے نظری طور پر پیش کی تھی ابن عبدالوہاب نے اس کو ایک عملی جامہ پہنایا تو بے جا نہ ہوگا۔

ابن تیمیہ اور فرقہ وہابیہ کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں: "ہمیں معلوم ہے کہ وہابی فرقے کے بانی کا تعلق دمشق کے حنبلی علماء سے تھا اور اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس نے اُن کی کتابوں سے استفادہ کیا بالخصوص ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن القیم الجوزی کی تعلیمات سے، اس لیے وہابی عقیدے کے اصول وہی ہیں جن کے لیے یہ حنبلی عالم عمر بھر لڑتے رہے۔" دوسری جگہ لکھتے ہیں: "آپ (ابن تیمیہ)

---

١. محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۶۶

کی پُرجوش تصانیف کے نتیجے میں محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک اصلاح[۱]
وہابیہ نے بھی اوّلین خوارج کی طرح معمولی باتوں پر بھی مسلمانوں کو اسلام سے خارج
ماننا اور مشرک ٹھہرانا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر ابوزہرہ مصری نے ان حضرات
کی مخصوص ذہنیت کا یُوں تجزیہ کیا ہے ؛

"وہابیہ کی رائے میں عبادت کا مقصد صرف یہی نہیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں
چند ارکان ادا کیے جائیں جیسا کہ ابن تیمیہ کا خیال ہے ، بخلاف ازیں اسلامی
اخلاق و عادات کا اپنانا بھی ایک مسلمان کے لیے ازبس ناگزیر ہے ۔ یہی
وجہ ہے کہ وہ تمباکو نوشی کو حرام تصور کرتے اور اس میں تشدد سے کام لیتے تھے
بلکہ اس سے بڑھ کر عام وہابیہ تمباکو نوش اور مشرک میں کوئی فرق نہیں
سمجھتے ۔ گویا وہ اُن خوارج کی طرح تھے جو مرتکب کبائر کی تکفیر کرتے تھے"[۲]

اپنے ساختہ عقائد و نظریات کی صحت کا وہابیہ کو بھی اپنے پیشرو خوارج کی طرح ایسا
ہی یقین تھا کہ ساری اُمت کو اسلام سے خارج قرار دینا آسان سمجھتے تھے لیکن اپنے مخصوص
نظریات کو کسی مرحلے پر بھی قابلِ اصلاح ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے ۔ دوسروں کو
تشدد کے ذریعے اپنے عقائد کی تلقین دینا اُن کے مسلک کا اوّلین رُکن تھا ۔ پروفیسر ابوزہرہ
مصری اس سلسلے میں یُوں وضاحت کرتے ہیں ؛

"اس فرقہ کے علماء اپنے آراء و افکار کو مبنی بر صحت و ثواب و دُور از خطا
تصور کرتے ہیں ۔ بخلاف ازیں دوسروں کے افکار اُن کی نگاہ میں مجموعۂ اغلاط
اور ناقابلِ صحت ہیں ۔ اس سے بڑھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ قبہ سازی اور اُن کے
اردگرد طواف کرنا صنم پرستی کے مترادف ہے ۔ اُن کے یہ نظریات ، افکارِ
خوارج سے ہم آہنگ ہیں ، جو اپنے مخالفین کی تکفیر کرتے اور اُن سے نبرد آزما

---

۱ محمد مسعود احمد ، پروفیسر ، مواعظ مظہری ، ص ۹۸ ، ۹۹

۲ غلام احمد حریری ، اسلامی مذاہب ، ص ۲۰۸

ہوتے تھے۔ جن دنوں وہابیہ صحرا نشین تھے ان کی تبلیغ و دعوت سے چنداں خطرہ نہ تھا، جب سعودی خاندان بلادِ عرب میں برسرِ اقتدار ہوا تو ان کو دوسرے لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آئے، جس سے خطرہ بڑھ گیا۔ ؎۱

وہابیہ کو قبر شکنی میں بڑا مزہ آتا تھا اور اِس شرمناک حرکت کو وہ دین کی اہم ترین خدمت، عقیدہ کا تحفظ اور اپنا عظیم کارنامہ شمار کرتے تھے۔ پروفیسر ابوزہرہ مصری نے اُن کے اِس مشغلے کا ذکر یوں کیا ہے:

"شہر ہو یا دیہات، جہاں ان لوگوں کا بس چلتا وہاں پہنچتے اور قبے گرا دیتے۔ اِس کی حد یہ کہ بعض یورپین مصنفین اِن کو "معبد شکن" کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ لقب مبالغہ پر محمول ہے۔ اِس لیے کہ قبہ جات کو معبد کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ غالباً یہ لوگ اُن مساجد کو مسمار کر دیتے تھے، جن میں قبے ہوا کرتے تھے۔" ؎۲

وہابیہ نے اِسی پر بس نہیں کر دی تھی۔ بلکہ صحابۂ کرام اور دیگر بزرگانِ دین کے مزارات کو مسمار کرنے کی خدمت بھی اُنھوں نے بڑے ذوق و شوق سے انجام دی۔ شعائر اللہ کی اِس طرح پامالی کو وہ اپنی ساختہ توحید کی معجون کا جزوِ اعظم سمجھتے تھے اور اپنے اِس کارنامے پر وہ نازاں تھے کہ دنیا سے کفر و شرک کا نام و نشان مٹا رہے ہیں حالانکہ جس شرک سے وہ دوسروں کو بچانا چاہتے تھے وہ خود اُن پر ہی مسلط تھی لیکن خوارج کی فطرت شروع سے ہی یہ چلی آ رہی تھی کہ وہ دوسروں کی آنکھوں میں تنکے تلاش کرنے کی کھوج میں لگے رہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے شہتیر دیکھنے سے وہ ہمیشہ ہی قاصر رہے اور تا حال قاصر ہیں۔ مثلاً:

"وہابیہ کے تشدد کی یہ (قبر شکنی) آخری حد نہ تھی بلکہ اِس سے

؎۱ غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۹۰، ۲۹۱

؎۲ ایضاً، ص ۲۸۹، ۲۹۰

ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے مقبروں کو مسمار کر دیا۔ جب وہابی عرب میں دوبرسرِ اقتدار آئے تو صحابہ کے مقبرے گرا کر ان کو زمین کے برابر کر دیا۔ اب صرف اشارات باقی رہ گئے جن کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں صحابی کی قبر ہے۔ قبروں کو زمین سے ہموار کرنے کے بعد انھوں نے اِس پابندی کے ساتھ اُن کی زیارت کی اجازت دے دی کہ زائر صرف السلام علیکم کہے اور بس۔[1]

وہابیوں کی قبر شکنی اور مقابر کی پامالی کے سلسلے میں پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے مورخین کے حوالے سے، مورخانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں ہے :

"ابن عبدالوہاب اور اُن کے متبعین نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے جان و مال کو اپنے لیے حلال کیا بلکہ مرحومین صحابہ اور صلحائے امت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قبروں کو بے دریغ مسمار کیا۔ چنانچہ ابن عبدالوہاب نے اُن قبروں کو منہدم کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا جو مسلمانوں کی عقیدت و محبت کے نشان تھے۔ مثلاً، مقام جبیلہ پر حضرت زید بن خطاب (جو جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے قبر شریف پر اپنے ہاتھ سے کدال مارا اور دھڑا دھڑ گرا کر زمین کے ہموار کر دیا۔"

اسی طرح جب ۸ محرم ۱۲۱۸ھ / ۳۔۱۸۰۳ء کو سعود بن عبدالعزیز فاتحانہ انداز سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو "اہلِ نواحی قبوں اور مشرکیہ مشاہد (؟) کے انہدام پر مامور کیے گئے۔ سعود نے جنتیس دن مکہ مکرمہ قیام کیا اور اس دوران مسلمان (متبعین ابن عبدالوہاب) قبوں کو گراتے رہے تا آنکہ مکہ مکرمہ کے تمام مشاہد اور قبے برابر کر دیے گئے۔"

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۹۰

"کعبے کے جواہر اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیئے گئے، قبے گرا دیئے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے" بلکہ ایک دل ہلا دینے والی خبر ولفرڈ بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام میں ملتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے: "ہر جگہ قبے مسمار کر دیئے گئے اور سرزمین حجاز کے مقدس مقامات اُس (ابن عبدالوہاب) کے متبعین کے قبضے میں آ گئے تو صوفیہ و اولیاء کے قبے، حجاج کرام جن کی صدیوں سے عزت و احترام کرتے چلے آئے تھے زمین کے برابر کر دیئے گئے..... ان حرکتوں سے عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور وہابیوں کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا۔"[۱]

خوارج کی فطرت، زبانِ رسالت سے "یقتلون اھل الاسلام و یدعون اھل الاوثان" بیان ہوئی تھی کہ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کیا کریں گے۔ وہابیہ نے بھی اپنی خارجیت کا مکمل ثبوت پیش کرتے ہوئے مسلم کشی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور کبھی اُن بانکے جوانمردوں کی تلوار غیر مسلموں کے خلاف ذرا اٹھنے پائی۔ تاریخ اقوام کے اعمال کا مرقع ہے، زمانے سے بڑھ کر کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ ہر شخص اس ارشادِ نبوی اور عملِ وہابیہ کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتا تو کل بروزِ قیامت خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ خیر وہابیہ جب مسلمانوں کی جان و مال اور ننگ و ناموس سے خوب کھیل رہے تھے اور اس کی تاویل یُوں بیان کیا کرتے تھے:

"جب عالم و عامی نے ابنِ عبدالوہاب پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں اور اُن کا مال و دولت لوٹ رہے ہیں تو اُن کے متبعین نے جواب دیا کہ حاشا وکلا، ہم مسلمانوں کا قتلِ عام نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم تو اُن مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں جو اعمال و افکار کی وجہ سے مشرک و کافر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس طرح صفائی پیش کی گئی..... شیخ رحمہ اللہ نے

---

[۱] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۴۹، ۵۰۔

صرف اُن صنم پرستوں کی تکفیر کی جواولیاء اور نیکوکار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں جنھوں نے حجت کے ثبوت اور طریقِ حق کی وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب اور اللہ کا شریک ٹھہرایا اور پھر اُنھوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی تب شیخ نے اُن سے قتال کیا اور اُن کا خون بہایا اور اُن کا مال لوٹا۔" اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے رہ گئے ہیں جو زندہ بچنے کے قابل ہیں؟ شاید لاکھوں میں معدودے چند بچیں تو بچیں۔" [1]

وہابیہ چونکہ اپنے سوا جملہ مدعیانِ اسلام کو کافر و مشرک سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نام نہاد اصطلاحی مشرکوں کا خون بڑے ذوق و شوق سے بہایا کرتے تھے۔ چنانچہ الدرر السنیہ اور ردالمحتار کے حوالے سے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ان حضرات کی فطرت اور ملتِ مسلم کشی کو یُوں لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے:

"ابنِ عبدالوہاب اپنے متبعین کے علاوہ اِس آسمان کی نیلی چھت کے نیچے اُن تمام مسلمانوں کو علی الاطلاق کافر و مشرک سمجھتے تھے جو اُن کی اطاعت و پیروی سے گریز کرتے تھے۔ اِس لیے اُن کا خون بہانے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ بات نبی کو زیب دیتی ہے مگر کسی مصلح کی یہ کیفیت کم علمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔" [2]

وہابیہ کی تلوار مسلمانوں کے خلاف کیوں اُٹھتی رہی، اِس کا سب سے بہتر جواب تو زیرِ نظر رسالت میں موجود ہے لیکن اِس المناک طرزِ عمل پر ایک فکر انگیز اور اچھوتا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

"تاریخِ اسلام میں اِس قسم کے بہت سے دلدوز سانحات سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا ہے مگر یہاں

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواعظ مظہری، ص ۴۳۔
[2] ایضاً، ص ۷۰۔

ڈنکا اس شخص کا ہے جو پیغمبرانہ آن بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت
دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرانہ صفات کو تلاش کیا جائے
اور اُسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس
نظر آتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود
ونصاریٰ کے خلاف آمادۂ پیکار رہے۔ مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے!
محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کے متعلق دعویٰ تو یہی تھا کہ شرک و بدعت کے خلاف ہے
لیکن حقیقت کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ وہابیوں کا طرزِ عمل اصلاح کی بجائے برعکس ثبوت پیش
کرتا ہے۔ اصلاح کی جگہ فساد کیا۔ مسلمانوں کو ان سے کوئی تقویت پہنچنے کی بجائے افتراق
وانتشار ملا۔ مسلمانوں کا خون اِن کے ہاتھوں بہا، ننگ و ناموس اور مال و دولت پر
دست درازی ہوئی۔ غرضیکہ اِس گروہ کا وجود گویا ڈاکوؤں اور لٹیروں کا جتھا ہو کر رہ گیا
جس سے مسلمانانِ عالم کے جذبات اِن لوگوں کے خلاف بھڑک اُٹھے اور یہ قدرتی و فطرتی
بات تھی۔ وہابیوں نے قوت حاصل کرنے کی ہر ممکن اور گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کرتے وقت
بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ مثلاً:

"ابن عبدالوہاب نے جن مسائل کے متعلق آواز اٹھائی اُن میں سے بعض
یہ ہیں۔ امکانِ کذب، امکان نظیر، استغاثہ، استعانت، علم غیب،
الحلف بغیر اللہ، زیارت القبور وغیرہ۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ تحریک مروجہ بدعات
اور اعمالِ شرکیہ کے خلاف ایک مخلصانہ کوشش ہے مگر بعض تاریخی واقعات
کی روشنی میں باطن، ظاہر سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً جب ابن عبدالوہاب
نے امیر عیینہ کو اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو ان الفاظ میں
انی ارجوا ان انت قمت بنصر لا الٰہ الا اللہ ان یظہرک اللہ تعالیٰ
وتملک نجدا واعرابہا" اگر تم لا الٰہ الا اللہ کی مدد کے لیے

لہ محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۴۳، ۴۰۔

آمادہ ہو جاؤ تو میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں غالب کرے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھ میں ہو گی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ کارِ خیر کی طرف بلایا جا رہا ہے تو یہ لالچ کیوں دی جا رہی ہے کہ نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھ میں ہو گی؟ حالانکہ اُس وقت اِن علاقوں پر کوئی مشرک و کافر حکمران نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابن عبد الوہاب اپنے مخالفین کو کافر اور واجب القتل تصور کرتے تھے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے تحریص و ترغیب کا یہ انداز موزوں نہیں ہے۔

جب محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ/ ۱۷۹۲ء) نے درعیہ کے امیر محمد بن سعود کو اپنی تحریک کا ساتھ دینے کی دعوت دی تو اُس نے دو شرطیں عائد کی تھیں (۲) دوسری یہ تھی کہ میں اہلِ درعیہ سے فصل کے وقت کچھ مقررہ محصول وصول کیا کرتا ہوں، آپ اس سے نہیں روکیں گے۔ علمبردارِ توحید و سنت اور ماحیِ شرک و بدعت ہونے کا دعویٰ کرنے والے محمد بن عبد الوہاب نجدی نے اس کا جو جواب دیا وہ تبصرہ کے ساتھ پروفیسر مسعود احمد صاحب سے سُنیے:

"رہی دوسری شرط، سو انشاء اللہ تمھیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔"

کس پر فتوحات؟ کیسی غنیمت؟ انھیں مسلمانوں پر فتوحات اور انھیں مسلمانوں کی دولت جن کو مشرکین و کفار کے زمرے میں شمار کر کے اُن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ ستم رسیدہ مسلمانوں کی متاعِ عزیز کو غنیمت سمجھ کر کھانا اور کھلانا کیسی ستم ظریفی ہے؟ یہی نہیں بلکہ جب ابن عبد الوہاب کو ذرا قوت حاصل ہو گئی تو پھر رنگ کچھ اور ہو گیا۔ چنانچہ جب حاکم ریاض، دہام بن دواس نے ابن عبد الوہاب کے پیروؤں کے معتقدات سے

مسعود احمد، پروفیسر: مواعظ مظہری، ص ۷۶، ۷۰۔

تنگ آکر ان پر سختی کی تو ابن عبدالوہاب نے اور جدال و قتال کا حکم صادر فرمایا۔ بس پھر کیا تھا، مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔" [1]

تحریکِ وہابیت کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے موصوف کیا پتے کی بات کہہ گئے ہیں:

"ضمناً ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتا چلوں اور وہ یہ کہ تحریکِ وہابیت نے بعض مسلمانوں کو اکابرینِ ملت کی جناب میں بہت بیباک بنا دیا ہے۔ حیرت و تعجب اس بات پر ہے کہ اکابرین اور صلحائے امت پر اعتراضات اور تنقیدات اُن حضرات کی جانب سے ہوتی ہے جن کی نظر سطحیت کی غماز ہے اور اعتراض اس انداز سے کرتے ہیں گویا شعور ہے تو بس اُنھیں کے پاس۔" [2]

محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) کے بارے میں اہلسنت و جماعت کے مایۂ ناز فقیہ علامہ محمد امین ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) رحمۃ اللہ علیہ یوں رقمطراز ہیں:

"كما وقع في زماننا في اتباع عبد الوهاب الذين خرجوا من نجد وتغلبوا على الحرمين وكانوا ينتحلون مذهب الحنابلة لكنهم اعتقدوا انهم هم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشركون واستباحوا بذالك قتل اهل السنة وقتل علمائهم حتى كسر الله شوكتهم وخرب بلادهم وظفر بهم عساكر

جیسا کہ ہمارے زمانے میں (ابنِ) عبدالوہاب کے متبعین میں واقع ہوا، جو نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر قابض ہو گئے۔ اپنے آپ کو حنبلی مذہب کا پیرو کار ظاہر کرتے تھے، حالانکہ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلمان بس وہی ہیں اور اُن کے عقاید سے اختلاف رکھنے والے سب مشرک ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے اہلسنت و جماعت اور اُن کے علماء کو قتل کرنا مباح ٹھہرایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طاقت توڑ دی، مسلمانوں کے لشکروں کو

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواعظ مظہری، ص ۷۱

[2] ایضاً: ص ۷۰

والمسلمین عام ثلث وثلثین ومائتین   اُن پر فتح دی یعنی ۱۲۳۳ھ میں۔
والفٹ لله[1]

وہابیہ کے بارے میں دیوبندیوں کے بہت بڑے عالم، براہین قاطعہ جیسی کتاب کے
مصنف مولوی خلیل احمد انبیٹھوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء) نے سوال و جواب کے طور پر
اپنی اور اپنی جماعت کا موقف یوں بیان کیا ہے:

"سوال: محمد بن عبدالوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن
کے مال و آبرو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان
میں گستاخی کرتا تھا۔ اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اور کیا سلف
اور اہلِ قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے
اور خوارج ایک جماعت ہے شوکت والی، جنہوں نے امام پر چڑھائی کی تھی
تاویل سے، کہ امام کو باطل یعنی کفر یا ایسی معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو
واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری
عورتوں کو قیدی بناتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں، اُن کا حکم باغیوں کا ہے۔ پھر
یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم اُن کی تکفیر صرف اس لیے نہیں کرتے کہ یہ فعل تاویل
سے ہے، اگرچہ باطل ہی سہی۔ اور علامہ شامی نے اس کے حاشیہ میں
فرمایا ہے، جیساکہ (مثل خوارج) ہمارے زمانے میں عبدالوہاب کے تابعین
سے سرزد ہوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوئے اپنے کو حنبلی
مذہب بتلاتے تھے لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے
عقیدہ کے خلاف ہو، وہ مشرک ہے۔ اور اسی بنا پر اُنھوں نے اہلسنت اور
علمائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے

---

[1] ابن عابدین شامی، فقیہہ، ردالمحتار، جلد سوم، ص ۳۰۹

اُن کی شوکت توڑ دی۔" لہ

دیوبندی جماعت کے دُوسرے جیّد عالم، دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے وہابیوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار اِس انداز سے کیا ہے:

"صاحبو! محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتداءً تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہُوا اور چونکہ یہ خیالاتِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ رکھتا تھا، اِس لیے اُس نے اہلِ سنّت[2] والجماعت سے قتل وقتال کیا، اُن کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا، اُن کے قتل کرنے کو باعثِ ثواب ورحمت شمار کرتا رہا، اہلِ حرمین کو خصوصاً اور اہلِ حجاز کو عموماً اُس نے تکلیف شاقہ پہنچائیں۔ سلفِ صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے، بہت سے لوگوں کو بوجہ اُس کی تکلیفِ شدیدہ کے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے اور اُس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ الحاصل وہ ایک ظالم وباغی، خونخوار، فاسق شخص تھا۔" سہ

دیوبندیوں کے مشہور فاضل، علامہ انور شاہ کشمیری (المتوفی ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء) مولوی حسین احمد ٹانڈوی سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے صدر رہے تھے، اُنھوں نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بارے میں یُوں لکھا ہے:

اما محمد بن عبدالوهاب	محمد بن عبدالوہاب نجدی جو تھا، وہ تو ایک
النجدی فانه کان رجلا	کوتاہ فہم اور کم علم انسان تھا، اسی لیے
بليدًا قليل العلم فكان يتسارع	کفر کا حکم لگانے میں بڑا چُست وچالاک تھا۔
الی الحکم بالکفر۔ سہ	

لہ خلیل احمد انبیٹھوی، مولوی: المہند علی المفند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۲۲،۲۱

۲ہ ٹانڈوی صاحب نے توجہ سے کام نہیں لیا، یہاں اہل السنت والجماعت یا اہلسنت وجماعت کہنا

سہ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: الشہاب الثاقب، ص ۴۲

سمہ انور شاہ کشمیری، مولوی: فیض الباری، ج ۱، ص ۱۷۱

مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تکفیر بازی اور مسلمانوں کے مال و جان کا دشمن ہونے کے بارے میں مزید یوں وضاحت کی ہے:

"محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہلِ عالم و تمام مسلمانانِ دیار مشرک و کافر ہیں اور اُن سے قتل و قتال کرنا، اُن کے اموال کو اُن سے چھین لینا حلال اور جائز بلکہ واجب ہے۔"[1]

وہابیوں نے جہاں وہ قابض ہوئے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ عملی طور پر کر کے دکھا دیا تھا۔ جبکہ ان کے اِس طرزِ عمل کو سراہنے والے بلکہ انہیں مصلح اور ریفارمر بتانے والے موجود ہیں۔ وہ ایسے حضرات تھوڑی دیر کے لیے اگر تعصب کی عینک کو اتار کر دیکھیں کہ جن مسلمانوں کو حضرات کافر و مشرک قرار دے کر قتل کرتے رہے اور آج تک شجرِ وہابیت کی جملہ شاخیں مشرک و کافر ہی قرار دے رہی ہیں اگر اُن کے اِن اصطلاحی مشرکوں کا وجود نہ ہوتا تو ہندو پاک کے مٹھی بھر وہابیوں کو تو ہندو شروع میں ہی کچا چبا گئے ہوتے اور نجدی وہابیوں کی تو عیسائی دنیا کے حصے میں ایک ایک بوٹی بھی نہ آتی۔ مسلمانوں کے دم قدم سے قائم رہ کر انہیں کافر و مشرک بتانا اور بس چلے تو اُن کے خون سے ہولی کھیل لینا، محسن کشی کی المناک مثال ہے یا نہیں؟

اِس سے قطع نظر، وہابی حضرات کو سوچنا چاہیے تھا کہ علمائے اہلسنت نے وہابیہ کے متعلق جو کچھ آج تک کہا، زبان اور قلم سے کہا ہے، اگر مسلمانانِ عالم بھی وہابیوں کو تیغ و تبر کے ساتھ اپنے مذہب کی دعوت دینا شروع کر دیتے یا اب ایسا کرنے لگیں تو نتیجہ کیا سامنے آئے گا؟ ہتھیار تو غیر مسلموں کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس کا وہابیہ کو اپنے روزِ اوّل سے کبھی توفیق ملی ہی نہیں، رہے مدعیانِ اسلام کے باہمی اختلافات تو انہیں خلوصِ دل کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۳

خارجی اسمٰعیلی

یہی خارجی تحریک نجد سے چل کر متحدہ ہندوستان میں وارد ہوئی۔ کسے خبر تھی کہ دہلی کا جو خاندان دینِ برحق کی خدمت میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہا ہے، اسلام میں تخریب اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کا مشغلہ بھی اسی خاندان کا ایک فرد اختیار کرے گا اور پاکی میں تخریب کاری کا ایسا پودا لگا جائے گا جس کی شاخیں پورے ملک میں پھیل جائیں گی۔ اور بھولے بھالے مسلمان ایسے چکر میں پھنس کر رہ جائیں گے کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو کر رہ جائے گا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے مسلک کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کی وہابیت و خارجیت سے کوئی مماثلت ہے یا نہیں؛ مرزا حیرت دہلوی اس سلسلے میں یوں وضاحت کرتے ہیں :

"وہ پیارا شہید (محمد اسمٰعیل دہلوی) تھا جس نے ہندوستان میں (ابن) عبدالوہاب کی طرح شریعتِ محمدی کا ٹھنڈا خوشگوار شربت ہندوستانی مسلمانوں کو پلایا۔"[1]

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے نجدی اور ہندی وہابیت کے تعلق پر یوں اظہارِ خیال فرمایا:

"ہندوستان میں ابن عبدالوہاب کے عقاید کی اشاعت بعض حضرات کے ذریعے سے ہوئی، اس سلسلے میں مولانا اسمٰعیل دہلوی (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) اور مولانا سید احمد بریلوی (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے اہم کردار ادا کیا۔ مولانا سید احمد بریلوی نے تحریکِ وہابیت کے عروج کے زمانے (۱۲۳۶ھ/۱۲۳۷ھ) میں سفرِ حجاز بھی کیا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ خیالات و جذبات لے کر آئے ہوں گے۔"[2]

---

[1] حیرت دہلوی، مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۴۶

[2] محمد مسعود احمد، پروفیسر: موعظہ مظہری، ص ۲۰

آگے چل کر موصوف نے اسی تعلق کی یوں وضاحت فرمائی ہے:

"ابن عبدالوہاب کی تحریک اور ان دونوں حضرات کی سیاسی اور مذہبی کوششوں میں کئی مناسبتیں نظر آتی ہیں۔ ابن عبدالوہاب پر یہ الزام تھا کہ وہ بلاوجہ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرتے ہیں اور اُن کے مال و متاع کو لینے کیلیے مباح سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات مولوی سید احمد اور مولانا اسمٰعیل کی زندگی میں بھی نظر آئیں گے۔" [۱]

ڈاکٹر صاحب نے آگے چند واقعات ان حضرات کی مسلم کشی کے پیش کیے ہیں لیکن اس موضوع پر ہم نے آگے تفصیلی بحث کرنی ہے لہٰذا انھیں یہاں پیش نہیں کرتے۔ اس کے بعد موصوف نے دونوں تحریکوں کے عقائد کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"جہاں تک ان حضرات (سید احمد و اسمٰعیل دہلوی صاحبان) کے معتقدات کا تعلق ہے وہ سختی و درشتی میں ابن عبدالوہاب سے کسی طرح کم نہیں۔" [۲]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے جب اپنے اکابر کے مسلک اور مسلکِ اہلِ سنت وجماعت سے بغاوت کی تو اپنا علیحدہ جتھا بنانے میں مصروف ہو گئے اور اس کا نام "محمدی گروہ" رکھا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور وہابی مورخ اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سوانح نگار، مرزا حیرت دہلوی یوں لکھتے ہیں:

"پیارے شہید نے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی زبان سے یہ نکلوا دیا کہ ہم محمدی ہیں۔ چاروں طرف سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اس ضلع میں اتنے محمدی آباد ہیں اور اس ضلع میں اتنی تعداد اسلامیوں کی ہے۔" [۳]

یہی نہیں بلکہ مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی کے پیر یعنی سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا تو مسلمانوں کے جملہ روحانی سلسلوں سے مستقل

---

۱ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مرزا مظہر، ص ۶۲

۲ ایضاً: ص ۶۳

۳ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۸

ہو کر اپنا سلسلہ نیا "محمدی طریقہ" گھڑ لیا۔ اس کے قواعد اور آداب و اشغال بھی اپنے وضع کیے کہ طریقت کا ایک ابجد خوان بھی اس بازیگری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "طریقہ محمدی" کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں تصوف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے، چشتیہ، سُہروردیہ اور نقشبندیہ۔[1] سید احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر، پھر محمدی طریقے پر، جو انھوں نے خود مقرر کیا تھا، بیعت لیا کرتے تھے۔ وہ اس کی تشریح یوں کیا کرتے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں: ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کیلئے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے اور مذکورہ صوفی طریقے ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ زندگی میں صحیح اور دینی کردار بجا لانا، اور محمدی طریقہ اسی کی نگہداشت کرتا ہے"۔[1]

"طریقہ محمدی" کی موصوف نے آگے تشریح کرتے ہوئے اسے جو امتیازی مقام بخشا ہے ملاحظہ فرمائیے:

"اس انوکھے طریقہ بیعت کی تشریح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگر ابتدا کی سرمستی و سرشاری سے معرا ہو چکے تھے پھر بھی عام دماغوں میں اُن کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ انھیں طریقوں پر بیعت کے خوگر تھے۔ اُن کا یک بیک ترک کامل ایک غیر عملی یا ان ہونی سی بات ہوتی۔ طریق محمدی میں جو صحیح طرز معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا، اس کی تفصیلات خود صراط مستقیم اور مختلف وہابی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ ان میں سے دو

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے طریقے چار بتائے لیکن گنائے تین۔ معلوم ہوتا ہے وہ سلسلہ عالیہ قادریہ سے کچھ زیادہ ہی ناراض تھے۔

[2] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۰

اصول بہت نمایاں ہیں: باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارۃً بھی کسی مخلوق سے
منسوب نہیں کی جاسکتی ہیں، سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی
زندگی میں علی اخلاق پہ کاربند رہنا۔۱؎

جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنا محمدی گروہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت سے
نا شروع کردیا۔ اپنے خاندانی بزرگوں کے مسلک کو بھی خیرباد کہہ دیا بلکہ اُس طریقے
والوں کو ہر مقام پر مشرک اور بدعتی کہنا شروع کردیا تو مسلمانوں کے جذبات کا بھڑکنا
نی جھگڑے تک نوبت آجانا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ متعدد مقامات پر تصادم بھی ہوئے۔
حقیقت کو مرزا حیرت دہلوی نے اُلٹ پھیر کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

"جب بدعتیوں کو پہلے دریلے پر فاش شکستیں ملیں تو اب اُنہوں نے مخالفت کا
دُوسرا پہلو بدلا اور وہ پہلو یہ تھا کہ ہر گلی کے نکڑ پر ایک مُلا کھڑا کردیا کہ وہ
مولانا شہید کو کافر بتاتے اور گمراہ کہے۔ غرض سوائے تبرے کے اور کچھ
نہ کہے۔ جب اِس قسم کے وعظ ہونے لگے تو دو چار جگہ لاٹھی بھی چل گئی، کیونکہ
اب محمدیوں کا گروہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔"۲؎

انصاف والے ذرا اِس حوالے کو غور سے پڑھیں۔ وہابی حضرات خود کو قدیمی جماعت
ہ اور ولی اللّٰہی تعلیمات کا علمبردار ٹھہراتے ہوئے نہیں جھجکتے لیکن یہ محمدی گروہ کس نے بنایا تھا؟
روہ اور اہلسنت سے جُدا ہونے والا گروہ کس کا ہے؟ غور فرمائیے اہلسنت وجماعت سے
یحدہ اپنا گروہ بنانے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہیں یا مولانا احمد رضا خاں بریلوی؟
ہ واقعات کے تقریباً چالیس سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔

بہرحال جب لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچنے لگی تو بانیٔ وہابیت نے بدمعاشوں اور
ن کا اپنی حفاظت کے لیے ایک محافظ دستہ تیار کیا۔ ہادیٔ اکبر، نبی آخر الزماں صلی اللہ

۱؎ مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵
۲؎ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ کائنات کے سامنے روشن ترین مثال ہے۔ جب آپ نے مجبور بے بس انسانوں کو راہِ راست کی طرف بلانا شروع کیا تو اکثر مخاطبین دشمنی پر تُل گئے لیکن آپ نے مخالفت کی پروا کیے بغیر، اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر حق و صداقت کی تبلیغ جاری رکھی اور ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں شب و روز منہمک رہے جو بجا طور پر پُوری اُمت کے پیشواؤں کے بھی پیشوا کہلانے کے حق دار ہیں۔ بعد میں بزرگوں، مصلحوں اور ریفارمروں نے ہمیشہ نیک لوگوں کی دین سے وابستگی سے مدد لی لیکن معلوم نہیں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کس قسم کے مصلح تھے اور کیسی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس کے پیشِ نظر اُنھوں نے خدا پر توکل اور نیک بندوں کی اعانت حاصل کرنے کے بجائے معاشرے کے گھٹیا افراد کی خدمات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی، حقیقت کے چہرے سے یُوں پردہ اٹھاتے ہیں:

"مولانا شہید نے خطوط کے وزن کو پہچان لیا تھا اور گو ابھی عمائد و اعیانِ شہر اس طرف رجوع نہ ہُوئے تھے اور نہ ابھی مولوی فضلِ حق صاحب کی مخالفانہ کارروائی شروع ہُوئی تھی، پھر بھی عقلمندی یہ تھی کہ ہر طرح سے بندوبست کیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ مخالف غافل پا کے کوئی جسمانی مضرت پہنچائیں۔ آپ نے پہلے چند بڑے بڑے بدمعاشوں کے سرغنوں کو اپنی جادو بھری تقریر سُنا کے مُرید کیا اور اُنھیں اپنا ایسا معتقد بنایا کہ وہ اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مصلحت اِسی کی مقتضی تھی کہ یہ کارروائی کی جائے کیونکہ دن بدن مخالفت کی آگ بھڑکتی جاتی تھی۔"[1]

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی جگہ جگہ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے لگے اُن کے مذہبی عقائد کا مذاق اڑانے لگے تو چاروں طرف سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) کے پاس شکایتیں پہنچنی شروع ہو گئیں کہ حضرت آپ کے بھتیجے آج یُوں کہہ رہے ہیں اور کل اُنھوں نے یہ کہا تھا۔ مرزا حیرت دہلوی نے شکایات

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۵۸

حاطہ کو اِس عجیب انداز میں سپردِ قلم کیا ہے:

"بڑے بڑے رئیس جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے معتقدین میں سے تھے،
خواہ شیعہ ہوں یا سُنّی، آ آ کے کہنے لگے آپ اپنے بھتیجے کو روکیے،
یہ بڑی بدنامی کی بات ہے۔ شاہ صاحب سب کو یہی جواب دیتے تھے جب تک
اسمٰعیل سے خلافِ شریعت فعل سرزد نہ ہو، میں کیونکر اسے روک سکتا ہوں۔
وہ کوئی فساد انگیز تقریر نہیں کرتا کہ اس پر میں معترض ہوں۔ آخر کوئی معقول
وجہ بھی تو ہونی چاہیے جس سے میں اُس کی کارروائی میں دست اندازی کر سکوں۔
جب اعیانِ شہر شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ جواب پاتے تھے تو اپنا سا
منہ لے کے چلے جاتے۔" ؎

انسان جب کسی کی ناجائز عقیدت یا نفرت کا شکار ہو جاتا ہے تو اُس کی خوبیاں بیا
بیان بیان کرتے وقت انصاف کے تقاضوں کو مدِّ نظر رکھنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور
ں اوقات ایسے ایسے بیانات دینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو بڑے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔
حیرت دہلوی کے دل و دماغ میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی عقیدت و محبت کے جذبات
پر اِس طرح رچے بسے معلوم ہو رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے اِس بیان کے ساتھ ہی
ٹھیک بیٹھنے کی بھی مطلقاً پروا نہ کی، بس صفائی پیش کرنا تھی، عقیدت کا اظہار کرنا تھا۔
سری بات ہے کہ ایسے بیانات سے مرزا صاحب خود بھی ایک تماشا بن کر رہ گئے۔ متعـ
متعلقہ باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ جب بڑے بڑے رئیس شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایتیں کرتے
اور وہ بھی ایسے حضرات جو حضرت شاہ صاحب کے معتقد تھے، اگر مولوی محمد اسمٰعیل
دہلوی کا مسلک حضرت شاہ صاحب کے مسلک سے ہٹا ہوا نہیں تھا تو اُن سے
شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

؎ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۲

۲۔ اگر موصوف کے خیالات میں کوئی بات خلافِ شریع اور فساد انگیز نہیں تھی تو شکایت کرنے والے بدنامی کی بات خود شاہ صاحب کے رُوبرو کس چیز کو بتا رہے تھے،

۳۔ اگر اعتراض کرنے کی بقول مرزا صاحب کوئی معقول وجہ نہیں تھی تو کیا شکایت کرنے والوں کا دماغ خراب ہوگیا تھا کہ شکایت کرنے والے آتے ہی رہتے اور اپنا سا منہ لے کر چلے جاتے۔ آخر آنے کی وجہ ؟

۴۔ کیا شکایتیں صرف رؤسا ہی کر رہے تھے۔ اُن کی تصنیف "حیاتِ طیبہ" بھی یہی بتا رہی ہے کہ عوام و خواص یعنی اَن پڑھ مسلمان سے لے کر علمائے کرام تک سب مبتلا اُٹھے تھے اور شاہ صاحب جیسے نابغۂ عصر سے شکایتیں کر رہے تھے کہ حضرت کیا یہ خاندان اب دینِ برحق کی خدمت سے اُکتا گیا ہے جو تخریبِ دین واضلالِ مسلمین کا کام بھی خود ہی سنبھال لیا۔ مرزا صاحب یہاں شکایت کرنے والے صرف رئیس حضرات کو بتا رہے ہیں گویا باقی سب خیریت تھی۔

۵۔ علمائے کرام کی جگہ بڑے بڑے رئیس لکھ کر مرزا صاحب شاید یہی تاثر دینا چاہتے ہوں گے کہ مذہبی لحاظ سے اُن کے محبوب رہنما کے خیالات و نظریات بالکل درست، خاندانی مسلک کے مطابق اور جمہور اہلسنّت کی آواز تھے، بس رئیسوں کو کچھ شکایتیں، رنجشیں اُن کی اصلاحی تقریروں سے ہوگئی تھیں لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اسی کتاب کے متعدد صفحات اُن کے اِس بیان کی تکذیب و تردید کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس سلسلے میں فریقِ ثانی کے متعدد علمائے کرام نے اِن شکایتوں کا تذکرہ جس انداز میں کیا اور حضرت شاہ صاحب نے جو جواب مرحمت فرمایا، اگر تنقید کی نظر سے غیر جانب دار ہو کر دیکھا جائے تو اُن کے بیانات حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مثلاً قاضی فضل احمد لدھیانوی نے زیادہ تسلیس کے حوالے سے یہ واقعہ یوں بیان کیا ہے:

"اُنہیں دنوں ایک کتاب شیخ (ابنِ) عبدالوہاب نجدی کی تصنیفات کا انتخاب بمبئی سے دہلی میں آئی، چونکہ عبدالوہاب مسطور ملکِ عرب کا باشندہ زبان دان تھا

مولوی اسمٰعیل اُن کی فصاحت و بلاغت پر فریفتہ ہو گئے ۔ اُس کے کچھ مسائل انتخاب و اخذ کر کے علمائے دہلی حنفی مذہب سے چھیڑ چھاڑ کرنی شروع کر دی اُنھوں نے اِس کو خورد سال ، خام خیال سمجھ کر ان سے بحث نہ کی مگر مولانا عبد العزیز (رحمۃ اللہ علیہ) سے ان کی بے اعتدالی کے شاکی ہوئے ۔ مولانا موصوف نے کچھ رنجیدہ خاطر ہو کر مولوی اسمٰعیل کو پیغام بھیجا کہ میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو کہ جو کتاب بمبئی سے آئی ہے ، مَیں نے بھی اُس کو دیکھا ہے اُس کے عقائد صحیح نہیں بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہوئے ہیں ، میں آجکل بیمار ہوں اگر صحت ہو گئی تو میں ، اُس کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں ۔

تم ابھی نوجوان بچے ہو ، ناحق شور و شر برپا نہ کرو ۔"[1]

مذکورہ بالا عبارت نے کئی غلط فہمیوں کو دُور کر دیا اور صورتِ حال کا اُس کی اصلی شکل میں اظہار کر دیا ۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) نے اسی خاندانی مسلک کے خلاف کا ایک واقعہ یُوں بیان کیا ہے :

"اِس کے متعلق مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خُوب جواب دیا تھا ۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے جہر بالتامین کے متعلق کہا تھا کہ حضرت آمین بالجہر سنت ہے اور یہ سنّت مُردہ ہو چکی ہے اس لیے اِس کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ شاہ عبد القادر صاحب نے فرمایا کہ یہ حدیث اس سنّت کے باب میں ہے ، جس کے مقابل بدعت ہو اور جہاں سنّت کے مقابل سنّت ہو وہاں یہ نہیں اور آمین بالسّر بھی سنت ہے تو اِس کا وجود بھی سنّت کی حیات ہے ۔ مولانا شہید نے کچھ جواب نہیں دیا ۔"[2]

یہی مولوی اشرف علی تھانوی ایک واقعہ اور بیان کرتے ہیں ، جس سے واضح ہوتا ہے

---

[1] فضل احمد قاضی : نورِ آفتابِ صداقت ، ج ۱ ، ص ۲۰۵

[2] افاضات الیومیہ ، ج ۳ ، ص ۱۲

کہ ان بزرگوں کی زندگی میں اُن کی پرواکیے بغیر مولوی محمد اسمٰعیل نے وہابیت کی کسی قدر ترویج واشاعت جاری کردی تھی:

"شاہ عبدالقادر صاحب نے مولوی محمد یعقوب کی معرفت مولوی اسمٰعیل صاحب سے کہہ دیا تھا کہ تم رفع یدین چھوڑ دو، اس سے خواہ مخواہ فتنہ ہوگا۔ جب مولوی محمد یعقوب صاحب نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو پھر اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے "من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد" کیونکہ جو کوئی سنت متروکہ کو اختیار کرے گا عوام میں ضرور شورش ہوگی۔ مولوی محمد یعقوب صاحب نے عبدالقادر صاحب سے اس کا جواب بیان کیا۔ اس کو سُن کر شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا: بابا ہم تو سمجھتے تھے کہ اسمٰعیل عالم ہوگیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں سمجھتا۔ یہ حکم تو اس وقت ہے جبکہ سنت کے مقابل خلافِ سنت ہو اور ما نحن فیہ میں سنت کا مقابل خلافِ سنت نہیں بلکہ دوسری سنت ہے۔"[1]

پروفیسر محمد مسعود صاحب نے ایسے ہی واقعات کے پیشِ نظر یوں وضاحت فرمائی ہے

"مولانا اسمٰعیل تو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کے دونوں چچا (کیونکہ تیسرے چچا حضرت شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ کا ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء میں انتقال ہوگیا تھا) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ان پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے، مگر جب زورِ علم نے بیباک بنا دیا تو بات یہاں تک پہنچی کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلس مبارکہ سے ان کو اٹھا دیا۔ آخر میں دونوں چچا ان سے ناراض ہوگئے تھے لیکن سوانح نگار صرف ابتدائی دور کو

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولوی: ارواحِ ثلاثہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۴۶۹

ذکر کرتے ہیں، مجلس سے اٹھانے کا واقعہ تو شاہ مولانا اشرف علی تھانوی نے
بھی بوادر النوادر میں تحریر فرمایا ہے۔" ۱؎

سیف اللہ المسلول، مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء)
مولوی محمد اسمعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کے معاصر اور دیگر علما نے
سنت وجماعت کی طرح ہندی وہابیوں کی حرکات قبیحہ کے عینی گواہ اور علمائے اہلسنت
متاز مقام رکھتے تھے، انھوں نے ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء میں محمد اسمعیل دہلوی اور ان کے
مددوں کی تردید کی اور اس تخریب کاری کے چہرے سے یوں پردہ اٹھایا:

"اس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی، گویا یہی کتاب التوحید
کی شرح ہے۔ اس دین کی بڑی شہرت ہوئی اور عوام الناس بہت اس بلا
میں پھنسے۔ توہین و تحقیر انبیاء و اولیاء کی اور تکفیر تمام امت سلف و خلف
کی خوب جاری ہوئی دین دار اہل علم جہاں تھے ان کے فیض صحبت سے
جو بچا سو بچا ورنہ اول وہلہ میں اکثروں کو اس طرف میل ہو گیا، بسبب شہرت
ان کے خاندان کے اور ناواقفی کے فن سیرت اور حدیث سے جب نوبت
دلی میں پہنچی ہزاروں ہزار آدمی کہ شاگرد و مرید اور دیکھنے والے صحبت یافتہ
شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) کے
اور علم میں ان سے زیادہ لائق موجود تھے، مولوی اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی سے
دست و گریباں ہوئے اور خواص نے فہمائش کی کہ اس سفر میں یہ کیا دین
کیا نکال لائے کہ اس کی رو سے تمہارے استادوں سے لے کر صحابہ
تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچا اور قبل اس سفر کے تم بھی اسی طریقہ پر تھے
اور ویسا ہی وعظ کہتے تھے اور فتویٰ لکھتے تھے، جس کو اب شرک کہتے ہو۔ یہ دین
میں فساد ڈالنا اور قرآن و حدیث میں تحریف کرنا اور خلائق کو گمراہ کرنا بہت

۱؎ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواعظ مظہری، ص ۸۲

برا ہے۔ ہرچند نصیحت کی، کچھ سُود مند نہ ہوئی، لاچار ہو کر سب نے اُن کا
ردو ابطال کیا۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی موسیٰ صاحب مولوی
رفیع الدین صاحب کے صاحبزادوں نے فتویٰ اور رسالے اُن کے رد میں
لکھے، نوبت تکفیر تک پہنچائی۔ مولوی فضل حق خیرآبادی نے حزہ اللہ
حیثاً کہ علم وفضل میں مولوی اسمٰعیل وغیرہ کو اُن سے کچھ نسبت نہیں ...
ہر طرح مولوی اسمٰعیل کے رُوبرُو اُن کا ردو ابطال کیا اور تکفیر کی نوبت
تحریر میں آئی۔ مسئلہ شفاعت میں مولوی اسمٰعیل نے حرکت مذبوحی کچھ جواب
میں کی آخر کو عاجز و ساکت ہو گئے اور "تحقیق الفتویٰ فی رد اہل
الطغویٰ" کمال شرح و بسط سے مولوی فضل الحق رحمۃ اللہ علیہ صاحب
نے لکھی"۔ [1]

مفتی صدر الدین آزردہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے بھی
اسمٰعیل دہلوی کو خوب سمجھایا کہ دین میں تخریب کرنا اور اپنے خاندان کی عظیم الشان مذہبی خد
پر پانی پھیرنا عقلمندی نہیں ہے۔ موصوف نے اقرار بھی کر لیا تھا لیکن معلوم نہیں اندریں
مجبوری پیش آگئی کہ برقرار نہیں رہا۔ مثلاً:

"مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آزردہ) اسمٰعیل کو فہمائش کر کے رو رہے
رلاتے اور اُن سے اقرار کرا لیا کہ اب ہم نے تحقیق کی اور افراط و تفریط
کو چھوڑا، سوادِ اعظم کے مخالفت سے منہ موڑا اور یہ بات خاص و عام پر
جامع مسجد میں شائع و ذائع ہو گئی"۔ [2]

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے
فیض یافتہ مولانا رشید الدین خاں صاحب علیہ الرحمہ نے بھی فہمائش کا فریضہ ادا کیا

---

[1] رسول بدایونی، مولانا: سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۵۸، ۵۹
[2] فضل احمد قاضی، مولانا: انوار آفتاب صداقت، ج ۱، ص ۵۰۴

ضل احمد صاحب یوں تصریح کرتے ہیں :

"مولانا رشید الدین خاں صاحب نے تحقیر میں بدر بعد و با ذریعہ اسمٰعیل کو بہت سمجھایا کہ دین میں فتنہ ڈالنا اور جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا قبیح ہے اور واجب الترک اور مفروض الاجتناب۔ اگر دل میں کچھ خلش ہے (یعنی شک شبہ) تو آؤ ما و شما و دیگر علما و صلحا متفق ہو کر کتب دین کی طرف رجوع کریں اور حقائق حق قبول کریں اور شقاق و نفاق کو جماعت مومنین سے استیصال کریں اور نوائے اعانت و اشاعت کا راہ راست پر کہ اتباع سواد اعظم ہے بلند کریں اور خاص و عام کو حق سے آگاہ کریں۔ مولوی عبد الحی اور مولوی اسمٰعیل اس خوف سے کہ ہمارے عقائد فاسدہ طشت از بام نہ ہو جائیں رُو براہ سر لائے" ۱ ؎

جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے خاندانی بزرگ سمجھا سمجھا کر تھک گئے، اس خاندان کے ائمہ علمائے کرام نے فہمائش کا فریضہ ادا کر لیا اور دیگر علمائے اہلسنت انہیں سمجھاتے ست پر لاتے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے سے روکتے تھے تو موصوف کا پارہ ڑھ گیا، خارجیت و نجدیت کا اصلی رنگ موصوف کی تقریر و تحریر سے ظاہر ہونے لگا۔ ت پر مسلمانوں کو دھڑلے سے مشرک بتانا شروع کر دیا۔

حضرات علمائے کرام نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے یہی تو کہا تھا کہ مسلمانوں میں پیدا نہ کریں متحدہ ہندوستان کے مسلمانان اہلسنت و جماعت کو مشرک بتا کر تیرہ صدیوں مانوں کو جہنم کا ایندھن قرار نہ دیں، خود شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز محدث رحمۃ اللہ علیہما نے سمجھا بجھا کر اور ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا اور موصوف کسی کے کہنے کو خاطر ے ہی نہیں تو مجبور ہو کر مسلمانان اہلسنت و جماعت نے قانون کا سہارا لینے کی ن کی۔ اس وقت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸ ۱۲ھ / ۱۸۶۱ء)

---

۱ ؎ ضل احمد قادری، مولانا: انوار آفتاب ہدایت، ج ۱، ص ۴۱۵

نے اس قصّے کے متعلق جو ریمارک دیا وہ اُن کی انتہائی وسیع النظری کا بیّن ثبوت ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اُس موقعے کے جملہ حالات کو بیان تو کیا ہے لیکن اس طرح کہ اپنے محبوب رہنما کی آن پہ حرف نہ آنے۔ واقعات بیان کر دیے لیکن انصاف کا خون کر کے۔ قارئین کرام مندرجہ ذیل بیان کو پڑھیں اور حقائق کی روشنی میں تجزیہ کریں:

"یہ زمانہ گویا مولانا شہید کی ریفارمیشن کا آغاز تھا اور یہی زمانہ اُس تلخ تر دشمنی کا تھا جو خواہ مخواہ حاسد مولانا سے کرتے تھے۔ جب مختلف مضامین پر وعظ ہوئے تو لوگوں میں جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں ایک شورش سی پھیل گئی اور چاروں طرف ایک ڈھنڈھورا پٹ گیا۔ جہلا جو مدّت سے مختلف پیروں، شہیدوں، سیتلا ماتا کے پوجنے کے عادی تھے، انھیں ایک خدا کی پرستش کب اچھی معلوم ہوتی۔ وہ بھڑکتے بھڑکتے مولانا شہید کے فقیری وعظ سے پورے بھڑک اٹھے اور اب انھوں نے عدالت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا کیونکہ اکبر شاہ (بادشاہِ دہلی) کی طرف سے تو صاف جواب مل چکا تھا، مگر عدالت میں جانے سے پہلے انھیں ضرور ہوا کہ وہ مولوی فضل حق صاحب سے مشورہ کریں کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیرآبادی) رزیڈنٹ کے بڑے منہ چڑھے اور معتبر تھے اور وہ اُن ہی کے کہنے پر زیادہ چلتا تھا۔ جب یہ لوگ سررشتہ دار (علامہ خیرآبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آمادہ ہو کے کہنے لگے کہ "اسمٰعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہے گا۔" یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو انھوں نے بیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔"[1]

بہرحال قانونی چارہ جوئی سے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا وعظ بند کروا دیا گیا

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۰

ےکے دوران میں معلوم نہیں اعلیٰ انگریزی حکام کے ساتھ مل کر کیا کھچڑی پکائی گئی کہ
ٹ نے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے وعظ پر جو پابندی لگائی تھی اُسے منسوخ کر دیا گیا۔
ی کا حکم توقع وقت پر پہنچا تو موصوف اپنے معتمد ساتھیوں کے ہمراہ ریزیڈنٹ کے
ں تشریف لے جاتے ہیں۔ ریزیڈنٹ نے جو موصوف کا معنی خیز اور خلاف توقع اعزاز
م کیا یا وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اُس نے اہلِ نظر علمائے اہلسنت کی آنکھیں کھول
یہ واقعہ بھی مرزا حیرت دہلوی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

"آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملانے اور فرصت کا ہوتا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے۔ ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرا لال تھا اور ایک خدمت گار تھا۔ پہلے آپ نے جب کے اطلاع کرائی۔ جونہی ریزیڈنٹ نے سُنا کہ شاہ اسمٰعیل آئے ہیں، فوراً باہر نکل آیا اور برآمدے سے آکے لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا، آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا۔ معمولی مزاج پرسی کے بعد ریزیڈنٹ نے خود بہ الفاظ کہ، مولوی صاحب! ہمارے سررشتہ دار (علامہ فضل حق خیر آبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔"[1]

زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وعظ پر جو پابندی لگا دی گئی تھی اُسے اُٹھا لیا جاتا اور وعظ کرنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن "قدیمی طور پر جاری کیا جائے" کے الفاظ اور "کوئی مزاحم نہ ہو" کا آرڈیننس اُس خدشے کو مزید تقویت دی اور یہی غمازی کر رہے ہیں اور یا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی نظر میں مسلمان تو سب کے سب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۹۴

مشرک ہی تھے لیکن ایک ظاہر بُت پرست اور ٹھیٹ مشرک یعنی ہیرا لال کو کس عقیدت ، محبت یا یگانگت کے تحت منشی (پرسنل سیکرٹری) رکھا ہُوا تھا ، جو راز داری کے مواقع پر بھی سائے کی طرح ساتھ ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ ارشادِ باری تعالیٰ تو یہ ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَۃً مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ - اے ایمان والو! غیر مسلموں کو اپنا راز دار نہ بنانا۔ لیکن یہ نرالے ریفارمر صاحب ہیں کہ ہیرا لال ہندو کو منشی رکھتے ہیں اور عجیب و غریب مجاہد ہیں کہ راجہ رام چندر راجپوت کو توپچی رکھتے ہیں۔ کہیں یہ میراثِ خوارج سے بھی وہی اور "یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان" کی جلوہ گری تو نہیں۔ اسی منشی ہیرا لال کے متعلق مرزا حیرت دہلوی نے یہ بھی لکھا ہے :

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (محمد اسمٰعیل دہلوی) کا وعظ بلفظہٖ نقل نہیں کر سکتے ، اس لئے کہ جو کاغذات منشی ہیرا لال کے ہاتھ کے لکھے ہُوئے ہمیں ملے ہیں وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہُوئے ہیں کہ ہم بلفظہٖ نقل کرنے کا فخر حاصل نہ کر سکے۔"[1]

جب فہمائش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہُوا ، قانونی چارہ جوئی نے کچھ اور ہی نظارہ دکھایا ، جو وہ طبق روشن ہو کر رہ گئے تو یقین ہو گیا کہ جس راستے پر موصوف گامزن ہو چکے ہیں اُس سے ہٹنا اور اپنے بزرگوں کے مسلک کی پیروی کرنا اب اُن کے بس سے باہر ہے یہ اپنی مرضی کھو چکے ، کسی کی مرضی کے پابند ہو چکے ہیں تو علمائے کرام نے طے کیا اب فرض کی ادائیگی کا ایک صرف یہی طریقہ باقی رہ گیا ہے کہ موصوف سے بحث مباحثہ کر کے انھیں مسلک سے ہٹا ہوا اور مذہب اہلسنت و جماعت سے کٹ کر خارجیت و وہابیت کا علمبردار ثابت کیا جائے تاکہ عوام الناس اِن کے دامِ فریب میں گرفتار ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنے سے محفوظ و مامون رہ سکیں۔ چنانچہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے خلفاء ، اور مولوی محمد اسمٰعیل کے چچا زاد بھائیوں نے اُن سے جامع مسجد دہلی میں ایک

---

[1] حیرت دہلوی مرزا : حیاتِ طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۸۴

من مباحثہ کیا، جو پاک و ہند کی سرزمین میں حنفیت و وہابیت کا سب سے پہلا مناظرہ تھا۔
مباحثے کی روئداد حضرت فضلِ رسول بدایونی قدس سرہٗ نے ۱۲۴۰ھ میں موصوف کے
حیات یعنی اُن کے قتل ہونے سے پانچ چھ سال پہلے یوں بیان فرمائی اور کسی نے ایک
بھی تغلیط ثابت نہ کی۔ لکھا ہے :

"مجلسِ جامع مسجد کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ایک استفتا مرتب ہوا، بمہر و
دستخط مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی فضل حق صاحب و مولوی
مخصوص اللہ صاحب و مولوی موسیٰ صاحب و مولوی محمد شریف صاحب و
مولوی عبداللہ صاحب و آخوند سید محمد صاحب، صبح کے وقت منگل کے
دن انتیسویں ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو، کہ مولوی عبدالحی جامع مسجد میں وعظ
کہہ رہے تھے۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب
و مولوی موسیٰ صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور
مولوی محمد شریف صاحب وغیرہ علماء و طلبہ، خاص و عام اکٹھے پر مجتمع ہوئے
جب مولوی عبدالحی وعظ کہہ چکے، عبداللہ طالب علم نے استفتا پیش کیا کہ
اپنی مہر اس پر کر دیجئے۔ مولوی عبدالحی نے کہا، میں نہیں مُہر کرتا کہ میں کچھ نہیں
جانتا۔ اُس نے کہا: یہی لکھ دیجئے اور اصرار کیا تو مولوی عبدالحی نے انکار کیا
اور ملال ظاہر کرنے لگے۔

مفتی شجاع الدین علی خاں صاحب نے کہا کہ اِس کا تصفیہ ضرور ہے
کہ بڑا اختلاف پڑ گیا ہے۔ مرزا غلام حیدر شاہزادے اہل علم کی تکرار سے
رنجیدہ ہوئے اور مولوی عبدالحی وغیرہ کو مجمع علماء میں واسطے مناظرہ لائے۔ مجمع
بے شمار خاص و عام، امیر و فقیر کا ہو گیا۔ کوتوال بھی واسطے بندوبست کے آ پہنچا۔
مولوی عبدالحی نے فاضلوں سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ کسی نے کہا کہ آپ نے
بُلانے کے موافق کہ ہر روز کہا کرتے تھے کہ جس کو تاب مناظرہ کی ہو ہمارے سامنے
آوے، سُن کر چپ ہوئے۔ مولوی مخصوص اللہ دِ شاہ رفیع الدین محدث

دہلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے نے کہا کہ ہم بموجب حکم خدا کے آئے ہیں کہ حق ظاہر ہو جائے
مولوی موسیٰ (شاہ رفیع الدین محدث دہلوی علیہ الرحمۃ کے صاحبزادے) نے کہا کہ تم ہمارے
استادوں کو (شاہ عبد العزیز و شاہ عبد القادر و دیگر علماء اہلسنت کو) بُرا کہتے ہو۔ بولے کہ میں نہیں کہتا۔
مولوی موسیٰ نے کہا کہ یہ ایسے مسئلے بتاتے ہیں کہ اُن سے بُرائی استادوں
کی ثابت ہوتی ہے۔ پوچھا وہ کیا ہے؛ کہا کہ مثلاً قبر کے بوسے کو شرک کہتے ہو
اور ہمارے اکابر (شاہ عبد العزیز و شاہ ولی اللہ وغیرہ) اُس کے مباشر
ہوتے تھے۔ مولوی عبد الحی نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ لکھ دو تاکہ تمہارے
اُوپر جھوٹ باندھنے کی تکذیب کی جاوے۔ مولوی عبد الحی نے کانپتے ہوئے ہاتھ
سے لکھ دیا؛ بوسہ دہندہ مشرک نیست۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کے ہاتھ میں فتویٰ دیا گیا اور قریب
مولوی عبد الحی کے آبیٹھے۔ مولوی عبد الحی نے گلہ شکوہ اُن سے شروع کیا کہ
خانصاحب مجھے آپ کی خدمت میں دوستی تھی، تم برملا مجھے ذلیل کرتے ہو۔
خانصاحب نے فرمایا کہ ہم تمہارے اعزاز و اظہارِ کمال کے واسطے آئے ہیں،
لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تم مسئلے خلاف سنت کے کہتے ہو اس سبب سے
تم سے خلق کو وحشت ہے۔ ایسے مجمع میں مفتریوں کی تکذیب ہو جاوے گی۔
مولوی عبد الحی شکوے ہی کی پریشان باتیں کرتے رہے۔ خانصاحب نے
فرمایا کہ تمہارے لوگ (متبع وہابیت و نجدیت مثل شاہ اسمٰعیل) کہتے ہیں
کہ عبد العزیز کی راہ، راہ جہنم کی ہے (نعوذ باللہ) اسی وقت گواہی سے یہ
بات ثابت ہوگئی، لوگ بُرا کہنے لگے۔ مولوی عبد الحی نے بھی تبرّا کیا با آواز بلند
اور مولوی رشید الدین خاں صاحب سے کہا کہ مولانا عبد العزیز کی محبت اور
اعتقاد، علم و بزرگی میں، میں مثل تمہارے ہی۔ طحاوی اور کرخی کے برابر
جانتا ہوں۔ پھر استفسار شروع ہُوا۔ ہر مسئلے کا جواب دیا کہ چندں مخالف
جمہور کے نہ تھا۔

مولوی اسمٰعیل نے پہلے ہی استفسار سے ارادہ کیا اُٹھ جانے کا۔

مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا: ذرا تشریف رکھیے کہ جواب کے بھی دستخط
اِس تحریر پر ضرور ہیں۔ مولوی اسمٰعیل نے کہا کہ "میں کسی کے باپ کا نوکر
نہیں، میرے واسطے محتسب لا، اے مردود، میرے ساتھ سختی کرتا ہے"
اُنھوں نے کہا کہ حضرت! میں سختی نہیں کرتا، عرض کرتا ہوں۔ پھر مولوی اسمٰعیل نے
کہا کہ میرے رسالے کا جواب لکھو۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا کہ رسالہ
آپ کا میری بغل میں ہے اگر فرمائیے، اِسی مجمع میں جواب عرض کر دوں۔ غصہ کھا کر
پھر کہا۔ پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ جواب عقلی لکھوں یا نقلی۔ کہا جیسا چاہیے۔ پھر مولوی
رحمت اللہ نے کہا کہ رد جواب اس کا لکھو گے؟ کہا کہ میں محکوم کسی کا نہیں ہوں۔ مولوی رحمت اللہ
نے کہا کہ اپنے عقیدے سے اپنے دل کے بنائے ہوئے سے نہ پھریے اور نہیں تو
ابھی بحث کر لیجئے۔ مولوی اسمٰعیل اُٹھ بھاگے اور چلتے ہوئے۔

رشید الدین خاں صاحب مولوی عبدالحی سے پوچھا کیے۔ وہ جواب دیتے
تھے، ایسے کہ قدما کے خلاف تھے۔ تیرھویں سوال میں کہ بدعت کی بحث تھی
مولوی عبدالحی نے کہا کہ میرے نزدیک بدعت حسنہ بھی ہے، گو اصل ہر بدعت
کی بد ہے مگر سبب نیکی کا اُس میں ہو تو حسنہ ہو جاتی ہے و الّا فلا۔ مولوی
رشید الدین خاں صاحب نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی بد نہیں ہے بموجب
حدیث "من سن سنة حسنة و من سن سنة سيئة" (الحدیث)
کے اور حدیث "من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه" اور حدیث
"من ابتدع بدعة ضلالة لا یرضاه الله" کہ ان تینوں حدیثوں سے
ثابت ہوا کہ نیا طریقہ نیک بھی ہوتا ہے، بد بھی اور خدا و رسول کی مرضی کے
موافق بھی، مخالف بھی، گمراہ بھی، غیر گمراہ بھی۔ اِسی سبب سے علماء
نے کہا ہے کہ بعض بدعت واجب، مندوب و مباح بعضے حرام، مکروہ۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب (ابن شاہ رفیع الدین) نے کہا: جس
بدعت کی وجہ حُسن و قُبح ظاہر نہ ہو وہ کیا ہے؟ مولوی عبدالحی نے کہا: سیئہ۔
اُنھوں نے کہا: اِس تقدیر پر بدعت و مباح میں کیا فرق ہے؟ مولوی

عبدالحی ساکت ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ احکام خمسہ میں سے ایک حکم کم ہو گیا۔
پھر مولوی عبدالحی نے کہا کہ ہر بدعت کو بُرا اس واسطے کہتا ہوں کہ "کل بدعۃ" کا کلیہ ظاہر رہے اور مخصوص نہ ہو جاوے۔ خانصاحب نے کہا کہ تخصیص سے کیا قباحت لازم آتی ہے؟ اور عمومات میں تخصیص مشہور ہے۔ مولوی محمد شریف نے پڑھا "ما من عام الا وقد خص منه البعض" خانصاحب نے کہا کہ تینوں حدیثیں مذکورہ بالا تخصیص کو چاہتی ہیں، پس تخصیص ضرور ہوئی۔
مولوی عبدالحی نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی قبیح بعض علماء کا مذہب ہے۔ خانصاحب نے کہا کہ یہ قول حضرت مجدد (قدس سرہٗ) کا ہے مگر تمہارے مذہب (خارجیت و وہابیت) سے نہایت دُور کہ اُن کے مذہب میں جس کی اصل شرع میں پائی جاوے وُہ سنت ہے، بدعت وہی ہے جس کی اصل نہ پائی جائے۔ پھر مولوی عبدالحی نے غوطہ میں جا کر کہا کہ یہ قول نووی کا ہے، فتح المبین میں لکھا ہے۔ اُسی وقت فتح المبین شرح اربعین امام نووی کی جیب کی گئی۔ عبارت اُس مقام کی باآواز بلند مع ترجمہ پڑھی گئی۔ پھر تو مولوی عبدالحی اچھی طرح سے قائل معقول ہو گئے۔

پھر اذان میں بعد دفن کے کلام ہُوا۔ بعد کسی قدر تکرار کے کہا کہ میں کسی کو منع نہیں کرتا۔ پھر کلام ہُوا، سوم کے فاتحہ میں۔ بعد قیل وقال کے کہا کہ اگر اُس دن میں ثواب زیادہ جانتا ہے ممنوع ہے اور اگر ثواب زائد نہیں جانتا اور برعایت مصلحت کے کرتا ہے تو منع نہیں ہے۔

تمام ہُوا خلاصہ نقل مجلس کا۔ پھر تو یہ حال ہُوا کہ ہر ایک مسئلہ میں ادنیٰ ادنیٰ آدمی سے قائل و ساکت ہونے لگے اور اطراف و جوانب میں بھی یہ تقریریں اور تحریریں جابجا پھیل پڑیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ مولوی اسمٰعیل کا طریقہ مخالف ہے تمام سلف صالح کے اور اپنے خاندان کے بھی مخالف ہیں اور سبب اعتبار کا وہی نسبت خاندان کی تھی۔ جب اُس کے بھی خلاف ٹھہرے

تو کچھ اعتبار نہ رہا اور ساری قلعی کھل گئی اور ہر جگہ جو اہلِ علم تھے متوجہ ہوئے اِن
کی بے دینی کے اظہار اور اُس کے رد لکھنے پر۔ ایسے سببوں سے آگ اُن کے
فتنے کی ٹھنڈی ہو گئی اور نئے دین والے بھی زبان دبا کر بات کرنے لگے۔"[1]

قارئین کرام! یہ تھا وہابیت کا سنگِ بنیاد جو دہلی میں رکھا گیا اور ولی اللّٰہی خاندان سے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے جس نجدی شجر کی آبیاری کا کام بڑی تندہی سے کیا۔ علمائے اہلسنت نے اپنی بساط بھر اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ خاندانی بزرگوں اور دیگر علمائے اہلسنت نے بھی قانونی چارہ جوئی کی، بحث و مناظرہ کی محفلیں گرم کی گئیں، لیکن مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) تھے کہ اپنے جدید مذہب سے کسی طرح نہ ہٹے، مغلوب ہوئے مگر ڈٹے رہے، اپنے اکابر سے روگرداں ہوئے۔ خاندان سے ترکِ تعلق کیا، دہلی مرکز سے رابطہ چھوٹا تو جہاد کا چکر چلایا، سید احمد صاحب کو صاحبِ وحی و عصمت پیر بنایا، اُن کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور سب کچھ، وہابیت کا داعی ہونے کی خاطر، اِس خوشنما جال میں بھولے بھالے مسلمان پھنسانے۔ نجدیت کی پوری سرپرستی حاصل کرنے، نجدیوں سے فتنہ و فساد کے گُر سیکھنے کی خاطر، حج بیت اللہ کا بہانہ کر کے ایک قافلے لے گئے، وہاں کیوں گئے اور کیا وہاں سے لائے، یہ سب منہ آتی باتیں، حقیقت کا حال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اُس کی عطا سے اُس کے برگزیدہ بندے۔ باقی تو صرف قصّہ نظر کی باتیں ہیں۔ اِس دورۂ حج کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب نے بعض مورخین کے خیالات یوں نقل کیے ہیں:

"حضرت سید احمد صاحب کا شاندار سفرِ حج اُن کی زندگی کا ایک اہم اور
فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سید احمد کا سفرِ حج
اُن کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اُن کے خیال میں اِسی دوران سفر میں
اُن کو عربی وہابیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا، اُس کے عقائد سے بہت

---

[1] فضلِ رسول بدایونی، مولانا: سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۶۱ تا ۶۲

متاثر ہوئے اور ہندوستان میں اُن کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنف قلبی لکھتا ہے: "یہی زمانہ تھا جبکہ ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے ہندوستان کو وہ بیج لے گیا جس نے .... ۱۸۲۲ء میں اُن کی شہادت کے بعد وہابیوں کو کوہ سیاہ کا ردِ عمل بخشا اور اطراف تک اُس کی گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔"

ہندوستانی وہابیت پر ایک اور مشہور تر مصنف، ہنٹر لکھتا ہے:

"سید احمد کے قیامِ مکہ کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ اُن کی تعلیمات کی اُن بدقسمتوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منعطف ہوئی، جن کے ہاتھوں مکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر اُن کی تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دیے گئے۔ اِس جور و تعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستان آئے تو ایک مذہبی خراب ہیں اور مشرکانہ بدعتیوں کے مصلح کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔"[۱]

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب اِن مصنفوں سے اتفاقِ رائے نہیں رکھتے لیکن موصوف کو اِس امر کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ نجدی اور ہندی وہابیت اصل میں ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں، شراب وہی ہے بس بوتلیں جدا جدا ہیں۔ موصوف کی تصریح اُن کے اپنے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبداء ایک ہی ہے یعنی قرآن و حدیث۔ دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ اِن دونوں تحریکوں (نجدی اور ہندی تحریک وہابیت) کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کو دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے، جن میں بنیادی چیز توحید

---

[۱] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر، ہندوستان میں وہابی تحریک مطبوعہ کراچی، ص ۵۲

اور ترک بدعات پر زور دیتا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی التوحید (کتاب التوحید)
اور شاہ اسمٰعیل کی تقویۃ الایمان ان بنیادی امور پر زور دینے میں متفق الخیال
ہیں۔[1]

ت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندی اور نجدی وہابیت کی مماثلت تفسیر کر لی، باقی رہا ان
ولی کہ دونوں تحریکیں اپنا مبداء اور مخرج قرآن و حدیث کو ٹھہراتی ہیں، اور توحید و ترک
ت پر زور دیتی ہیں تو اس سلسلے میں ہماری رائے تو یہی ہے کہ آج تک ایسا کون سا
ہب گروہ کھڑا ہوا ہے جس نے اپنے مخصوص نظریات کا مخرج قرآن و حدیث کو نہ ٹھہرایا
رہی توحید والی بات، تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی پیمانۂ توحید سے ناپ کر تو اولین
ج نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انہیں مسلمان جاننے والے
ہ کرام اور تابعین عظام کو مشرک اور اسلام سے خارج ٹھہرایا تھا۔ اگر اسی ساختہ
حید سے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)
ہ بارہ صدیوں کے مسلمانوں کو مشرک بنا کر جہنم کا ایندھن ٹھہرائیں، ساری امت محمدیہ کو
شرکوں کا جگھٹا بتائیں تو اتنی بات پر متفق ہونے کی وجہ سے یہ دونوں حضرات اس ساختہ توحید
ایمان رکھنے والوں کے نزدیک کیوں نہ مصلح اور ریفارمر قرار پائیں؟ ڈاکٹر صاحب نے
دونوں تحریکوں میں دو اختلافی امور بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے امر دوم اور موصوف کا
بعد ملاحظہ ہو:

"ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرۂ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے
اس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے
کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اسی کے بعد سید احمد نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات
سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ دونوں
تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک ماخذ استفاضہ اور یکساں حالات و

---

[1] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۵

کوائف کی موجودگی کا نتیجہ تھا، نہ کہ ایک دوسرے کے تتبع و تقلید کا" ۱۔

پروفیسر الحاج فیروز الدین روحی اس سلسلے میں اپنی تحقیقات عالیہ یوں پیش فرماتے ہیں

"اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں عرب میں بھی وہاں کی مذہبی و سماجی خرابیوں کی بنا پر تجدید و اصلاحِ دین کی تحریک شروع ہوئی، جس کے قائد شیخ محمد بن عبدالوہاب تھے، ترکی کا اُس وقت عرب پر اقتدار تھا، لہٰذا ترکی کو نقصان اٹھانا پڑا، پھر اس تحریک کو مصر کے بادشاہ محمد علی پاشا نے دبا دیا اور یہ دونوں ملک انگریز کے دوست تھے، وہاں اس تحریک کو وہابی کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ لہٰذا ہندوستان میں بھی سید احمد شہید کی تحریک کو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی شاخ اور تتمہ بنایا، بلکہ بعض انگریز مصنفین نے یہاں تک لکھ مارا کہ حضرت سید احمد شہید جب حج کر گئے تو شیخ محمد بن عبدالوہاب سے پڑھ کر آئے، حالانکہ سید احمد کی پیدائش ۱۷۸۶ء کی ہے اور شیخ کا انتقال ۱۷۸۷ء میں ہو جاتا ہے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں تحریکیں ایک ہی بنیاد اور ایک ہی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں، اور اُس وقت کے ماحول کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی طریقۂ کار دونوں نے اختیار کیا" ۲۔

حیران ہوں کہ پروفیسر فیروز الدین روحی صاحب کی اس عبارت اور اُن کی اس ساری کتاب کو دیکھ کر کوئی موصوف کو کس مضمون کا پروفیسر تصور کرے گا۔ اردو، عربی تاریخ اور اسلامیات میں کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ اردو کی ادبی شان تو پہلے ملاحظہ فرمایا عربی دیکھیے تو ساری کتاب میں ایسی کوئی عربی عبارت نظر آئے گی جو صحیح نقل کر سکے ہوں، اسلام سے مراد صرف وہابیت کی قصیدہ خوانی ہو کر رہ گئی اور وہ بھی ثبوت کی محتاج اور تاریخ دانی کا یہی عبارت کافی رہے گی۔ مزید اور ملاحظہ فرمائیے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کا سن وفات یہاں ۱۷۸۷ء لکھا ہے لیکن دوسری جگہ:

۱۔ ابو سلمان عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۰،۵

۲۔ فیروز الدین روحی، پروفیسر: آئینہ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۴۵-۴۶

• شیخ نے مسلسل پچاس سال دعوت و تبلیغ کے بعد شوال یا ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ مطابق جولائی ۱۷۹۲ء میں رحلت کی۔ شیخ نے چار لڑکے اور ہزارہا شاگرد چھوڑے۔[1]

نالۂ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!

علی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی اس سلسلے میں اپنی تحقیق کا نقارہ کچھ عجیب انداز میں بجایا ہے۔ ذرا کان لگا کر سماعت کیجیے:

"مولوی اسمٰعیل جو ہندوستان میں فرقۂ موحدیہ کا بانی ہے، کبھی کسی نجدی شیخ سے نہیں ملا اور نہ اس نے اُن کی کوئی کتاب دیکھی۔ اس نے وہی تعلیم دی جو کتاب اللہ اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بتاتی ہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی پیدائش سے پہلے محمدیت کی بنا اس کے خاندان میں پڑ چکی تھی اور جو کچھ اس نے اور اس کے خاندان نے حاصل کیا وہ اپنے ہی باپ دادوں سے۔ اسلامی دنیا میں ایک ہی خاندان ہے جسے غیر کے شاگرد بننے کا افتخار حاصل نہیں ہوا۔ یورپین کا یہ لکھنا کہ محمد بن عبدالوہاب نے ہندوستان تک اپنے مذہبی اصول کے خیالات پھیلائے محض لغو اور بے سروپا بات ہے جس بُرے پیرایہ میں محمدیوں کو، جنہیں سخت غلطی سے وہابی کہا ہے، انگریز مصنفوں نے گورنمنٹ کو دکھایا ہے، سخت حقارت انگیز کارروائی ہے۔ گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقۂ اہلِ حدیث نے کس قدر تسلیم کر لیا ہے اور اس کے کیسے فرماں بردار، مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں۔ اُن پر کیا، ہندوستان کے کُل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی اُن کارروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف کبھی

---

[1] فیروز الدین روحی، پروفیسر، آئینۂ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۲

جاتی ہیں۔[1]

موصوف کے یہاں تین دعوے مذکور ہوئے ہیں جنھیں ہم نمبروار بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ موصوف کا یہ دعویٰ کسی سنی یا وہابی تک کو بھی تسلیم نہیں ہوسکتا۔ باب سوم میں ہم کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی مطابقت دکھائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

۲۔ دوسرا دعویٰ کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا مذہب اپنے خاندان کے مطابق تھا اور اِس محمدی مذہب کی بنا پہلے ہی اِن کے خاندان میں پڑ چکی تھی۔ یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ گزشتہ صفحات میں قدرے وضاحت کی جاچکی ہے۔

۳۔ تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے پیرو، جو پہلے محمدی اور بعد میں اہلحدیث کہلائے، وہ برٹش گورنمنٹ کو بابرکت تسلیم کرتے اور اُس کے پورے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ یہ دعویٰ اُنھوں نے جس عاجزانہ اور دلیرانہ انداز میں کیا ہے، اُن کے پیشِ نظر ہر کوئی کہہ اُٹھے گا کہ: شعر

کشش لفظوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

حقیقت کچھ اِس طرح معلوم ہوتی ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے کتاب التوحید کو دیکھا یا یہ کتاب اُنھیں دکھائی گئی۔ موصوف نے دل وجان سے اِس کے مندرجات کو قبول کیا اور اِس کے خیالات و نظریات کی ڈھکے چھپے لفظوں میں تبلیغ شروع کردی، شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۲۷ء) تک شکایتیں پہنچیں۔ دونوں حضرات نے بالواسطہ اور بلاواسطہ سمجھایا بجھایا لیکن بے نالہ و بے سود رہا۔ یہ دونوں بزرگ وفات پاگئے تو موصوف کی باگیں ڈھیلی ہوگئیں، خوب کھل کر کھیلنے لگے۔ قانونی طور پر نقصِ امن کے پیشِ نظر پابندی لگائی تو زاد ہی انکشاف ہوا، حکومت کی پشت پناہی صاف نظر آنے لگی۔ ساتھ کار دلائل کے

---

[1] حیرت دہلوی، مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۶، ۲۹۶

پہلے علمائے کرام نے محاسبہ شروع کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور عقیدتمندوں نے مولوی محمد اسمٰعیل
ی اور مولوی عبدالحی دہلوی کا محاسبہ شروع کر دیا۔ ایک طرف یہ دونوں حضرات تھے
ر دوسری طرف سارے ملک کے علمائے اہلسنت اور پورا خاندان ولی اللّٰہی۔ جب
دلائل کے میدان میں ان حضرات کا جید گھٹنا شروع ہو گیا تو جو بھولے بھالے مسلمان ان
حضرات کے دلکش الفاظ کے چکر میں پھنس گئے تھے وہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور جو تھوڑی
ت جمعیت فراہم کی تھی وہ بھی منتشر ہو گئی۔

ان حالات میں دوسرا منصوبہ تیار کیا گیا جو پہلے کی سراسر ضد ہے۔ برٹش گورنمنٹ سے
سکھوں کے خلاف جہاد کا دلکش نعرہ سمجھایا تو بارش ہی کا دماغوں میں سودا سما گیا اور
یک کہہ کر قبول کر لیا۔ اب فکر لاحق ہوئی لاؤ لشکر کی، اس کے لیے جہاد کے فضائل اور
سکھوں کے مظالم پوری دلسوزی سے بیان کیے جانے لگے، ساتھ ہی سید احمد صاحب
بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی وہ شان بیان کی جانے لگی کہ لوگوں کی عقلیں حیرت
رہ جاتیں۔ جملہ اولیائے کرام سے انھیں بڑھایا گیا بلکہ صاحب عصمت و وحی ٹھہرا کر انبیا
صف میں بٹھایا گیا۔ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشابہ اور باری تعالیٰ
سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہونا سنایا گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تک صعود اور اس سے
مصافحہ و [illegible] کی کہانیاں گھڑ کر سنائی گئیں، صراط مستقیم کتاب لکھ کر اس میں
فضائل و کمالات درج کر کے، متبعین کے دلوں اور دماغوں میں سید احمد صاحب
شان یکتائی کا تصور پیدا کر کے ان کا پجاری بنایا گیا۔

سید احمد صاحب نے بھی اپنے منصب کا پورا طرح لحاظ رکھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل
اور مولوی عبدالحی دہلوی ان کی جو صفات بیان کرتے، جس مقام پر انھیں بٹھاتے جاتے
کمال دانشمندی سے اس کے مطابق پیشین گوئیاں اور بشارتیں واضح رہتے۔ مکاشفہ
اور مقدس لوگوں کی روحیں موصوف سے اسی لیے باتیں کرنے لگ جاتیں، جنات حاضر ہو
اولیائے متقدمین تشریف لا کر نوازتے، انبیائے کرام بشارتیں سنانے آتے، مقدس

ہستیاں آکر غسل دیتیں اور کپڑے پہنانے کی خدمات انجام دے جاتیں۔ پنجاب کا بادشاہ بننے کی خوشخبری بھی سناتے نیز افغانستان کا نفاق، چین کا کفر اور ہندوستان کا شرک اپنی زندگی میں مٹانے کی بشارت بھی بالہام خداوندی سناتے اور اس پر حلف اٹھاتے تھے۔ غرضیکہ تالیفِ قلوب اور اجتماعِ جمعیت کا وُہ کون سا خانہ ساز روحانی حربہ تھا جو کام میں نہ لایا گیا ہو۔ علمی باتوں پر ٹوکا جا سکتا ہے۔ دلیل اور ثبوت کا مطالبہ سخت دشواری میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن روحانی معاملات کا چکر، ایک پنتھ دو کاج ہے جمعیت حاضر اور ثبوت خارج از بحث۔ یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام، ہلدی لگی نہ پھٹکڑی، حکومت نے ولایت و نبوت چپکے عطا کر دی۔ یہیں تدریجی مراحل طے کرنے تھے لہٰذا ہر مقام کے حصول کا مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) کی طرح بتدریج اعلان کرتے جا رہے تھے لیکن منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی بالاکوٹ کا ایسا مقام آ گیا کہ یہ منصوبہ وہیں دفن ہو کر رہ گیا اور مرزا غلام احمد صاحب ہی وُہ فردِ واحد نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے ورنہ کتنے ہی سید احمد صاحب جیسے خواہشمند حضرات منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہوتے رہے۔

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے دونوں منصوبے ایک دُوسرے کے سراسر خلاف ہیں۔ پہلی تحریک جو شرک و بدعت کے خلاف بتائی جاتی ہے اس کی وجہ یہی ظاہر کی گئی کہ مسلمان اکابر پرستی اور شرک میں گرفتار تھے۔ لیکن ان مصلح کہلانے والوں نے دُوسری تحریک میں سید احمد صاحب کی پرستش کا وُہ اہتمام کیا جس کی نظیر اُن کے اصطلاحی مشرکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ سید احمد صاحب کو صاحبِ وحی عصمت بتایا جا رہا تھا باری تعالیٰ شانہٗ تک صعود اور اُس کی ہمکلامی کے شرف سے موصوف کو مشرف بتایا جاتا تھا۔ حالانکہ شریعتِ مطہرہ کی رُو سے کسی کے بارے میں ایسی باتوں کا عقیدہ رکھنا اُسے نبی ماننے کا مترادف ہے۔ ان حضرات کے پہلے منصوبے کی ترجمان "تقویۃ الایمان" ہے اور دُوسرے منصوبے کا صحیفہ "صراط المستقیم" کو بنایا گیا۔ یہ دونوں کتابیں اگر انصاف کی نظر سے دیکھی جائیں تو صاف دکھائی دے گا کہ دونوں ایک دُوسری کے خلاف ہیں۔

دوسرا منصوبہ تو مکمل طور پر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں دفن ہو گیا، کیونکہ جب چلنے والا ہی نہ رہا تو آگے بات کیسے چلتی۔ پہلے منصوبے کے اثرات تقویۃ الایمان کتاب کی صورت باقی رہ گئے کہ مٹتے مٹاتے بھی موصوف اِس فتنے کی چنگاری دہلی و کلکتہ میں چھوڑ گئے۔ تقویۃ الایمان کے سنِ تالیف کے بارے میں غلام رسول مہر کی تحقیق یہ ہے :

"یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ تقویۃ الایمان کس زمانے میں لکھی گئی۔ اِس میں ایک مقام پر کعبہ مقدسہ کے صحن کا منظر پیش کیا گیا ہے، جس سے دل پر اثر پڑتا ہے کہ یہ منظر چشم دید ہے، لہٰذا سمجھا جا سکتا ہے کہ کتاب سفرِ حج سے واپس آ کر لکھی گئی۔ مُلا صاحب بغدادی نے بعض اصحاب کی انگیخت سے تقویۃ الایمان پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ شاہ شہید نے اُس کے جواب میں ایک خط کانپور سے لکھا تھا، جس پر ۱۲۴۰ھ درج ہے۔ اِس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب سفرِ حج سے مراجعت پر ۱۲۴۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی۔ اُس زمانے میں شاہ شہید ہمہ تن دعوتِ تنظیم و جہاد کے لیے وقف ہو چکے تھے اور ۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ کو وہ جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔" [1]

کیا ہی اچھا ہوتا کہ جناب غلام رسول مہر سنِ تصنیف کے بارے میں یوں تصریح کر دیتے کہ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں سارے ولی اللّٰہی خاندان اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفّٰی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے خوشہ چین علمائے دہلی نے دورانِ وہابیت و خارجیت سے جو مناظرہ و مباحثہ کیا تھا، تقویۃ الایمان اُس سب سے یعنی تاریخی مناظرے سے کچھ عرصہ پہلے لکھی گئی تھی کیونکہ دورانِ مباحثہ اِس رسالے کا ذکر آیا تھا۔ لیکن موصوف ایسی تصریح کرنے سے جملہ وہابی مورخین و علماء کی طرح کیوں گریز کرتے جبکہ انہوں نے اِس خارجیت کے ڈانڈے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفّٰی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نیز شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ (المتوفّٰی ۱۲۳۹ھ/

---

[1] غلام رسول مہر، مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۲، ۲۱

۱۶۲۴ء) بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) سے ملانے کی دھاندلی بڑے اہتمام سے عیاں ہے۔ اس کی اشاعت کے بارے میں موصوف یوں رقمطراز ہیں:

"تقویۃ الایمان جس کے نئے ایڈیشن کے تعارف میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، پہلی مرتبہ ۱۲۴۲ھ/ ۲۷-۱۸۲۶ء میں چھپی تھی، جب شاہ شہید، امیر المومنین سید احمد بریلوی اور جماعت مجاہدین کے ہمراہ وطن مالوف سے ہجرت کر کے جا چکے تھے اور ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے جہاد بالسیف کا آغاز ہو چکا تھا۔"[1]

واقعی غلام رسول مہر صاحب بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں کیونکہ ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے اس طرح کا جہاد بالسیف تو نظام اور مرہٹے بھی کر چکے تھے، جب وہ انگریزوں کے دست و بازو بن کر کئی دفعہ شیرِ دکن سلطان فتح علی ٹیپو شہید پر چڑھ دوڑے تھے۔ اس تحریکِ جہاد کی حقیقت اسی کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی حکمتِ عملی بھی دیدنی ہے کہ جب تک دہلی میں رہے تو وہابیت کے لیے میدان ہموار کرتے رہے اور جب جہاد کے نام سے مغربی ہند کی سرحد پر پہنچ گئے اس وقت تقویۃ الایمان کو شائع کروا دیا گیا، تاکہ اس کی اشاعت سے جو آگ بھڑکنی ہے وہ عدم موجودگی میں بھڑکے اور مصنف مواخذے سے محفوظ رہے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے تقویۃ الایمان کی تفریط کے بارے میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے:

"مسلمانوں کی شدتِ مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبۂ اصلاح غلو کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تفریط تھی تو دوسری جانب افراط۔ شاہ اسمٰعیل صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کیا ..... وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

---

[1] غلام رسول مہر، مقدمہ تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۱۶

پہلے عربی میں، پھر اُردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز کیا گیا۔ اِس کا خود مصنّف کو بھی احساس تھا" [1]

یکین احمد سکندرپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی) نے مصنف تقویۃ الایمان کے
ے میں اپنے تاثرات یُوں قلمبند کیے:

"جب سے اِسلام ہندوستان میں آیا، قریب ہزار برس ہُوئے، کبھی ایسا ترکِ تقلید و جدال فی الدین کا چرچا نہ تھا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی یہ نیا دینِ اسلام پر لائے" [2]

ا مفتی سیّد عبد الفتاح، اشرف علی گلشن آبادی نے تقویۃ الایمان کی پہلی اشاعت
سن طباعت وغیرہ کے ساتھ تقویۃ پر یُوں تبصرہ کیا ہے:

"کتاب تقویۃ الایمان مؤلفہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی، شہر کلکتہ میں مطبع احمدی باہتمام سیّد عبد اللہ بن سیّد بہادر علی ۱۲۴۲ھ میں مطبوع ہوئی ہے۔ مضمونِ شرک و بدعت کے دُور کرنے کے واسطے جو آیات بُتوں کی شان میں اور بُت پرستوں کے واسطے نازل ہُوئی ہیں، سو انبیاء و اولیاء کی شان میں لکھیں اور مسلمانانِ اہلسنّت و جماعت و مقلدینِ ائمۂ اربعہ عام و خاص سب کو مشرک و بدعتی کہہ دیا اور فاتحۂ اموات و زیارت، دہم، چہلم، نذر و نیاز کو باطل کہا اور اعتقاد میں اہلِ سنّت و جماعت کے بہت سی بدعتیں داخل کر دیں اور (ابن) عبد الوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا سارا ترجمہ شرح و بسط سے کیا۔ غیب اضافی کو غیب مطلق بنایا اور اہانت و حقارتِ انبیاء و اولیاء بدرجۂ کمال پہنچایا۔ ۱۲۵۱ھ میں شہر مدراس کے نواب والاجاہ کے حضور میں مجمع علماء کے درمیان مفتی صبغۃ اللہ

---

[1] عبد الشاہد خان شروانی، مولوی: باغی ہندوستان، ص ۱۱۴

[2] وکیل احمد سکندرپوری، مولانا: وسیلہ جلیلہ، مطبع مصطفائی، ۱۳۰۱ھ، ص ۴۴

قاضی الملک اور افضل العلماء محمد ارتضا علی خان مفتی صدر عدالت سرکار مدراس نے مولوی محمد علی رامپوری خلیفۂ سید احمد سے کتاب مذکور میں چند مقامات پر مباحثہ کیا اور معتقد مذکور کو کافر ثابت کر دیا اور اس مباحثے کی حقیقت اور استفتاء "تحفۂ محمدیہ" کے صفحہ ۱۵ میں مرقوم ہے۔[1]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تو سکھوں سے جہاد کرنے کا نام نہاد اعلان کرتے ہوئے ۱۲۴۱ھ میں صوبہ سرحد کی طرف چلے گئے۔ موصوف کی عدم موجودگی میں تقویۃ الایمان کا انگریز کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ سے ۱۲۴۲ھ میں شائع ہونا بلکہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے لاکھوں کی تعداد میں انگریزوں نے تقویۃ الایمان شائع کی اور پورے ہندوستان میں جہاں تک انگریز اسے پہنچا سکتے تھے وہاں تک مفت پہنچاتے رہے۔ کیا یہ افسوسناک صورت حال اہل فکر و نظر کے لیے لمحۂ فکریہ نہیں ہے؟ دہلی کے ایک نیم مولوی کی تصنیف کی اس کی نشر و اشاعت ایسٹ انڈیا کمپنی کرے، آخر کیوں؟ قاضی احسان الحق نعیمی مرحوم نے متحدہ ہندوستان میں اس خارجیت کی تخم ریزی کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ وبا سرزمین نجد سے اٹھی۔ صحیح بخاری شریف کی حدیث میں حضور سید انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صدہا سال پہلے اس کی خبر دی تھی۔ وہ آگ بھڑکی، وہ فتنہ پیدا ہوا اور جب ارباب نجدی کے گھر سے نکل کر عرب کے بعض مقامات میں پہنچا، وہیں سے رد کیا گیا۔ کسی سرزمین نے اسے قبول نہ کیا۔ حجاز میں اس کے قدم نہ جمے، عراق و یمن نے اس کو جگہ نہ دی، کوفہ و بصرہ میں، مصر و شام میں، ترکی و ایران میں، غرض دنیا کے کسی مقام میں، کسی قلمرو اور کسی ولایت میں اس فتنہ کو دخل نہ ہوا اور اس تلخ تخم کو کسی سرزمین نے قبول نہ کیا۔ نجد کے چھوٹے اور خشک اور بے رونق خطے کے چند خشک دماغ، درندہ صفت انسانوں کے دماغ میں وہابیت کا

---

[1] عبدالفتاح اشرف علی گلشن آبادی، مفتی، جامع الفتاویٰ، جلد دوم، ص ۶۱

تخیل گھومتا رہا۔ مگر افسوس کہ جو چیز دنیا کے ہر خطہ نے ٹھکرا دی تھی اُس کو ہندوستان میں جگہ ملی، اُس کا تخم دلّی میں لگایا گیا اور وہ جب کچھ پھوٹا تو اُس کو دیوبند میں تربیت کیا گیا۔ وہاں وہ اس قدر بڑھا کہ اُس کی شاخیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں اور اُن سے اِس ملک کی فضا مسموم ہو گئی اور اُس کے زہریلے اثر نے ملک کے بہت سے نونہالوں کو برباد کر دیا اور فساد کی آگ لگا دی۔ زمانے گزر گئے مگر یہ فتنہ وقع نہ ہُوا۔" [۱]

موافقین یا مخالفین کی آراء پیش کرنے کے بجائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود مولوی اسمٰعیل دہلوی کے اپنے تاثرات تقویۃ الایمان کے بارے میں پیش کر دیے جائیں۔ موصوف کا ایک بیان یُوں نقل کیا گیا ہے:

"میں جانتا ہُوں کہ اِس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ بھی آ گئے ہیں، بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً اُن امُور کو جو شرک خفی ہیں، شرک جلی لکھ دیا ہے۔ اِن وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شورش ضرور پھیلے گی۔" [۲]

دیوبندی حضرات کے حکیم الامت یعنی مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ ۱۹۴۳ء) مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:

"مولوی اسمٰعیل شہید موحّد (وہابی غیر مقلد) تھے، چونکہ محقق تھے، چند مسائل میں اختلاف کیا اور مسلک پیرانِ خود مثل شیخ ولی اللہ وغیرہ پر انکار فرمایا۔" [۳]

---

[۱] ماہنامہ السواد الاعظم، مراد آباد: بابت شعبان ۱۳۴۹ھ، ص ۳۔
[۲] عبدالشاہد خاں شروانی، مولوی: باغی ہندوستان، ص ۵۔
[۳] اشرف علی تھانوی، مولوی: امداد المشتاق، ص ۹۔

قارئین کرام! آپ نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا اعتراف ملاحظہ فرمایا کہ موصوف نے شرک خفی کو شرک جلی ٹھہرایا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں؟ کیا کوئی شرعی احکام کی حقیقت بدلنے کا مجاز ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس کا صاف سیدھا جواب یہی ہے کہ موصوف نے خوارج کے مذہب کو قبول کر لیا تھا اور خارجیت کا خاصہ یہی ہے کہ خارجی ونجدی عینک لگا کر دیکھنے سے سارا جہان مشرک ہی مشرک نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی تھانوی صاحب کی تصریح بھی ملاحظہ فرمائی کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا مسلک اپنے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک کے خلاف تھا۔ لیکن کہاں تک داد دی جائے اُن حضرات کے دین و دیانت کی، جو مصنف تقویۃ الایمان اور اُن کے متبعین کو ولی اللّٰہی مکتبۂ فکر والے بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہابی مفکر ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ اسمٰعیل شہید کی منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ ولی اللہ صاحب کی زبان بولتی نظر آتی ہے۔"[1]

جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، جو کسی کے مقلد ہونے کے روادار نہیں مگر پنی تحقیق کی بنیاد پر عقاید و نظریات کی عمارت تعمیر کیا کرتے ہیں۔ جو محقق، مفکرِ اسلام، نابغہ اور عبقری اسلام تک مشہور کیے جاتے ہیں لیکن یہاں آ کر اُن کی تحقیق و عبقریت کسوریلی کے مزار کی بھینٹ چڑھ گئی! کیا واقعی سید احمد صاحب کے خطوط کی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو پھنسانے کے لیے جھوٹی پیشگوئیاں سنائی تھیں! ...

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۳

ستقیم کتاب کے مندرجات کی طرح شاہ صاحب نے بھی وحی وعصمت کا دعویٰ کیا تھا
ب معصوم اور اُس سے ہمکلام ہونے، مصافحہ کرنے اور لین دین کرنے کے مدعی
تھے؟ کیا شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں شرکِ خفی کو شرکِ جلی ٹھہرا کر مسلمانوں کو
بنانے کی مہم چلائی تھی؟ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ہم مؤدبانہ عرض کرتے ہیں کہ ایسے
ے سے حقیقت ہرگز بدل سکے گی۔ دنیا نے دنی میں آپ حضرات پروپیگنڈے کے
ر مسلمانوں کی اکثریت سے ایسا ہی منوا بھی لیں تو حاصل کیا ہوا؟ کیا جب بارگاہِ
دی میں حاضر ہو کر جواب دینا پڑے گا اُس وقت یہ حربے کام آسکیں گے؟ کیا یہ
لی وہاں بھی چل سکے گی؟ موصوف آگے اِن ساختہ مصلحین کے بارے میں یوں
ز ہیں:

سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل صاحب دونوں روحاً و معناً ایک وجود رکھتے
ہیں اور اِس وجودِ متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ
صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔[1]

سمجھنے کو مودودی صاحب جو چاہیں سمجھیں لیکن اتنی وضاحت کرنے کا حق ہمیں بھی از روئے
ل حاصل ہے کہ مسلمانوں کے دین کی تجدید کرنے والے کا گروہ اہلسنت وجماعت سے
ضروری ہے کیونکہ مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ کی مصداق یہی جماعت ہے اور اِتَّبِعُوْا
ہِ الاَعْظَمَ اسی کے متعلق فرمایا گیا تھا اور اِس سے جُدا ہونے والوں کے حق میں
مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ سنایا گیا ہے۔ دریں حالات مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی جو
ت کے مسلک اور زمرۂ اہلسنت وجماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے وہ مسلمانانِ اہلسنت
عت کے مجدد ہرگز نہیں ہو سکتے۔ ہاں اپنی جماعت میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی
مجدد بنائے جائیں یا نبی، مسلمانوں کا اُن کی تجدید سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ موصوف نے
آباؤ اجداد کے مذہب اور ناجی گروہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا۔ یہ اُن کا اپنا

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا: تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۵

فیصلہ تھا اور خود وہ ناجی گروہ سے علیحدہ ہوئے تھے۔

بہر حال مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے جب اس خارجیت یعنی محمد ابن عبد الوہاب نجدی کی وہابیت کو تقویۃ الایمان کے ذریعے اور اس منظر عام پر آنے سے پہلے تقاریر میں اس کے بعض مضامین بیان کرنے شروع کیے تو علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۰۸ھ/ ۱۸۶۱ء) نے جید علمائے کرام کے دوش بدوش بلکہ پوری سرگرمی سے موصوف کا محاسبہ کرنا شروع کیا، تاکہ یہ فتنہ یہیں دب جائے اور مسلمانانِ اہلسنت وجماعت اس بلائے ناگہانی سے محفوظ رہیں۔ اسی لیے علمی میدان میں آپ نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا ناطقہ بند کر دیا۔ مولانا نسیم احمد امروہی اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

"مولانا خیرآبادی نے ایک رسالہ اس سلسلے میں لکھا اور ایک معقولی عالم کی حیثیت سے معقول انداز میں تقویۃ الایمان کے بعض مضامین پر اعتراضات کیے۔ اس رسالے میں نہ تو ذوقِ کفرسازی کی تسکین تھی، نہ سبّ وشتم، صرف اپنے تاثرات کو پیش کیا گیا تھا۔"[1]

کاش! موصوف نے جوشِ عقیدت میں حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ آخر بھولے بھالے مسلمانوں کو صحیح صورت حال سے بے خبر رکھنا بلکہ واقعات کو اُن کے برخلاف دکھانے میں دین کی کون سی خدمت اور آخرت کے مفاد کا کون سا راز مضمر ہے؟ علامہ فضل حق خیرآبادی علیہ الرحمہ نے جن لفظوں میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے بارے میں حکم شرع بیان فرمایا، وہ تین سوالوں کے مندرجہ ذیل جوابات سے واضح ہے۔

"جواب سوالِ اوّل ایں است کہ کلام قائل مذکور سراپا کذب ومکر وفریب وغرور است، چہ او نفیِ سبب بودن شفاعت برائے نجاتِ گنہگاراں ونفیِ شفاعتِ وجاہت وشفاعتِ محبت از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحضرات سائر انبیاء وملائکہ واصفیا میکند، ایں اعتقادِ او

---

[1] ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ، بابت رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ، ص ۵

خلافِ کتابِ مبین و احادیث سید المرسلین و اجماعِ مسلمین است کما اثبت فی مقام الاوّل مفصّلا وقد بان بطلان نص کدتہ فی المقام الثانی مدلّلا۔

جواب سوالِ دوم ایں است کہ کلامِ اُو بلا تردّد و اشتباہ بر استخفافِ منزلت و جاہ آں سرور، مقربان بارگاہِ حضرتِ الٰہ و انتقاص شانِ سائرِ انبیاء و ملائکہ و اصفیا و شیوخ و اولیاء، اشتمال و دلالت دارد۔ چنانچہ در مقامِ ثالث مذکور و فیما سبق مبرہن و مسطور است۔

جواب سوالِ ثالث ایں است کہ قائل ایں کلامِ لاطائل از روئے شریعِ مبین بلا شبہ کافر و بے دین ہست، ہرگز مومن و مسلمان نیست و حکم اُو شرعاً قتل و تکفیر است و ہر کہ در کفرِ اُو شک آرد یا تردّد دارد یا ایں استخفاف را سہل انگارد، کافر و بے دین و نا مسلمان و لعین است، الّا در کفر و بے دینی کمتر ہست۔ از کسیکہ ایں کلام را از عقائدِ ضروریۂ دین شمارد۔ بعکس در کفر با قائل ہمسر بلکہ در استخفاف از و بالاتر است۔ ملخصاً

(از تحقیق الفتوٰی فی ابطال الطغوٰی) [1]

قارئین کرام کی معلومات کے لیے یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا فضل حق (خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) کی جلالتِ علمی کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔ موصوف کے بارے میں سر سید احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:

"مستجمع کمالاتِ صوری و معنوی، جامعِ فضائل ظاہری و باطنی، بنائے بنائے فضل و افضال، بہار آرائے چمنستانِ کمال۔ گلِ اصابت رائے، مسند نشینِ دیوانِ افکار رسائے، صاحبِ خُلقِ محمدی، موردِ سعادت ازلی و ابدی، حاکم محاکم مناظرات، فرمانروائے کشور محاکمات، عکس آئینۂ

---

[1] فضلِ رسول بدایونی، مولانا، سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۵۹، ۶۰

صافی ضمیری، ثالثِ اثنین بدیعی وحریری، الحق وقت و موزعی ادان، فرزدقِ عہد و لبیدِ دوران، مُبطلِ باطل و محقق حق، مولانا محمد فضل حق۔ یہ حضرت خلف ارشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر اللہ لہ المنعام کے اور تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمت بابرکت میں کی ہے۔ زبانِ قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخرِ خاندان لکھا اور فکرِ دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا، فخرِ جہاں پایا۔

جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بلکہ فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس گروہ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سُنا، دعوئ کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ بایں ہمہ کمالاتِ علم و ادب میں ایسا عَلَمِ سرفرازی بلند کیا کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شُستہ محضرِ عزِ درجِ معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبعِ رسا دستاویزِ بلندیِ معارج ہے۔ سحبان کو ان کی فصاحت سے سرمایۂ خوشِ بیانی اور امراء القیس کو ان کے افکارِ بلند سے دستگاہِ عروجِ معانی۔ الفاظِ پاکیزہ ان کے رشکِ گوہرِ خوش آب اور معانیِ رنگین ان کے غیرتِ لعلِ ناب۔ سرو ان کی سطورِ عبارت کے آگے پابہ گِل اور گُل ان کی عبارتِ رنگین کے سامنے خجل ہے۔“ [1]

مولانا رحمٰن علی مصنف تذکرہ علمائے ہند نے علامہ فضل حق خیرآبادی کے تذکرہ میں یہی لکھا:

”در علوم منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و استحضارے فوق البیان داشت۔“ [2]

---

[1] سرسید احمد خاں، آثار الصنادید، ص ۵۹۲، ۵۹۳

[2] رحمٰن علی، مولانا: تذکرہ علمائے ہند فارسی، ص ۱۶۴

عبارت کا ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں کیا ہے:

"علوم منطق، حکمت، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری میں اپنے
ہم عصروں میں ممتاز اور اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔" [1]

پروفیسر صاحب مذکور اسی کے حاشیے میں علامہ مرحوم کے بارے میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

"مولانا فضل حق خیر آبادی علوم معقول کے امام تھے ...... جنگ آزادی
۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں
کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں
گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ جزیرہ انڈمان
بھیجے گئے۔ وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔" [2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے چچا زاد بھائی یعنی مولانا مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء) بن شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کا ڈٹ کر رد کیا۔ جامع مسجد دہلی کے تاریخی مباحثہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہاں بھی اسمٰعیل صاحب سے برملا کہا کہ آپ نے جو اپنے خاندانی مسلک کے خلاف یہاں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی بے دینی کو رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس حرکتِ قبیحہ سے باز آجانا چاہیے، کیوں اپنے اکابر کے کارناموں پر پانی پھیرنے اور ننگِ خاندان بننے کی ٹھان لی ہے؟ لیکن مصنفِ تقویۃ الایمان موقع پر اقرار کر لیتے مگر بہ تالہ اُس کی پیروی سے ذرا نہیں ہٹتے تھے۔

چونکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء) نے آخر میں ضعفِ بصارت سے معذور ہوں ورنہ کتاب التوحید کا رد اسی شرح و بسط

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۰۲

[2] ایضاً، ص ۲۰۳

لکھنا چاہتا ہوں جس طرح روافض کے رد میں کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی ہے۔ شاہ صاحب تو کتاب التوحید کا رد نہ لکھ سکے کیونکہ بصارت ہی جواب دے گئی تھی اور اس کے بعد پیغامِ اجل آ پہنچا تھا، لیکن سفرِ آخرت سے پہلے اتنا ضرور کر گئے کہ مصنف "تقویۃ الایمان" اپنی وراثت و خلافت سے محروم کر گئے تھے۔ آپ کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ "کتاب التوحید" نے "تقویۃ الایمان" کا روپ دھار لیا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کو ان کے دوسرے بھتیجے شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین نے اس طرح پورا کیا کہ تقویۃ الایمان کے رد میں "معید الایمان" شرح و بسط سے لکھی اور تقویۃ الایمان کے مندرجات کو اسلام کے خلاف اور اپنے خاندانی معتقدات و مسلک اہلسنت و جماعت کے خلاف ایک چیلنج ثابت کیا۔ علمائے خاندانِ دہلی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وارثوں نے "معید الایمان" کی تصدیق و تائید کر کے تقویۃ الایمان کے نظریات سے اپنی برأت کا اظہار کیا تھا۔ مولانا بدر الدین احمد صاحب نے مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کی ان کاوشوں کا یوں تذکرہ کیا ہے:

"شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے اور شاگرد، مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی اور مولانا شاہ محمد موسیٰ دہلوی، جو مولانا شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے اور خود مولوی اسمٰعیل دہلوی کے چچازاد بھائی تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی اسمٰعیل کے عقائدِ باطلہ اور ان کی وہابیتِ فاسدہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مولوی اسمٰعیل کے رد میں فتاویٰ اور رسالے مرتب کیے جن میں مولوی اسمٰعیل کو ان کے عقائد باطلہ کے باعث گمراہ اور کافر قرار دیا اور حق آشکارا کرنے میں رشتۂ خاندانی کا کوئی پاس و لحاظ نہ کیا۔ حضرت مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی نے خاص تقویۃ الایمان کے رد میں "معید الایمان" لکھ کر واضح کر دیا کہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا علمی و نسبی گھرانہ وہابیت نیز تقویۃ الایمان سے متنفر و بیزار ہے[1]

[1] بدر الدین احمد، مولانا: سوانح اعلیٰ حضرت، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۳۸، ۱۳۹۔

مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے مولانا مخصوص اللہ
بن شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا کہ اپنے
بھائی محمد اسمٰعیل دہلوی اور اُن کی تصنیف "تقویۃ الایمان" کے بارے میں کیا خیال ہے؟
آپ کے خاندانی معتقدات کے مطابق ہے یا مخالف؟ اپنے سات سوالات اور
مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمٰن کے جوابات کو مصنف نے اپنی کتاب "تحقیق الحقیقت" کے صفحہ ۲۴
کیا اور اُسے ۱۲۶۷ھ میں بمبئی سے شائع کروایا۔ مولانا مخصوص اللہ دہلوی اِس
کی اشاعت کے بعد پانچ چھ سال بحیات رہے لیکن مولانا فضلِ رسول بدایونی نے
جوابات جن لفظوں میں شائع کیا تھا، اُن کے بارے میں مطلقاً کوئی بات ایسی منظرِ عام
آئی کہ موصوف پر الفاظ میں کمی یا بیشی کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ دریں حالات یہ
شاہ مخصوص اللہ علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہونے میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہا۔
سوالات اور اُن کے جوابات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے دیتے ہیں:

عریضہ

"بعد گزارش آداب تسلیمات کے عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے
کے عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے وقت سے لوگوں میں
بڑی نزاع ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ وُہ کتاب، خلاف ہے تمام سلف صالح
اور سوادِ اعظم کے اور مخالف مصنف کے خاندان کے اَور اِس کتاب کی
رُو سے اُن کے استادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر و شرک سے نہیں
بچتا اور اُن کے مخالف لوگ کہتے ہیں کہ وُہ کتاب موافق سلف صالح اور
اُن کے خاندان کے ہے۔ چونکہ اِس بات کو جیسا آپ جانتے ہوں گے،
غالب کہ دُوسرا نہ جانتا ہوگا، اہل البیت ادری بما فی البیت۔ اِس خیال
سے چند باتیں معروض ہیں۔ امید کہ جواب با صواب مرحمت ہو:

پہلا سوال: تقویۃ الایمان آپ کے خاندان کے موافق ہے یا مخالف؟
دُوسرا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ اِس میں انبیاء و اولیاء کے ساتھ بے ادبی

کی ہے۔ اِس کا کیا حال ہے؟

تیسرا سوال۔ شرعاً اِس کے مصنف کا کیا حکم ہے؟

چوتھا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ عرب میں وہابی پیدا ہوا تھا۔ اُس نے یہ نیا مذہب بنایا تھا۔ علمائے عرب نے اُس کی تکفیر کی۔ کیا تقویۃ الایمان اُس کے مطابق ہے؟

پانچواں سوال: وہ کتاب التوحید جب ہندوستان آئی آپ کے حضرت عم بزرگوار اور حضرت والد ماجد نے اُسے دیکھ کر کیا فرمایا تھا؟

چھٹا سوال: مشہور ہے کہ جب اِس مذہب کی نئی شہرت ہوئی تو آپ جامع مسجد میں تشریف لے گئے اور مولوی رشید الدین خاں صاحب وغیرہ تمام اہل علم آپ کے ساتھ تھے اور مجمع خاص وعام میں مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبدالحی کو ساکت اور عاجز کیا۔ اِس کا کیا حال ہے؟

ساتواں سوال۔ اُس وقت آپ کے خاندان کے شاگرد اور مرید، اُن (اسمٰعیل دہلوی) کے طور پر تھے یا آپ کے موافق؟ اُمید ہے کہ جواب اِن سب مراتب کا صاف صاف مرحمت ہو کر سبب ہدایت ناواقفوں کا ہے۔

جواب

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ تقویۃ الایمان کہ میں نے اس کا نام تقویۃ الایمان ساتھ عناد کے رکھا ہے۔ اُس کے رد میں جو رسالہ میں نے لکھا ہے اُس کا نام "معید الایمان" رکھا ہے۔ اسمٰعیل کا رسالہ موافق ہمارے خاندان کے کیا کہ تمام انبیاء اور رسولوں کی توحید کے خلاف ہے کیونکہ پیغمبر سب توحید کے سکھانے کو اور اپنے راہ پر چلانے کو بھیجے گئے تھے۔ اُس کے رسالہ (تقویۃ الایمان) میں اِس توحید کا اور پیغمبروں کی سنت کا پتہ بھی نہیں ہے۔ اُس میں شرک و بدعت کی افراد گن کر جو لوگوں کو سکھاتا ہے کسی رسول اور اُن کے خلیفہ نے کسی کا نام لے کر شرک یا بدعت لکھا ہو،

و کہیں ہو تو اس کے پیرؤوں سے کہو کہ ہم کو بھی دکھاؤ۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ شرک کے معنی ایسے کہتے ہیں کہ اس کی رو سے فرشتے اور رسولِ خدا شرک کا حکم دینے والا ٹھہرتا ہے اور جو شریک کہ شرک سے راضی ہو وہ مبغوضِ خدا ہوتا ہے۔ مجیب کو مبغوض بنانا اور کہوانا ادب ہے یا بے ادبی ہے اور بدعت کے معنی وہ بنا کے پھیلاتے ہیں کہ اصفیاء و اولیا بدعتی ٹھہرتے ہیں۔ یہ ادب ہے یا بے ادبی ہے؟

تیسرے مطلب کا جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں جوابوں سے دیندار اور سمجھنے والے کو ابھی کھل جائے گا کہ جس رسالہ سے اور اس کے بنانے والے سے لوگوں میں برائی اور بگاڑ پھیلے اور خلاف سب انبیاء و اولیاء کے ہو، وہ گمراہ کرنے والا ہوگا یا ہدایت کرنے والا ہوگا؟ میرے نزدیک اس کا رسالہ عمل نامہ برائی اور بگاڑ کا ہے اور بنانے والا (یعنی مصنف) فتنہ گر اور مفسد اور غاوی اور مُغوی ہے۔ سچ اور سچ یہ ہے کہ ہمارے خاندان سے دو شخص ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز اور فرق عیبوں اور حیثیتوں اور اعتقادوں اور اقراروں کا اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بے پروائی سے سب چھن گیا تھا۔ مانند قول مشہور کے "چون فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی" ..... ایسے ہی ہو گئے۔

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی (محمد بن عبدالوہاب نجدی) کا رسالہ (کتاب التوحید) متن تھا، یہ شخص (اسمٰعیل دہلوی) اس کی شرح (بنام تقویۃ الایمان) کرنے والا ہو گیا۔

پانچویں بات کا جواب یہ ہے کہ بڑے عم بزرگوار (یعنی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ) کہ وہ بینائی سے معذور ہو گئے تھے، اس (کتاب التوحید) کو سنا، یہ فرمایا کہ میں اگر بیماریوں سے معذور نہ ہوتا تو "تحفۂ اثنا عشریہ" سا جواب، اس کے رد میں بھی لکھتا۔ اللہ کریم کی بخشش سے.....

اس پہ اعتبار نے شرح (تقویۃ الایمان) کا رد لکھا، متن (کتاب التوحید)
کا مقصد بھی نابود ہو گیا۔ ہمارے والد ماجد نے اُس (کتاب التوحید) کو
دیکھا نہ تھا (کیونکہ ۱۲۲۲ھ میں وصال ہو گیا تھا) بڑے حضرت (شاہ
عبدالعزیز علیہ الرحمہ) کے فرمانے سے کُھل گیا کہ جب اُس کو گمراہ جان لیا تب
اُس کا رد لکھا فرمایا۔

چھٹی تحقیق کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تحقیق اور سچ ہے کہ میں نے مشورت
کی راہ سے کہا تھا کہ تم (اسمٰعیل دہلوی) نے سب سے جدا ہو کر تحقیق دین
میں کی ہے، وہ لکھو۔ کچھ ظاہر نہ کیا۔ ہماری طرف سے جو سوال ہوئے تھے،
(مباحثہ جامع مسجد دہلی میں) اُس کے جواب میں ہاں جی، ہاں جی، کر کے
مسجد سے چلے گئے۔

ساتویں بات کا جواب یہ ہے کہ اس مجلس تک سب ہمارے طور پر تھے پھر
اُن کا جھوٹ سُن کر کچھ کچے آدمی آہستہ آہستہ پھرنے لگے اور ہمارے والد
کے شاگردوں اور مریدوں میں سے بہت بچے رہے، شاید کوئی نادر پھرا ہو
(وہابی بنا ہو) تو مجھے اُس کی خبر نہیں۔" انتہٰی بلفظہٖ۔[1]

مولانا محمد مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حقیقت کے پیش نظر فرمایا کہ میں تقویۃ
کتاب کو تقویۃ الایمان ہی کہتا اور لکھتا ہوں لیکن قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی
نے تاریخ وہابیہ دیوبندیہ، مطبوعہ کلیمی پریس کلکتہ ۱۳۴۴ھ صفحہ ۳ مرتبہ مولانا مفتی محمد
مدراسی رضوی علیہ الرحمہ سے اُن کے استاد گرامی، قاضی محمود منگیری نور اللہ مرقدہٗ کا
بیان، بلکہ حیرت انگیز بیان یوں نقل کیا ہے:

"مولوی اسمٰعیل دہلوی کے ہاتھ کے مسودے دیکھے تو تقویۃ الایمان کی جائے
تفویۃ الایمان، بجائے قاف کے ف لکھا ہوا تھا، خداوند عالم نے اُس کے

---

[1] فضل احمد قاضی، مولانا: انوارِ آفتابِ صداقت، ج ۱، ص ۵۲۰ تا ۵۲۰

قت سے لکھا یا تھا۔ سچ ہے یہ کتاب ایمان کو فوت کرنے والی ہے۔" لہ

ولانا مخصوص اللہ کی طرح شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ/
کے دوسرے صاحبزادے یعنی شاہ محمد موسیٰ دہلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے چچا زاد
لوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے رد میں پوری طرح اپنا فریضہ ادا کیا۔ جامع مسجد دہلی کے
حثے میں دورانِ گفتگو بھی پوری طرح حصہ لیا اور اپنے اکابر شاہ ولی اللہ محدث
لمتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر
لیہم کے مسلک کی روشنی میں مولوی عبدالحی دہلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے
کی تردید کی اور انھیں اپنے بزرگوں کے مسلک سے بغاوت کرنے والے ثابت
ھا دیا تھا۔ شاہ محمد موسیٰ نے اپنے اس عظیم کارنامے کو کتابی شکل میں "حجۃ العمل
ں الحیل" کے نام سے جمع کر دیا تھا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس کتاب
ے میں یوں ذرا شرماتے ہوئے، مصنفِ تقویۃ الایمان کو چھپاتے ہوئے وضاحت

:

مولوی محمد موسیٰ کی تصنیف سے ایک قلمی فارسی کتاب "حجۃ العمل فی
طل الجہل" ہماری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ہفتدہم ربیع الاول
۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء میں اتمام کو پہنچی۔ یہ کتاب ساٹھ اوراق (۱۲۰ صفحات)
مل ہے۔ کتاب کا مضمون ردِ وہابیت ہے۔" لہ

ی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)
دوں، بھتیجوں اور خوشہ چین علمائے کرام نے مصنفِ تقویۃ الایمان کے رد میں
ی سرگرمی دکھائی۔ مولانا رشید الدین خاں اور مفتی صدر الدین آزردہ ہر طرح پیش پیش
ن کا کچھ ذکر ہو چکا اور باقی تصانیف کے ضمن میں کیا جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد

ر کاظمی، مولانا: انوارِ آفتابِ صداقت، ج ۱، ص ۵۲۱

قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۹۱، ۵۹۲

(المتوفی ۱۲۷۷ھ/۱۸۵۹ء) کے والدِ ماجد کے نانا جان یعنی مولانا منور الدین دہلوی رح
علیہ بھی شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے شاگرد اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے ہم سبق تھے۔
نے تقویۃ الایمان کے رد میں ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، جس کے بارے میں جناب ابو
آزاد کی تصریح ملاحظہ ہو۔

" اِس میں تقویۃ الایمان کے تیس مسئلے ما بہ النزاع منتخب کیے ہیں اور پھر
تیس بابوں میں اُن کا رد کیا ہے۔ ایک رسالہ اِس باب میں ہے کہ مولانا
اسمٰعیل شہید کے عقائد کا رد خود اُن ہی کے خاندان اور اساتذہ کی کتب سے
کیا جائے۔ چنانچہ اِس میں ہر مسئلے کے رد میں شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ،
شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اقوال سے اپنے نزدیک رد کیا ہے۔[۱]
کیا کسی انصاف پسند کے لیے اِس کے بعد بھی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ
کی تعلیمات کے ڈانڈے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ/
سے ملائے اور تقویۃ الایمانی دھرم والوں کو ولی اللّٰہی مکتبِ فکر کے علمبردار ٹھہرانے کی جرأت
کرے۔ مولانا منور الدین دہلوی نے مصنفِ تقویۃ الایمان کو پہلے خوب سمجھایا بجھایا کہ
تفرقہ بازی اور فتنہ پردازی ایک ظلمِ عظیم ہے اِس سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن خارجیت
دل و دماغ میں کچھ اِس طرح سما گئی تھی کہ اُن کی فہمائش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ
مجبوراً مولانا منور الدین کو اُن کی تردید میں کمرِ ہمت باندھنی پڑی۔ مولانا منور الدین
ردِ وہابیت میں جس طرح سرگرمی دکھائی اُس کا تذکرہ جناب ابوالکلام آزاد نے یوں کیا

" مولانا اسمٰعیل شہید مولانا منور الدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز
(رحمۃ اللہ علیہ) کے انتقال کے بعد جب اُنھوں (مولوی اسمٰعیل) نے تقویۃ
الایمان اور جلاء العینین لکھی اور اُن کے اِس مسلک کا چرچا ہوا تو علماء میں
ہلچل پڑ گئی۔ اِن کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منور الدین

[۱] ابوالکلام آزاد، مولانا: آزاد کی کہانی، ص ۵۰

نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۲۴۰ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں
کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کرایا پھر حرمین سے فتویٰ منگوایا ان
کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدا میں مولانا اسمٰعیل اور
اُن کے رفیق یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد مولانا عبدالحی کو بہت کچھ
فہمائش کی اور ہر طرح سمجھایا، لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث ورد میں سرگرم
ہوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرۂ آفاق مناظرہ ترتیب دیا، جس میں ایک
طرف مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی تھے اور دوسری طرف مولانا منورالدین
اور تمام علمائے دہلی۔" [1]

یہ بیان کسی ایسے عالم کا نہیں جس کو بریلوی بتا کر اُس کی بات ناقابلِ توجہ ٹھہرادی جائے
بلکہ دین کے امام الہند کا بیان ہے۔ کیا اِس سے صاف اور صریح طور پر واضح نہیں
ہے کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے اپنے آبائی مسلک سے، مذہبِ اہلسنت وجماعت
سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ سرزمین پاک وہند میں فرقہ بازی کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہاں
نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کی جگہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے خارجی مذہب کو رائج
کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ پس پشت کوئی ایسی طاقت کام کر رہی تھی جو کسی کی فہمائش کا
اثر نہیں ہونے دیتی تھی۔ گھر بار خلاف، سارا خاندان خلاف، متحدہ ہندوستان کے
علمائے کرام مخالفت پر کمربستہ، لیکن کسی کی پروا نہیں کی۔ نہ خاندان کو خاطر میں لائے،
نہ بزرگوں کا کوئی پاس لحاظ کیا اور نہ علمائے کرام کے محاسبے اور اُن سے بار بار
نہ لاجواب رہنے پر کوئی ندامت محسوس ہوتی تھی۔ بس تفریق بین المسلمین کی دھن تھی
بڑی تندہی سے اُس میں لگے رہے اور کسی بھی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے۔ آخر کیوں؟
کیا یہ حقانیت پر تھے اور پاک وہند کے سارے علمائے کرام سب مشرک وکافر تھے؟
ولی اللّٰہی خاندان کے اکابر شرک وکفر کی تعلیم ہی دیتے رہے تھے اور یہ اُن کی اصلاح

---

[1] ابوالکلام آزاد، مولانا: آزاد کی کہانی، ص ۵۹

کرنے کو اُٹھ کھڑے ہوتے تھے! آخر یہ اصلاح ہو رہی تھی یا تخریب۔ مسلمانوں کو ملایا جا رہا تھا
یا توڑنے اور منتشر کرنے کی سعیِ نامحمود تھی؟ اگر جوڑنے کا پروگرام تھا، تو یہ بات ناقابلِ یقین ہے
کیونکہ اُس وقت مسلمان ٹوٹے ہوئے اور فرقوں میں بٹے ہوئے کب تھے کہ اُنھیں جوڑنے
کی ضرورت پڑتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض سماجی خرابیاں اُن کے مذہب و معمولات میں در آئی
ہو چکی تھیں، اُن کی اصلاح مدِ نظر تھی۔ اِس سلسلے میں یہی عرض کروں گا کہ کاش! موصوف کے
ارادے یہی کچھ ہوتے تو یہ تحریک قابلِ احترام اور لائقِ ستائش قرار پاتی لیکن افسوس! نہ
کچھ ایسا ہی لگا یا گیا مگر ساتھ ہی اسلامی عقائد و نظریات پر بھی جراحی کی اِس طرح مشق کی گئی
کہ سچے اور پکے مسلمانوں کو بھی خوارج کی طرح بیک جنبشِ قلم مشرک و کافر ٹھہرا دیا بعض اسلامی
عقائد کو غیر اسلامی اور کتنے ہی غیر اسلامی اور صریح کافرانہ نظریات کو اسلامی عقائد منوانے کی
مہم پورے زور شور سے شروع کر دی گئی۔ آخر سماجی خرابیاں دُور کرنے تک کا ارادہ تھا تو
مسلمانوں کو خارجی بنانے کی مہم چلانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ کیا مسلمانوں کے لیے محمد
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دین، اُن کی نجات کے لیے کافی نہیں تھا؟ کیا نجات کا ذریعہ محمد
عبدالوہاب نجدی کا دین ہے؟

مولوی ابوالکلام آزاد کے والد ماجد، مولانا خیرالدین جالندھری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی
۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) اپنے نانا، مولوی منورالدین دہلوی اور مفتی صدرالدین آزردہ (المتوفی
۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کے نامور شاگرد تھے۔ ردِّ وہابیت میں آپ نے بھی انتہائی سرگرمی دکھائی
کہ کسی طرح یہ فتنہ جڑ پکڑنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے اور مسلمان اپنا دین و ایمان برباد کرنے
سے محفوظ ہو سکیں۔ موصوف کے ایسے کارناموں کو اُن کے فرزند مولوی ابوالکلام نے بھی
بادلِ ناخواستہ بیان کیا ہے:

"اُسی زمانے میں علمائے مکہ نے والد مرحوم سے کہا کہ وہابی عقائد (وہابیانِ ہند)
کی کتابیں اُردو میں ہیں جنھیں وہ سمجھ نہیں سکتے نیز نجدی عقائد کا بھی رد کافی طور پر
نہیں ہوا ہے۔ شیخ احمد دحلان نے اِس بارے میں خاص طور پر زور دیا اور
اِس طرح والد مرحوم نے ایک کتاب نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی، جو

ان کی تصانیف میں سب سے بڑی ہے۔ اس کا نام "رجم الشیاطین" ہے۔ یہ دس جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم ہے۔ اس کی ترتیب اس طور پر ہوئی ہے کہ ایک "سو چودہ" مسئلے ما بہ النزاع منتخب کیے ہیں۔ اتنی تعداد جزئی جزئی اختلافات کے استقصار کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ ہر مسئلے کے لیے ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں پہلے قرآن سے، پھر احادیث سے، پھر اقوالِ علماء سے رد کا التزام کیا ہے۔ اس طرح کتاب ایک سو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک جلد صرف مقدمہ میں ہے اور چونکہ وہ اُن مسائل کے متعلق نہیں ہے، اس لیے معلومات کے اعتبار سے بکار آمد ہے۔ اس میں اصولی طور پر عقائدِ اہلسنت پر بحث کی ہے اور ہر طرح کے اختلافات کو ختم کر کے اپنے مسلک کو بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔" [۱]

اب ہم ذیل میں چند اُن علمائے کرام کا ذکر کریں گے جنہوں نے تقویۃ الایمان کے فتنے و دفع کرنے کی غرض سے اس کے کلی یا جزئی رد لکھے۔ اگرچہ ایسی تصانیف کا شمار حد و حساب سے باہر ہے لیکن ہم تیرھویں صدی میں لکھی جانے والی بعض اُن تصانیف کے نام پیش کرتے ہیں جو گزشتہ روزِ اول کے بطور لکھی گئی تھیں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، شاہ مخصوص اللہ دہلوی، شاہ محمد موسیٰ دہلوی، مولانا منور الدین دہلوی اور مولانا خیر الدین جا لندھری رحمۃ اللہ علیہم کا ذکر پیچھے گزر چکا۔ اب بفضلہ تعالیٰ بعض دیگر علمائے اہلسنت اور اُن کی کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہیں، و باللہ التوفیق۔

۶۔ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے نامور شاگرد مولانا رشید الدین خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کو خوب فہمائش کی۔ مباحثہ جامع مسجد دہلی میں علمائے دہلی کی سربراہی کی اور مولوی عبد الحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) سے سوالات

---

[۱] ابو الکلام آزاد، مولوی: آزاد کی کہانی، ص ۹۰

کرتے رہے۔ آپ نے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تحصیلِ علم کی تھی۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے رشتہ دار تھے۔ تعلیم و تعلم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اسی وجہ سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے منظورِ نظر تھے۔ روافض کا رد کرتے رہے اور آخر میں ردِ وہابیت میں سرگرمی دکھاتے رہے۔

۷۔ مفتی صدرالدین آزردہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۷ء) اور مولانا فضل امام خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہم (المتوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) وغیرہ سے تحصیلِ علم کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا اور فتویٰ جہاد کی تصدیق کی جس کی پاداش میں منصبِ صدر الصدوری سے معزول ہوئے اور جائداد منقولہ و غیر منقولہ چھین لی گئی۔ وہابیہ کے رد میں "منتہی المقال فی شرح حدیث لاتشد الرحال" کتاب لکھی۔ آپ کا کتب خانہ جو ۱۸۵۷ء میں حکومت نے ضبط کیا تقریباً تین لاکھ کی مالیت کا تھا۔

۸۔ مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے تحصیلِ علم بحرالعلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء) کے شاگردِ رشید، مولانا نورالحق فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء) سے کی۔ مولانا فیض احمد بدایونی، مولانا سخاوت علی جونپوری، مفتی اسد اللہ الٰہ آبادی، مولانا شاہ احمد سعید رامپوری اور مولانا عنایت رسول چریاکوٹی جیسے مشاہیر علماء کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے وہابیہ کے رد میں مثالی کارنامہ انجام دیا۔ "بوارق محمدیہ" ان کے رد میں شرح و بسط سے لکھی جس کا ترجمہ مولانا غلام قادر بھیروی نے اردو میں "شوارق صمدیہ" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۲۶۵ھ میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ "احقاقِ حق" اور "تصحیح المسائل" کے ذریعے ان کے باطل مذہب کا رد کیا۔ "سیف الجبار" بھی ۱۲۶۵ھ کی تصنیف ہے اور اس میں نجدی اور ہندی وہابیوں

عقائد و نظریات، اُن کی تاریخ اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کے مضامین میں باہمی
مطابقت دکھا کر مبرہن کیا ہے کہ حقیقت میں یہ دونوں مذاہب ایک ہیں۔ مولانا نے
عقائدِ اہلسنت و جماعت کو ایک عربی تصنیف "المعتقد المنتقد" میں منضبط فر
اور اس کتاب کے ذریعے بھی ضمنی طور پہ وہابی عقائد و نظریات کی تردید ہوتی ہے۔
تصنیفِ لطیف علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۰۰ھ/۱۸۹۱ء) کی
مصدقہ ہے۔ یہی وہ مبارک تصنیف ہے جس پر امام اہلسنت اعلیٰحضرت احمد رضا خاں
بریلوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) نے "المعتمد المستند" کے نام
حاشیہ لکھا اور اس میں گمراہ گروں کے پانچ سرغنوں کی تکفیر کا شرعی فریضہ ادا کیا۔

۹۔ مولانا کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء) یہ سید احمد بریلوی
(المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے مرید اور خلیفہ تھے لیکن مکائد ظاہر ہونے پر دوبارہ
زمرۂ اہلسنت میں واپس آگئے۔ وہابیہ کی "تقویۃ الایمان" کے رد میں "قوۃ الایمان"
لکھی، اس کے علاوہ اُن مبتدعین کی تردید میں اور متعدد رسائل لکھے۔

۱۰۔ مولانا سید جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء) سے
اللہ والے صاحب، یہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے
و طہارت اور علوم حدیثیہ میں درجۂ کمال پر فائز تھے۔ انھوں نے تقویۃ الایمانی عقائد
نظریات کے رد میں رسالہ "صاعقہ رابیہ در ردِ عقائد وہابیہ" لکھا۔

۱۱۔ مولانا تراب علی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء) نے "سبیل
النجاح الی تحصیل الفلاح" کے نام سے تقویۃ الایمان کا رد لکھا ہے۔

۱۲۔ مولانا برہان الدین رحمۃ اللہ علیہ ساکن دہلی، مشہور فقیہہ اور محدث ہو گزرے
۲۹ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں جو حنفی وہابی اختلافات پر سب سے
اولین تاریخی مناظرہ ہوا تھا۔ موصوف نے "محاکمہ" کے نام سے اس مباحثے کی
روداد درج کر کے وہابیہ کے دلائل کا رد کیا ہے۔

۱۳۔ مولانا محمد سعید اسلمی مدراسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء) نے تقویۃ

کے رد میں "سفینۃ النجاۃ" نامی کتاب لکھی اور تحفہ اثنا عشریہ مصنفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

۱۴۔ مولانا خلیل الرحمٰن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں کتاب "رسم الخیرات" لکھی جو ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔

۱۵۔ مولانا محمد عبداللہ خراسانی بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کا "السیوف البارقہ علیٰ رؤس الفاسقہ" کتاب لکھ کر رد کیا۔ یہ کتاب مطبع قیصریہ سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ کے سرتاج العلماء مفتی شافعیہ سید احمد دحلان مکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) سے موصوف نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی سندیں حاصل کی تھیں۔ مذکورہ کتاب "السیوف البارقہ" بھی حضرت مفتی شافعیہ کی مصدقہ ہے۔ مصنفِ تقویۃ الایمان کے بارے میں موصوف یوں اس میں رقمطراز ہیں:

فإن قيل ان المحمد الهندي اسمٰعيل الدهلوي كان من تلامذة مولانا الشاه عبدالعزيز رحمة الله عليه فكيف يرتد عن دينه وقلت لخبث الباطن وحب الرياسة كالمرتدين الاولين كانوا يحضرون مع النبي صلى الله عليه وسلم في الحج والجهاد والصوم والصلوٰة۔

اگر کوئی یہ کہے کہ محمد ہندی اسمٰعیل دہلوی جب کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے تو وہ اپنے دین اسلام سے کس طرح پھر سکتے تھے؛ میں کہتا ہوں کہ سابقہ مرتدوں کی طرح باطنی خباثت اور ہوسِ ریاست کے باعث ایسا ہوا، حالانکہ وہ لوگ بھی تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ حج، جہاد، روزہ اور نماز میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۱۶۔ مولانا کریم اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء) شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) اور مولانا رشید الدین خاں علیہ الرحمہ
(المتوفی ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء) وغیرہ سے تحصیل علوم کی۔ سید آل احمد عرف اچھے میاں
مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۱۹ء) سے شرف ارادت اور اجازت و
خلافت حاصل تھی۔ وہابیہ کے رد میں آپ نے "ہادی المضلین" کتاب لکھی۔

۱۷۔ مولانا سید عبدالفتاح المعروف بہ مفتی اشرف علی گلشن آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیل علم
مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) اور کئی دیگر علماء
سے کی۔ مصنف تقویۃ الایمان کے رد میں اور اُن کے مکائد کا رد کرتے ہوئے
ایک کتاب "تحفہ محمدیہ فی رد وہابیہ" شرح و بسط سے لکھی۔ دوسری "تائید الحق" ۔
۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔

۱۸۔ مولانا محمد احسن واعظ پشاوری المعروف بہ حافظ دراز رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ/
۱۸۴۷ء) ایک مشہور بزرگ اور متبحر عالم ہو گزرے ہیں۔ ساری عمر درس و تدریس اور
تصنیف و تالیف میں گزاری۔ بخاری شریف کی "منح الباری" کے نام سے فارسی
میں شرح لکھی اور شرح قاضی مبارک پر فاضلانہ حواشی لکھے۔ انھوں نے مصنف
"تقویۃ الایمان" کو بارہا فہمائش کی اور علمی گفتگو کے ذریعے انھیں تقلید اور رفع یدین
وغیرہ مسائل میں لاجواب کرتے رہے۔ جب ان کے فاضلانہ و محققانہ دلائل کے سامنے
موصوف کی کسی طرح پیش نہ گئی تو موصوف نے خارجیت کا پیالہ وہیں رکھا لیکن
رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ان وہابیانِ ہند سے پنجاب میں جو علمائے اہلسنت نے
شہرۂ آفاق مناظرہ کیا تھا اس میں آپ بھی موجود تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی تو
مناظرے میں ہر موضوع پر ساکت و صامت ہوئے اور خارجیت و نجدیت سے تائب
ہونے کا اعلان کر دیا تھا، لیکن فوراً بعد ہی بعض وہابی علماء نے کہنا شروع کر دیا
مصنف تقویۃ الایمان نے وہابیت و خارجیت سے توبہ کرنے کا کوئی اعلان نہیں
کیا تھا، یہ اُن پر بہتان ہے۔ قربان جائیں اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں بریلوی
کے حسن قلم پر کہ آپ نے اسی شہرتِ توبہ کی بنا پر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی

۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی تکفیر سے اجتناب کیا حالانکہ اُن کی تصانیف میں کتنی ہی عبارتیں صریح کفریہ ہیں جن کی آج تک کوئی اسلامی تاویل نہیں کی جا سکی۔ حالانکہ اس واقعے سے چھ سال پہلے علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) نے ۱۲۴۰ھ میں "تحقیق الفتوی" کے اندر مصنف تقویۃ الایمان کی جامع مسجد دہلی میں تکفیر کی اور ولی اللّٰہی خاندان کے علماء، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے علمی فرزندوں، دیگر علمائے دہلی اور علمائے شاہجہان پور نے اس فتوے کی تصدیق و تائید مُہری و دستخطی فرمائی تھی۔

مولانا محمد احسن پشاوری نے دیکھا کہ یہ لوگ بعینہٖ خوارج کی طرح توحید اور شرک کو باہم گڈمڈ کر رہے ہیں لہٰذا ان کی تردید میں کتاب "تحقیق توحید و شرک" تصنیف فرمائی تھی۔

۱۹۔ مولانا محمد صبغۃ اللہ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "گلزار ہدایت" نامی کتاب لکھی جو مطبع کشتی راج مدراس سے ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۲۰۔ مولانا محمد خلیل الرحمٰن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "رجم الخراب" کتاب لکھی اور اُسے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۲ء میں بمبئی سے شائع کروایا تھا۔

۲۱۔ مولانا محمد حیدر علی لکھنوی ثم حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) نے تحصیلِ علم شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہم سے کی۔ فنِ مناظرہ اور علمِ کلام میں درجۂ کمال رکھتے تھے روافض سے مناظرہ کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں قاضی القضاۃ رہے۔ "ردّ تقویۃ الایمان" کتاب بڑی کاوش و جستجو سے لکھی، جس کے آخر میں "صراط المستقیم" کتاب کے بارے میں علمائے دہلی و لکھنؤ کے فتوے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۳ء میں لکھی گئی۔

۲۲۔ مولانا سید حسین الدین رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) سجادہ نشین احمد آباد زارہ نے وہابیہ کے رد میں "ہدایت المومنین الی سلسلۃ الصالحین" کے نام سے کتاب لکھی اور اُسے مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں شائع

کر دیا گیا۔

۲۳۔ مولانا محی الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء) نے علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل اپنے والد ماجد مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) سے کی اور اپنے جد امجد مولانا عبد المجید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء) سے شرفِ ارادت حاصل کیا۔ مولانا فضلِ رسول بدایونی کی کتاب "احقاقِ حق" کا کسی وہابی نے "سراج الایمان" کے نام سے جواب لکھا تھا آپ نے اس "سراج الایمان" نامی کتاب کا منہ توڑ جواب "شمس الایمان" کے نام سے لکھا اور ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں اُردو اخبار پریس دہلی سے شائع کروایا۔

۲۴۔ مولانا نقی علی خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) جو امام اہلسنت مجدد مائۃ حاضرہ، مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے والد ماجد ہیں، آپ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "تزکیۃ الایقان فی رد تقویۃ الایمان" کتاب لکھی۔ آپ کے زمانہ میں حنفیت کا دعویٰ کرنے والے وہابیہ کا ظہور ہو چکا تھا، ان کے رد میں متعدد کتابیں لکھ کر مذہب اہلسنت کا دفاع کیا ہے۔ تین چیزیں آپ کی تصانیف میں بہت نمایاں ہیں: (۱) درسِ عشقِ رسول (۲) مذہب اہلسنت وجماعت کا دفاع (۳) بد مذہبوں کا رد، خصوصاً دیوبندیوں اور نیچریہ کی تخریب کاری کا سدِ باب۔

۲۵۔ مولانا قاضی ارتضا علی خان گوپاموی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء) اور بقول بعض ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) نے جو مدراس کے قاضی القضاۃ تھے اور صدرا اور ملا جلال وغیرہ کے حواشی اور شروح لکھ چکے تھے، انہوں نے "خطبۃ الحاقیہ" نامی وہابیہ کے رد میں کتاب لکھی۔

۲۶۔ مولانا سید بدرالدین حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے رد میں رسالہ "احقاق [illegible]" تصنیف کیا۔

۲۷۔ مولانا محمد عمر رامپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) نے وہابی عا[illegible]

محمد رحیم بخش پنجابی کا رد کیا تھا۔ موصوف تقویۃ الایمان کے حامی تھے اور آپ نے اُن کے جملہ مزعومہ دلائل کے تار پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اِس کے علاوہ مولوی محمد حسین بٹالوی وکیل غیر مقلدان کے بارہ سوالات کا مسکت جواب دیتے ہوئے ایک رسالہ مرتب کیا جس کا نام "عشرہ مبشرہ" ہے۔ یہ کتاب اُن کے تبحرِ علمی کی دلیل اور نہایت بلند پایہ ہے۔ ١٢٩٠ھ/١٨٨٠ء میں ریاض ہند پریس امرتسر میں طبع ہوئی۔ اوّل الذکر کتاب کا نام "فتح الاسلام فی رد اضغاث الاحلام" ہے اور وہ ١٣٠٢ھ/١٨٨٥ء میں نامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔

٢٨۔ مولانا فضلِ رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ١٢٨٩ھ/١٨٧٢ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کے رد میں ایک پُرلطف کتاب "فیوض ارواح القدس" کے نام سے بھی لکھی تھی اور اُس میں یہ التزام کیا تھا کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ١٢٤٦ھ/١٨٣١ء) کے عقائد و نظریات کو اُن کے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ عبدالرحیم دہلوی (المتوفی ١١٣١ھ/١٧١٩ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ١١٧٦ھ/١٧٦٢ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ١٢٣٩ھ/١٨٢٤ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ١٢٤٢ھ/١٨٢٦ء) اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ١٢٣٣ھ/١٨١٧ء) رحمۃ اللہ علیہم کے عقائد و نظریات کے خلاف ثابت کر کے دکھایا ہے۔

٢٩۔ مولانا ہدایت اللہ لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے رد میں "سبیل النجاح فی تحصیل الفلاح" کتاب لکھی۔

٣٠۔ مولانا قاضی محمد حسین کرنالی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے رد میں "ھدایت المسلمین الیٰ طریق الحق والیقین" کے نام سے کتاب لکھی جو ١٢٩٩ھ/١٨٨٢ء میں بمبئی سے طبع ہوئی تھی۔

٣١۔ مولانا شاہ عبدالمجید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ١٢٦٣ھ/١٨٤٦ء) جن کو حضرت مولانا شاہ آلِ احمد مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ١٢٣٥ھ/١٨١٩ء) سے خلافت حاصل تھا۔ آپ کی بیعت کے واقعہ کو مولانا رحمٰن علی مرحوم نے تذکرہ علمائے ہند میں یوں بیان کیا ہے

"علم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد مرشد کامل کا خیال پیدا ہوا اور ہر طرف شیخ کامل کی تلاش شروع کی۔ چونکہ بہت سے مشائخ وقت (کامل طور سے) شریعت کا اتباع نہیں کرتے تھے اس لیے اس گروہ سے نفرت شروع ہو گئی۔ قسمت یاور تھی۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت ہادی المضلین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جناب محبوب سبحانی، غوث صمدانی، شیخ عبد القادر جیلانی۔ مخدوم الانام، کان نمک گنج شکر شیخ فرید الدین نیز دوسرے اولیاء (رحمۃ اللہ علیہم موجود ہیں۔ حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ سے جناب غوث الاعظم نے صاحب ترجمہ (مولوی عبد المجید بدایونی) کا ہاتھ، شاہ آل احمد مارہروی کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب وہ بیدار ہوئے تو مارہرہ کا راستہ لیا اور اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زہد و تقویٰ اور اتباع شریعت کو کامل طور سے پایا، اُن کے مرید ہوئے، خلافت سے سرفراز ہوئے، اپنے مرشد سے "عین الحق" کا لقب پایا"[۱]

۔ آپ مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) جیسے نابغۂ عصر کے والد ماجد اور حضرت آل رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) جیسے گوہر یکتا کے استاد تھے۔ آپ نے مبتدعین زمانہ کے رد میں "رسالہ رد وہابیہ" تصنیف فرمایا تھا۔

۱۔ مولانا فخر الدین احمد الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی بانی وہابیت کی تردید میں "رسالہ ازالۃ الشکوک والاوہام بجواب تقویۃ الایمان" شرح و بسط سے لکھا۔

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند (اردو)، ص ۳۲۳

۳۳۔ مولانا سید حیدر شاہ حنفی قادری رحمۃ اللہ علیہ ساکن کچھ بھوج المعروف پیر حیدر نے مبتدعین جدید کے رد میں "ذوالفقار الحیدریہ علی اعناق الوھابیہ" کتاب لکھی۔

۳۴۔ علمائے دہلی و علمائے حرمین کے فتاوی کا مجموعہ بنام "تنبیہہ الضالین وھدایۃ الصالحین" جس میں مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی محمد اسحٰق دہلوی کے نجدی عقائد و خلاف اہلسنت مسائل کی تردید ہے۔

۳۵۔ مولانا سید جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء)۔ یہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے شاگرد تھے انھوں نے وہابیان ہند کے عقائد کی تردید میں رسالہ "صاعقہ ربانیہ در رد عقائد وھابیہ" لکھا، جو قلمی صورت میں موجود ہے۔

۳۶۔ مولانا حافظ محمد عبداللہ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۸ء)۔ آپ حضرت فضل حق خیرآبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) اور مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) کے شاگرد تھے۔ مفتی شافعیہ و مدرس مدرسہ بیت الحرام سید احمد دحلان رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) سے تفسیر، حدیث اور فن کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے رد میں "رسائل رد وہابیہ" کتاب لکھی۔

۳۷۔ علمائے بریلی نے تقویۃ الایمان کے رد میں "تصحیح الایمان در رد تقویۃ الایمان" کے نام سے ایک متفقہ کتاب شائع کروائی۔

۳۸۔ مدراس کے چھتیس[۲۵] علمائے اہلسنت نے تقویۃ الایمان کے عقائد و نظریات کو غیر اسلامی اور کفریہ بتایا اور ۱۲۵۱ھ/۱۸۳۵ء میں فتوی شائع کیا۔ ان علمائے کرام نے اپنے فتووں میں ادلہ ثلاثہ سے ثابت کیا ہے کہ تقویۃ الایمان کے عقائد و نظریات اسلامی عقائد کے خلاف اور اشاعت کفر و خارجیت ہیں۔ جو اس کتاب کو اسلامی سمجھیں اور اس کے پیش کردہ عقائد کو درست جانیں وہ اسلام سے انحراف کرنے والے ہیں۔

مولانا معین الحق رحمۃ اللہ علیہ پہلے وہابیوں کے فریب میں مبتلا ہوگئے تھے۔ مطلع ہونے پر تقویۃ الایمان اور صراط المستقیم کے رد میں رسالہ "جواہر منثورہ" لکھا جو مطبع جعفری سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء میں طبع ہوا۔

علمائے حیدرآباد دکن نے تقویۃ الایمان کے غیر اسلامی نظریات کا رد کرتے ہوئے اپنے فتووں کا ایک مجموعہ "رد تقویۃ الایمان" کے نام سے شائع کروایا۔

مولانا سید ابو السعود مفتی مدینہ منورہ رحمۃ اللہ علیہ کی مہری دستخطی تصدیق کے ساتھ وہابیانِ ہند کے رد میں اور اُن کے متعلق شرعی حکم بیان کرتے ہوئے علمائے حرمین شریفین کے فتاوی کا مجموعہ "فتوی حرمین شریفین" کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اس میں تقویۃ الایمان اور اس کے مصنف کا رد ہے۔

مولانا فیض اللہ رحمۃ اللہ علیہ پنجابی نے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں مصنفِ تقویۃ الایمان کے رد میں "طریقۃ المسلمین، مذہب سنیہ رد وہابیہ" بمبئی سے شائع کر دیا۔

ملا جمال الدین فرنگی محلی ثم مدراسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) نے فرقہ وہابی اور اُن کے تقویۃ الایمانی نظریات کے رد میں ایک کتاب "جمال الدین والدین" کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع کروائی۔ آپ نے درسی کتب پر حواشی لکھے اور نواب غلام غوث خاں، رئیس کرناٹک کے استاد تھے۔ تبحرِ علمی اور سخاوت میں مشہور تھے۔

مولانا احمد علی خلیفہ شیخ عبدالغفور عرف حضرت اخوند رحمۃ اللہ علیہما نے وہابیوں کے رد میں ایک عربی کتاب ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں مطبع حیدری بمبئی سے بنام "...ن المومنین علی عقائد المضلین" شائع کروائی۔

محمد عبدالسبحان پشاوری مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں علمائے حرمین شریفین سے فتوے حاصل کیے۔ آپ نے اُن کا مجموعہ مع اردو ترجمہ ہاشمی مدراس سے ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں شائع کروایا۔

محمد عبدالسبحان احمدآبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) نے

وہابیوں کے رد میں "دلائل قاطعہ در تحقیق فرقہ ناجیہ"، "خیر المقال فی ازالۃ جدال در التسدید فی وجوب التقلید" وغیرہ کتب و رسائل لکھے۔

۴۷۔ علمائے قاہرہ و مصر نے ہندوستانی زندیقوں کے بارے میں حکم شرع بیان کرتے ہوئے فتوے جاری کیے، اُن کا مجموعہ بنام "رسالہ زندیقیہ" بمبئی سے شائع ہوا۔

۴۸۔ مولانا محمد عمر رامپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) نے وہابیہ کے رد میں "رجوماً للشیاطین و دافع وساوس الخناس" لکھا، جو ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۴۹۔ مولانا عبدالرحمن سلہٹی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیوں کے رد میں "سیف الابرار مسلول علی الکفار" کے نام سے ایک کتاب ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع کروائی۔

۵۰۔ مولانا جلال الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مبتدعین ہند کے رد میں "شواہد الحق" کتاب لکھی اور ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء میں چھپی۔

۵۱۔ مولانا مخلص الرحمن چاٹگامی علیہ الرحمۃ نے تقویۃ الایمان کے رد میں "شرح الصدور فی دفع الشرور" کتاب لکھی۔

۵۲۔ مولانا سید لطف الحق بن مولانا سید خلیل الحق قادری بہاری رحمۃ اللہ علیہما نے مسلمانوں کو خارجیت کے شر سے بچانے کی غرض سے "صلاح المومنین فی قطع الخارجین" کتاب لکھی جو قلمی نسخہ کی صورت میں موجود ہے۔

۵۳۔ مولانا محمد عبداللہ سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ شفاعت و استمداد و تصرف میں تقویۃ الایمانی نظریے کا بلیغ رد کرتے ہوئے کتاب "تحفۃ المسلمین فی حیات سید المرسلین" لکھی۔ یہ بھی قلمی موجود ہے۔

۵۴۔ مولانا معلم ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء) خطیب جامع مسجد بمبئی نے نجدی عقائد کی روک تھام کے پیش نظر کتاب "نعم الانتباہ لدفع الاشتباہ" لکھی۔

مولانا خیرالدین مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کی تردید میں "خیرالزاد لیوم المیعاد" نامی کتاب لکھی

مولانا خادم احمد فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء) ۔ آپ شرح وقایہ کے شارح بھی ہیں ۔ انھوں نے منکرین تقلید کے رد میں "ھدایت الانام فی اثبات تقلید الائمۃ الکرام" کتاب لکھی۔

مولانا سلامت اللہ بدایونی کان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء) ۔ آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہما کے نامور شاگرد تھے۔ موصوف کو ان بزرگوں سے تفسیر و حدیث اور خاندان ولی اللّٰہی کی اکثر تصانیف کی سند و اجازت حاصل تھی۔ انھوں نے وہابیان ہند کے رد میں رسالہ "اشباع الکلام فی اثبات المولد والقیام" اور رسالہ "در تحقیق جواز مصافحہ و معانقہ عیدین" لکھا۔ آپ ایک متبحر عالم دین اور سیکڑوں علماء و فضلاء دہر کے استاد ہو گزرے ہیں۔

مولانا عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ/ ۱۹۰۱ء) ۔ آپ اہلسنت کے مایۂ ناز عالم دین و بزرگ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) کے فرزند ارجمند اور امام معقولات و جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہد اعظم و ناشر فتویٰ جہاد، اسیر انڈمان، حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مایۂ ناز اور سرمایۂ روزگار شاگرد ہو گزرے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی سرپرستی میں جب ندوۃ العلماء کی تحریک کا چکر چلایا گیا تو آپ نے سرگرمی سے اس کی مخالفت کی۔ وہابیہ کے رد میں "احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام (عربی)، سیف الاسلام المسلول علی المناع بعمل المولد والقیام (فارسی)، حقیقۃ الشفاعۃ اور شفاعت مسائل وغیرہ کتب و رسائل آپ کے تبحر علمی اور حق پسندی کے روشن دلائل ہیں۔

نواب قطب الدین خاں دہلوی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء) ۔ آپ نے مشکوۃ

المصابیح کی اردو میں "مظاہرِ حق" کے نام سے شرح لکھی۔ آپ نے غیر مقلدین کے ردّ میں "نورالحق، توفیرالحق اور تحفۃ العرب والعجم" وغیرہ رسائل لکھے۔ انتقال مکہ معظمہ میں ہوا تھا۔ آپ غیر مقلدین کے خلاف اور مقلد وہابی تھے۔

۶۰۔ مولانا محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء) عالمِ جوانی میں مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وہابیہ کے ردّ میں رسالہ "حیات النبی" عربی زبان میں لکھا تھا۔

۶۱۔ مولانا مفتی ولی اللہ فرخ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۲ء) فاضلِ اجل اور مفسرِ قرآن تھے۔ وہابیہ کے ردّ میں "حزب التوسل الی جناب سید الانبیاء والمرسل" کتاب لکھی۔

۶۲۔ مولانا مفتی ارشاد حسین رام پوری نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء) اہلِ علم میں آپ کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ سرگروہِ غیر مقلداں، میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کی کتاب "معیار الحق" کا ایسا وسیع اور فاضلانہ ردّ "انتصار الحق" کے نام سے لکھا کہ کسی غیر مقلد کو انتصار الحق کا جواب لکھنے کی آج تک جرأت نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے ۴۱۶ صفحات ہیں۔

۶۳۔ مولانا وکیل احمد سکندرپوری رحمۃ اللہ علیہ مشہور عالمِ دین اور صاحبِ تصانیفِ کثیرہ ہیں۔ ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء سے حیدر آباد دکن، سرکارِ آصفیہ کی ملازمت میں رہے۔ وہابیہ کے ردّ میں "ارشاد العنود الی طریق آداب عمل المولود" نامی کتاب لکھی۔

۶۴۔ مولانا محمد شوکت علی صدیقی سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ مشہور عالم اور بزرگ ہیں۔ انھوں نے مولوی محمد اسحاق دہلوی کی مائۃ مسائل کے غلط دلائل دریافت کرنے اور اُن کی خفیہ وہابیت کا راز افشا کرنے کی غرض سے "ازہار الحق بجواب مائۃ مسائل" لکھی اور "علم الیقین فی مسائل الاربعین" بھی آپ کی قابلِ قدر تصنیف ہے۔

۲۔ مولانا عبدالکریم درویش رحمۃ اللہ علیہ نے شفاعت کے بارے میں تقویۃ الایمانی نظریے کے رد میں بنام "جواہر الایقان فی شفاعۃ رسول الانس والجان" تصنیف فرمائی۔

۳۔ مولانا حیدر علی رام پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء)۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) سے حدیث کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے رد میں "انہام الغافل در تفہیم السائل" کتاب لکھی۔

۴۔ مولانا عبدالغفور خاں نساخ رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) وغیرہ غیر مقلدین کے رد میں "نصرۃ المسلمین، الرد علی غیر المقلدین" کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۰۹ھ/۱۸۹۶ء میں مطبع حامی الاسلام دہلی سے باہتمام فیض الحسن خان صاحب طبع ہوئی۔

۵۔ مولانا صبغۃ اللہ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے منکرینِ حیاتِ انبیاء کے رد میں "تنبیہ الاغبیاء فی حیات الانبیاء" نامی کتاب لکھ کر ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں مدراس سے شائع کرایا۔

۶۔ مولانا بشیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مقلد و غیر مقلد وہابیوں کی گمراہی و گمراہ گری کے بارے میں ایک فتویٰ لکھا اور تمام علمائے دہلی نے اس کی تائید و تصدیق میں مہر و دستخط کیے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ازراہِ تقیہ اور اُن دنوں اپنی جماعت کے وجود و عدم برابر دیکھتے ہوئے غیر مقلدوں کے شیخ الکل اور سرپرست میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) نے بھی اس فتویٰ کی تائید کرتے ہوئے مہر و دستخط کیے ہوئے ہیں۔ یہ مبارک فتویٰ مطبع سید الاخبار سے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء میں طبع ہوا۔

۷۔ مولانا محمد شاہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے میاں نذیر حسین دہلوی کی کتاب "معیار الحق" کے رد میں مبسوط کتاب "مدار الحق فی ردِ معیار الحق" لکھی، جو مطبع حسنی دہلی سے ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی۔ صفحات ۴۰۰ ہیں۔

۸۔ مولانا منصور علی بن مولانا محمد حسن مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہما نے غیر مقلدین کے رد میں "فتح المبین فی کشف مکائد غیر مقلدین" کے نام سے ایک مبسوط کتاب

اور اس کا ضمیمہ "تنبیہ الوہابیین" کے نام سے لکھا۔ کتاب ۳۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر دہلی، حیدر آباد اور بریلی کے ۲۳ علمائے کرام کے دستخط ہیں۔ ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۴ء میں یہ کتاب مطبع دار العلوم فرنگی محل لکھنؤ سے باہتمام مولانا محمد یعقوب طبع ہوئی۔

۷۲۔ مولانا محمد امیر الدین اکبر آبادی علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کے بہتر سوالات کے مسکت جواب "انوار محمدی" کے نام سے لکھے اور وہ کتاب مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی۔

۷۳۔ مولانا حافظ محمد یعقوب دہلوی علیہ الرحمہ نے مسئلہ شفاعت میں وہابیہ کے نظریات کا رد کرتے ہوئے کتاب "افضل البضاعۃ فی حقیقۃ الشفاعۃ" لکھی۔

۷۴۔ مولانا محمد عظیم علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کی فہمائش کے لیے "اثبات وجوب تقلید شخصی بالقرآن والاحادیث النبوی" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو احسن المطابع پٹنہ سے ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء میں چھپی۔

۷۵۔ مولانا محمد عبد الرشید بن مولانا محمد عبد الحکیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہما نے منکرین تقلید کے رد میں "القول الرشید فی اثبات التقلید" کتاب لکھی جو مطبع احمد قلندر عسکر بنگلور سے ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء میں چھپی۔

۷۶۔ مولانا محمد مجیب الدین سہارن پوری علیہ الرحمہ نے وہابیہ کے رد میں "اعانۃ المسلمین فی امور الدین" کتاب لکھی۔

۷۷۔ مولانا زین الدین حنفی مدراسی علیہ الرحمہ نے "القول المتین" کتاب لکھ کر وہابیہ کا رد کیا اور اسے مطبع مظہر العجائب مدراس سے ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں طبع کروایا۔

۷۸۔ مولانا قادر علی قادر پوری رحمۃ اللہ علیہ نے "دلیل الیقین فی رد المنکرین" کتاب وہابیہ کے رد میں لکھی۔ یہ مطبع قادریہ کلکتہ سے ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۴ء میں طبع ہوئی۔

۷۹۔ مولانا احمد حسن کان پوری رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء) کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں کنایۃً اور یکروزی میں صراحۃً جو امکان کذب کا عقیدہ اسلامی اکا

خلافِ اسلام نظریہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اُس کے رد میں اور جلد حمایت
کرنے والوں کی تردید کرتے ہوئے کتاب "تنزیہ الرحمٰن عن شائبۃ الکذب والنقصان" لکھی۔
مولانا عبدالسبحان ہسوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء)۔ آپ حضرت
شاہ احمد سعید مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء) کے خلیفہ تھے۔
منکرین تقلید کے رد میں ایک کتاب "التہدید فی وجوب التقلید" کے نام سے لکھی۔
اسی طرح دیگر کتنے ہی علمائے اہلسنت اور عمائدین وقت نے وہابیہ کی تردید میں
کتب و رسائل لکھے اور "گربہ کشتن روزِ اول" پر عمل کرتے ہوئے اس نجدی پودے
وان چڑھنے سے پہلے بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے پر تُل گئے، تقریر و تحریر کے ہر میدان
ں کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ خود ولی اللٰہی خاندان کے علمائے کرام اور شاہ
عزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے خوشہ چین حضرات
و روحانی فرزندوں نے بڑھ چڑھ کر ان خارجیت کے علمبرداروں کا محاسبہ کرنا
کر دیا تو مصنف تقویۃ الایمان کا رشتہ اپنے خاندان اور دہلی مرکز سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ تقسیم
ندی شروع ہو گئی، مسلمانانِ اہلسنت وجماعت سے کٹ کر جو اپنا "محمدی گروہ"
روع کیا تھا، بہت سے مسلمان خبردار ہونے پر اس سے علیحدگی اختیار کرنے لگے اور
رٹش گورنمنٹ کا پہلا تخریبی منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

بندیت کی ابتداء: دُوسرے منصوبے کے دوران، مولوی محبوب علی کی
اِس تحریک سے علیحدگی بلکہ مخالفت کے بعد جب
ید احمد صاحب کے پاس امدادی سامان و رقوم کی ترسیل کا سلسلہ اور نئی بھرتی کر کے
ی ادھر بھیجنے کا معاملہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا، تو مرکز سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی،
مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) جانشین شاہ عبدالعزیز محدث
ی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) بھی دولت کی ادھر فراوانی دیکھ کر کسی قدر
ہو چکے تھے لہٰذا جلد ہی ان کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا یا قائم کر دیا گیا۔ مولوی محمد اسحاق
ی بڑی حد تک صلح کل اور خاموش طبع عالم تھے۔ اِس خارجی ٹولے کے ساتھ بھی

کسی قدر ہاں میں ہاں ملانی شروع کردی لیکن ایسے انداز میں کہ وہابیوں کی جو رُسوائی ہو رہی تھی اُس سے بچا اور علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں اپنا وقار بھی بحال رکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ تقویۃ الایمان میں جن امور کو کفر و شرک ٹھہرایا گیا ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف "مائۃ مسائل" میں، اُن میں سے بعض باتوں کو حرام اور بعض کو ناجائز یا مکروہ لکھا ہے۔ موصوف کی یہ دوغلی پالیسی بھی اُن کے وقار کو قائم رکھنے میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں وہ گرنے شروع ہو گئے تو شرمندگی سے بچنے کی خاطر ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ موصوف کی اِس دوغلی روش کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد نے یُوں وضاحت پیش کی ہے:

"اُنھوں (مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیرالدین) نے وہابیت کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے، دو فرقے ہیں، ایک اسمٰعیلیہ، دُوسرا اسحاقیہ۔ اسمٰعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا جو رسوم و بدعات کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک (یعنی غیر مقلد وہابی) ہو، جیسا کہ مولانا اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔

اسحاقیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے، جو حنفیت و تقلید سے تو انکار نہیں کرتا لیکن بدعات و رسوم کا مخالف (مقلد وہابی) ہے۔ اِس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ اسحاق نے مائۃ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ (مولانا خیرالدین جالندھری) کہتے تھے کہ جب اسمٰعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہابیت نے اپنے عقائد کی اشاعت کے لیے راہ تقیہ اختیار کر لی اور حنفیت کی آڑ قائم کر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔"[1]

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء)، اصل میں اُس وہابی گروہ کے

---

[1] ابو الکلام آزاد، مولوی: آزاد کی کہانی، ص ۱۶۵

ہیں جو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت یعنی محمدی[1] یا موحد[2] یا اہلحدیث[3] جماعت کے منقسم رہ جانے کے بعد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہابیت کے لیبل سے بچنے اور سنیوں سے بھرم رکھنے کی خاطر موصوف ہجرت کر گئے اور جاتے وقت اپنے نئے گروہ کے مفادات کے تحفظ کرنے کی خاطر مولوی مملوک علی نانوتوی کی قیادت میں ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے،

"مولانا عبید اللہ سندھی کا خیال ہے کہ جب ۱۲۵۷ھ میں شاہ اسحٰق حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تو تحریک (ماڈرن وہابیت) کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا، جس کے صدر مولانا مملوک العلی اور تین رکن، مولانا نواب قطب الدین (ف ۱۲۸۹ھ)، مولانا مظفر حسین کاندھلوی (ف ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ/ ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء) اور مولانا شاہ عبد الغنی دہلوی (ف ۲ محرم ۱۲۹۵ھ) تھے۔"[1]

مولانا عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) کے اس سلسلے میں انکشافات تھے، بہتر یہی نظر آتا ہے کہ انہیں خود مولانا سندھی کے لفظوں میں ہی بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ موصوف یوں وضاحت کرتے ہیں:

"مولانا محمد اسحٰق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبد الغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا، جو اس نئے پروگرام (یعنی وہابیت کی جدید تشکیل) کی اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔"[2]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۰۸

[2] عبید اللہ سندھی، مولوی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۰

مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء)

اینگلو انڈین علماء کی کھیپ : جو وہابیوں کی نئی جماعت کے سرپرست مقرر کیے گئے تھے۔ وہ دہلی کالج میں شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے۔ تجویز یہی ہوئی ہوگی کہ جماعت میں عام لوگوں کی باقاعدہ بھرتی کرنے سے پہلے ایسے علماء تیار کیے جائیں، جو گورنمنٹ کے پروردہ اور وہابیت جدیدہ کے دلدادہ ہوں۔ چنانچہ خاموشی اور مستعدی سے اینگلو انڈین علماء کی کھیپ دہلی کالج میں تیار کی جانے لگی۔ مولوی مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"نانوتہ کے لیے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ ' دہلی کالج کے اُستاد تھے۔ نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف وجوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔"[1]

دہلی کالج سے جس قسم کے علماء کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی، وہ گورنمنٹ کے منظور نظر بن کر نکلتے تھے اور وہی انگریز جو مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، وہ اس کالج کے تیار کردہ علماء کو روز گر سینے سے لگاتے اور جلد از جلد انھیں برسر روزگار کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب رقمطراز ہیں:

"مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے اس لیے نانوتہ اور دیوبند کے حضرات ان کی وجہ سے کالج کے تعلیمی وظائف اور دوسری سہولتوں سے بھی مستفید ہوتے ہوں گے اور دہلی کالج کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں منسلک ہونے میں بھی آسانی رہی ہوگی۔ بلکہ ان حضرات کے سرکاری اداروں میں تقرر کے لیے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی ایک قسم کی سند خیال کیا گیا اور یہ سمجھا

---

[1] مناظر احسن گیلانی، مولوی: سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۲۱۰

گیا ہوگا کہ یہ حضرات دہلی کالج کے ذریعے طریقۂ تعلیم وغیرہ سے واقف ہو چکے
ہیں، ورنہ اتنی آسانی سے قدیم طرز کے فارغ التحصیل علماء کو گورنمنٹ،
سرکاری اسکولوں، کالجوں اور محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار عہدوں پر مقرر نہیں
کر سکتی تھی۔"[1]

زمانے کی نیرنگیاں عجیب ہیں، ایک وقت تھا کہ مولوی مملوک علی نانوتوی اہلسنت و
ت میں شامل تھے اور ہندی وہابیت کے سنگِ بنیاد یعنی تقویۃ الایمان کو تفویۃ الایمان
ن کو ختم کرنے والی کتاب) کہا کرتے تھے لیکن ایک وہ وقت آیا کہ وہابیت کے جدید
کا امیر البحر بننا بھی منظور کر لیا۔ مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) نے
طلبہ علماء کی جو کھیپ تیار کی اُن میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں:

* "مولانا مملوک العلی کے تلامذہ کی تعداد کا استقصاء ناممکن ہے۔ اُن کے شاگردوں
میں بڑے بڑے علماء مثل مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی،
مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی،
مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی
دیوبندی، مولانا فضل الرحمن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، مفتی جمال الدین
مدار المہام بھوپال، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، مولوی
عالم علی مراد آبادی (ف ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء)، مولوی سمیع اللہ دہلوی،
مولانا عبدالرحمن پانی پتی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔"[2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت، جو آجکل اہلحدیث کے نام سے متعارف
ہے، متحدہ ہندوستان میں غیر مقبول ہو کر رہ گئی تو مولوی مملوک علی کی سرپرستی میں
ی جماعت بنانے کی سکیم تیار کی گئی پہلے اس کے چلانے والے علماء تیار کیے گئے۔

---

[1] ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۶

[2] ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۰۳

اِس کے بعد برٹش گورنمنٹ نے ایسے اُن منتشر علماء کو کس طرح اور کہاں کہاں مسندِ نوازش پر مسلط کیا، ایک دہلی کالج کی کتنی برانچیں اور ذیلی شاخیں قائم کی گئیں، اِس سلسلے میں مشہور دیوبندی عالم، مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) یُوں رقمطراز ہیں:

"۱۸۵۷ء میں اِس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطانِ دہلی کی طرفداری اور غیر جانبداری کی بنا پر ایک اختلاف رُونما ہُوا اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ بعد میں اِس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کی بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم، دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خاں نے کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔"[1]

نئے مراکز یعنی دیوبند اور علی گڑھ کا برٹش گورنمنٹ کے بارے میں کیا نظریہ تھا، مولوی عبد الحلیم قدوسی کی زبانی سُنیے:

"دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر علی گڑھ فریق اور دیوبند کی جماعت گورنمنٹ کے معاملہ میں قدم سے قدم ملاتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کا مقصد علمی میدان میں مسلمان قوم کو آگے بڑھانا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے انگریز سے کامل وفاداری کو دونوں ہی ذریعہ سمجھتے ہیں۔"[2]

دیوبند مرکز

بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مسلمانانِ پاک و ہند میں سے سرکاری تعلیم حاصل کرنے والوں کو علی گڑھ میں تربیت دینے اور دینی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کو مدرسہ دیوبند میں مخصوص انداز پر ڈھالنے کی مہم چلائی گئی۔ بعض وہ مسلمان تھے جو دہلی کالج کی انگریزی تعلیمات سے کتراتے تھے تو دُوسرے دینی علوم سے جان چھڑاتے تھے، دونوں قسم کے حضرات کو پابندِ سلاسل رکھنے کی خاطر ایک مرکز کے علیحدہ علیحدہ مرکز بنا دیئے گئے۔ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر واضح ہے کہ حکومت

---

[1] عبید اللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۲

[2] ہفت روزہ الاعتصام لاہور ۔ بابت ۹ راکتوبر ۱۹۶۰ء، ص ۲

مرداری کرنے اور اِس طرح حکومت کا اعتماد حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مراعات و
ت کی بھیک مانگ کر پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل کرنا تھا اور قوم کے انگریزی خواندہ یا
ن ذہن رکھنے والوں کو اِسی غلامانہ ذہنیت کی افیون کھلا کر اپنے اپنے دائرۂ کار میں
پھیلنے کے مواقع فراہم کرنے تھے۔ دونوں مرکز کے راستے الگ الگ لیکن منزلِ مقصود
تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ کوئی غلط اقدام کرے یا
ہونے پر مجبور کیا جائے تو بسا اوقات وہ تاویلات کا سہارا لیتا ہے اور اُس غلط حرکت
مت منوانے کی اس انداز سے سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ گویا دُوسروں کا اُس کی
پر ایمان لانا ہی اوّلین فریضہ اور اُن کا مقصدِ حیات ہو۔ اِس مرحلے پر خواہ زاویۂ نظر
ہی خلافِ دین و دیانت ہو جائے اُس کی کم ہی پروا کی جاتی ہے۔ ایسے واقعات
ہو اگر ایک فرد سے سرزد ہوں اُس کی سنگینی کا عالم اور ہے لیکن یہی طرزِ عمل اگر جماعتی
اختیار کر لیا جائے تو اُس کی مضرت کا ایسے حالات میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔
گی کو علی گڑھ اور دیوبند کے مراکز میں تبدیل کرنے کی وجہ بالکل صاف اور سیدھی سادی
ہی سنگین حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ افسانہ نویسی میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچی
۔ مدرسہ دیوبند کے موجودہ مہتمم قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں:

"اچانک چند نفوسِ قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دل میں ایک خلش
اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علومِ نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے
راستے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ
(چشم بد دور) ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات
کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں۔" [1]

موت اِسی سلسلے میں مزید یوں وضاحت فرماتے اور قارئین کو خواب آور گولیاں کھلاتے ہیں

---

[1] محمد رشید ارشد، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ۳۴

"اِس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کے پردے میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی۔" ؎۱

اگر انبیائے کرام کے علوم و معارف کا ذکر آ جائے تو علمائے دیوبند کی برداشت کا پیمانہ نہ صرف لبریز ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات اس طرح چھلک اٹھتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پہ کفر و شرک کا فتویٰ جڑ دینا گویا تکیۂ کلام بن جاتا ہے۔ لیکن یہی حضرات جب اپنے مولویوں کا ذکر کرتے ہیں تو سننے اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو دروازے ان کے بقول انبیائے کرام پر بھی بند تھے وہ علمائے دیوبند کے لیے کس طرح اور کس نے کھول دیئے! اور پھر وہ یہ خلش محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ جن باتوں کے حصول کا یہ حضرات انبیائے کرام تک کے لیے انکار کرتے ہیں، وہی باتیں اپنے علماء کے لیے کیوں ثابت کرتے رہتے ہیں؟ آخر یہ اپنے علماء کا مقام انبیائے کرام سے بھی اونچا دکھانے میں کیوں کوشاں رہتے ہیں؟ آئیے قاری محمد طیب صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے۔" ؎۲

جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو جھونپڑیوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کی ہمہ گیری نے آج تو اعلان اور پروپیگنڈے کے انداز ہی بدل دیئے لیکن جب یہ ذرائع حاصل نہ تھے اس وقت بھی آخر تبلیغ اور پروپیگنڈے کے پسندیدہ طریقے موجود تھے مگر کارکنانِ دارالعلوم دیوبند نے اس وقت بھی اپنے پروپیگنڈے کی بنیاد کشف و کرامات پر رکھی جو وہابیت و دیوبندیت کی ضد ہے۔ چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں کہ:

؎۱ عبدالرشید، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۵

؎۲ ایضاً، ص ۲۹

"جس وقت دیوبند کے مدرسہ میں چھپر پڑے ہوئے تھے آپ (مولانا محمد یعقوب صاحب) نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں مکان پکے ہیں اور اُن پر چھپر پڑے ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ الحمدُ للہ مدرسہ کے یہ مکانات مقبول ہیں۔" ؎

مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے کی ضرورت کس کو پیش آئی تھی؟ اس کے بانی، مدرس چلانے والے کون حضرات تھے؟ اِس سلسلے میں جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم، مولوی محمد علی قدوسی یوں لکھتے ہیں:

"ایسے میں چند ایسے حضرات میدان میں آئے جن کی پُوری تربیت گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں ہُوئی تھی اور سرکاری ملازمت میں رہ کر وُہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کے مکمل وفادار ثابت کر چکے تھے۔ انھوں نے دیوبند میں ایک عربی دینی مدرسہ "دار العلوم" کی بنیاد رکھ دی۔ اُوپر کے بیان کردہ پس منظر میں دیکھا جائے تو دینی تعلیم کا یہ اہتمام گورنمنٹ انگریزی کی منشا اور پالیسی کے مطابق تھا اور چونکہ اس پہلے دینی مدرسہ کے یہ بانی اور صدر مدرس، دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور سرکاری ملازمت میں رہ کر گورنمنٹ کا مکمل اعتماد حاصل کر چکے تھے، نیز یہ حضرات ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، اس لیے قدرتاً انگریزی گورنمنٹ نے اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی، بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اس مدرسہ کے قیام میں اُس (حکومت) کا کسی طرح کا ایماء شامل ہو۔" ؎

قاری محمد طیب صاحب نے دار العلوم دیوبند کے بانی، مدرسین، اراکین مجلس اور معاونین کا ذکر یوں کیا ہے:

"اِس بنا پر خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ،

؎ عزیز الرحمٰن منصور پوری، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۷۷

؎ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ / اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ اور مولانا فضل الرحمن صاحب قدس سرہٗ
قابلِ ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیسِ مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات
خصوصیت سے حضرت نانوتوی صاحب قدس سرہٗ (مولانا محمد قاسم) کے
دست و بازو رہے ہیں اور بنا کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکین
کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔" [۱]

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پہلا صدر المدرسین کون مقرر کیا گیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادری
یوں جواب دیتے ہیں:

"جب ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ اسلامیہ دیوبند قائم ہوا، تو مولانا
محمد یعقوب صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس وقت مولانا محمد یعقوب سرکاری
ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔" [۲]

مولوی عبدالحق قدوسی نے موصوف کی تقرری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں
کیا ہے:

"قیامِ مدرسہ کے بعد سب سے پہلے صدر مدرس کی حیثیت سے جس شخص کا
تقرر ہوا وہ مولانا مملوک العلیؒ کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی تھے۔
عجیب اتفاق ہے کہ یہ بزرگ بھی بانیانِ مدرسہ کی طرح ڈپٹی انسپکٹر مدارس
کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ بزرگ بھی ۱۸۵۷ء کے وقت اسی عہدہ
پر فائز تھے۔" [۳]

بانیانِ مدرسہ اور اُس کی مجلس کے خاص اراکین میں سے مولوی ذوالفقار علی دیوبندی،
مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی نیز اس مدرسہ کے اوّلین صدر مدرس یعنی مولوی محمد یعقوبؒ
کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھتے ہوئے ان حضرات کی ملازمتوں کا

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی ، "بیس بڑے مسلمان"، ص ۲۶

[۲] محمد ایوب قادری، پروفیسر، "مولانا محمد احسن نانوتوی"، ص ۱۹۲

[۳] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۹ راکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۲

یب بہت بڑی الجھن کو سلجھا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"دہلی کالج کے فاضل مدرس، مولانا مملوک العلی کے وطن و برادری کے جن حضرات نے مولانا کی سرپرستی میں تعلیم پائی وہ حضرات بھی تعلیمی نظام میں منسلک نظر آتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن دیوبندی اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی اجمیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے پھر بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔"[1]

ذوالفقار علی دیوبندی کے بارے میں ایک جگہ موصوف نے یوں مزید وضاحت کی ہے:

"شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بریلی کالج میں پروفیسر تھے۔ مولانا ذوالفقار علی کا بریلی میں کئی سال قیام رہا۔"[2]

مدرسہ دیوبند کے اولین صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی اور مولوی فضل الرحمن دیوبندی کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

"مولانا محمد یعقوب بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا محمد احسن کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بریلی میں تھے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمن دیوبندی بھی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ جب مولانا محمد احسن نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں بریلی کو چھوڑا تو بعض معاملات و انتظامات ضروری مولانا فضل الرحمن ہی کے سپرد کیے تھے۔"[3]

---

[1] ایوب قادری، ڈاکٹر پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۸

[2] ایضاً، ص ۲۵

[3] ایضاً، ص ۲۶

اگر پروفیسر فیروزالدین رُوحی ناراض نہ ہوں اور ہمیں اس جسارت پر معذور سمجھتے ہُوئے معاف فرمادیں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ التجا بصد ادب کرتے ہیں کہ وُہ اپنے ممدوحین علمائے دیوبند یعنی برٹش گورنمنٹ کے پروردہ اور ریڈی میڈ نہیں، بلکہ تیار کردہ اینگلو انڈین علماء کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کا یہ بیان پڑھیں اور اسے اپنی تصنیف جس کا غلطی سے "آئینۂ صداقت" نام رکھ بیٹھے ہیں، درج فرمائیں، کیونکہ درج ذیل دونوں بیان اگر "آئینۂ صداقت" کے اگلے ایڈیشن میں ایڈ کر لیے جائیں تو ان کے پڑھ لینے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ لیجیے پہلا بیان موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً آگے بڑھیں اور مسلمانوں (اینگلو انڈین علماء) کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی کہ جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، تو خاص ان کے اعزہ و احباب ہیں۔ ان کے علاوہ شمس العلماء شیخ ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں کہ جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حسن صلہ سے نوازا۔"

لـه محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۰۰

جس مقصد کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے مدرسہ دیوبند قائم کرنے کا ان حضرات کو
یا تھا، حکومت کا وہ مقصد کہاں تک پورا ہو رہا تھا؛ حکومت نے اس امر کا
بر پر جائزہ لیا۔ پڑتال کرنے والے انگریز افسر کے تاثرات یہ تھے:

"اس مدرسہ نے یومًا فیومًا ترقی کی۔ ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ
لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمی پامر نے اس مدرسہ کو دیکھا
تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند
سطور درج ذیل ہیں: جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے
صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں
روپیہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہوار پر کر رہا ہے
یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ ممد و معاون سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ
لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن و سلیم الطبع ہیں کہ ایک کو دوسرے سے
کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں جو یہاں تعلیم نہ ہوتا ہو۔ صاحب
مسلمانوں کے لیے تو اس سے بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی
اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پاوے تو خالی نفع
سے نہیں۔ اے صاحب! سُنا کرتے تھے کہ ولایت انگلستان میں اندھوں
کا مدرسہ ہے۔ یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر، اقلیدس کی شکلیں
لعت و صحت پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید"[1]

اعجاز الحق قدوسی نے اس معائنہ پر جو تبصرہ کیا ہے، سردست وہ بھی ملاحظہ
ہو، جناب موصوف نے مذکورہ واقعہ نقل کرنے کے بعد یوں اپنے تاثرات کا
[اظہار کیا] ہے:

معائنہ کرنے والے انگریز نے اپنی رپورٹ کے اس ٹکڑے میں دارالعلوم

---

[1] ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۱۷

دیوبندی کی دو خصوصیات بتائی ہیں۔ (۱) موافق سرکار (۲) ممد و معاون سرکار۔
پہلی خصوصیت تو واضح ہے کہ اس مدرسہ میں کام کرنے والے لوگ
سرکار انگریزی کے پورے پورے وفادار ہیں اور یہاں کسی قسم کی بغاوت
کے جراثیم موجود نہیں، لیکن دوسری خصوصیت کہ یہ مدرسہ سرکار کا معاون
بھی ہے، غور طلب ہے، سوال یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا مدرسہ جس میں
چند درویش منش بزرگ صبح و شام عموماً قال قال ابو حنیفہ کی تعلیم دیتے ہوں،
برطانیہ جیسی عظیم سلطنت سے کیا تعاون کر سکتے تھے؟" [1]

مولوی عبد الحق قدوسی کو مسٹر پامر کی اس رپورٹ پر کہ یہ مدرسہ ممد و معاون ہے
حیرانگی تھی کہ چند ملاؤں کا جگتا، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت کی کیا مدد کر سکتا تھا، لیکن مو
اس رابطے سے منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد و اعانت کے بارے میں وہ خود یوں رقمطراز

"یہ تو ہم نہیں کہتے کہ یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے بعد میدان جنگ میں انگریزی فوج کے
شانہ بشانہ مجاہدین کے خلاف لڑے تھے اور نہ ہی ہمارے پاس کسی قسم کے
مادی تعاون کا کوئی ثبوت ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ۱۸۶۵ء میں
بننے والے اس دینی مدرسہ نے جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لیے بڑا اہم کردار
ادا کیا اور ہماری رائے میں یہی وہ خدمت جلیلہ ہے جسے مسٹر پامر اپنے الفاظ
میں کہہ رہے ہیں کہ یہ مدرسہ ممد و معاون سرکار ہے۔" [2]

مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد اسی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی مملوک علی نانوتوی کے
(۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء) کے شاگردوں نے "مظاہر العلوم" کے نام سے سہارنپور میں
مدرسہ بھی قائم کر لیا۔ قدوسی صاحب لکھتے ہیں:

"اسی پرسکون ماحول میں علمائے احناف (وہابی دیوبندی) علماء نے ۱۸۶۶ء

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

[2] ایضاً، ص ۶

کو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اس سے صرف چھ ماہ بعد مظاہر العلوم (سہارن پور) کا قیام عمل میں آیا۔ ان مدارس نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ اول الذکر مدرسے کو بجا طور پر ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں مدرسے ۱۸۶۶ء میں قائم ہوئے لیکن ان کا تصور ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد بعض ذہنوں میں آچکا تھا، بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی تو دارالعلوم دیوبند کو دہلی کالج کا ہی ایک حصہ قرار دیتے تھے۔[1]

اینگلو انڈین علماء کی دوسری دینی درسگاہ یعنی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کس قائم کیا؟ صدر مدرس اور پہلے شیخ الحدیث کون مقرر ہوئے؟ اس بارے میں پروفیسر ایوب قادری یوں وضاحت فرماتے ہیں:

"رجب ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں مولوی سعادت علی سہارن پوری نے ایک مدرسہ سہارن پور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضل حق (ف ۱۳۰۲ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرید اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے۔ مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام "مظاہر علوم" تجویز ہوا۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری بھی اس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم ہندوستان کی مشہور اسلامی درسگاہ ہے۔ اس نے مذہب و علوم اسلامی کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ بڑے بڑے

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۹

نامور علماء اِس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے اور برصغیر پاک و ہند میں دین وملت کی خدمات میں مصروف ہیں۔" [1]

مدرسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء) کون تھے اور کہاں کے فیض یافتہ تھے؟ اِس سوال کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقم فرماتے ہیں:

"مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۲۲ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وحفظِ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔ "دہلی کالج" میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی۔۔۔۔ مولانا محمد مظہر تحصیلِ علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہو گئے، وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔" [2]

مولوی محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء) کے دوسرے بھائی مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء) بھی مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور دہلی کالج کے پروردہ تھے۔ تحصیلِ علم کے بعد موصوف بنارس کالج اور بریلی کالج میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں قادری صاحب نے یوں وضاحت فرمائی ہے:

"اِسی طرح مولوی مملوک العلی کے عزیز و تلمیذ مولانا محمد احسن جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرسِ اوّل فارسی اِن کا تقرر ہوا۔" [3]

"بنارس میں مولانا ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں پہنچے اور جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں مولانا محمد احسن کا تعلق بنارس سے یقیناً ختم ہو چکا تھا

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۵۵۔

[2] ایضاً، ص ۱۵۴

[3] ایضاً، ص ۳۰

کیونکہ یہی زمانہ بریلی میں آنے کا ہے۔۱؎

"مولانا محمد احسن صاحب فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور مولانا بنارس سے جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی پہنچے۔ مولانا محمد احسن بریلی کالج میں شعبۂ فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔ جب عربی کا اجراء ہوا، تو دونوں شعبوں کی صدارت ان ہی کو تفویض ہوگئی۔"۲؎

مولوی محمد مظہر نانوتوی کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی بھی دہلی کالج کے طالب علم اور مولوی مملوک علی نانوتوی کے تلمیذ تھے۔ موصوف دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے تھے۔ قادری صاحب یوں لکھتے ہیں:

"مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۲۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی ...... ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہوگئے۔ مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم رہے اور اس کا نظم و نسق زیادہ تر ان ہی سے متعلق رہا۔ بریلی سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت گہرے تعلقات اور دونوں بچپن کے ساتھی تھے مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ ایمانداری و دیانتداری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔"۳؎

قارئین کرام! یہ تھے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی بنیادیں رکھنے والے، وہاں پڑھانے والے اور انہیں چلانے والے۔ مذکورہ بالا حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ پہلے ان حضرات کو دہلی کالج میں گورنمنٹ نے اپنے ڈھب پر تربیت دی۔

۱؎ ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۹

۲؎ ایضاً: ص ۴۲

۳؎ ایضاً: ص ۱۵۶/۱۵۸

اس کے بعد بڑھاپے تک انھیں سرکاری ملازمت میں رکھ کر اچھی طرح اُن کی وفاداری کا صلہ دیا گیا۔ بعض حضرات کو کالجوں میں پروفیسر رکھا گیا اور دُوسرے ڈپٹی انسپکٹر مدارس (کالے پادری) بنا کر رکھے گئے۔ جب یہ صاحبان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنی مہربان حکومت کے وفادار ہی ثابت ہُوئے تو بٹوارہ ہونے کے بعد ان کی طرف الہام کر دیا جاتا تھا کہ اب آپ دین کے نام پر مسلمانوں کے دیندار طبقے کی رہنمائی کریں یعنی مسلمان آپ حضرات سے دینی بصد شوق حاصل کریں لیکن حکومت کے مکمل وفادار اور بہی خواہ رہنے کی تربیت دینی ہوگی اور انھیں اسی رنگ میں رنگنا ہوگا، جس میں آپ لوگوں کو رنگا گیا ہے۔

حکومت تو ان مدارس کی اندرون خانہ سرپرستی کر ہی رہی تھی اور یہ ساری مشینری اسی دستِ غیب سے چل رہی تھی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو ادھر مائل کرنے کی غرض سے دیوبندیوں نے کارکنانِ دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، خلوص و للّٰہیت اور کشف و کرامت کے ایسے افسانے گھڑنے شروع کر دیئے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بھی کان کاٹ دیئے اور بھولے بھالے مسلمان ان کے جال میں پھنسنے شروع ہو گئے۔ یہ جال ایسا طلسماتی بنایا گیا کہ اس وقت اس چکر کو کیا سمجھ سکتے جبکہ پاک و ہند کے کتنے ہی مدعیانِ اسلام آج تک اس کی تعلیمات کے زہر ہلاہل کو اس کی ظاہری خوشنمائی کے پیشِ نظر سمجھ نہیں پاتے اور اس زہر کو تریاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہابیت کا اصلی اور پہلا ایڈیشن مکمل طور پر ناکام ہُوا۔ رہی سہی کسر معرکۂ بالاکوٹ نے نکال دی۔ علمائے کرام کا اس کی تردید اور بیخ کنی میں سرگرم ہو جانا اور عوام الناس کا اس نئے مذہب والوں سے نفرت کرنا، ایسے امور تھے جن کی بنا پر یہ گروہ بڑھنے کی بجائے مزید سکڑ کر رہ گیا اور ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، یہ شروع میں محمدی گروہ پھر موحدین اور آجکل اہلحدیث کہلانے والے ہند و پاک میں انگلیوں پر گنے جا سکتے آخر اس گروہ نے گورنمنٹ کی سرپرستی کے باوجود ترقی کیوں نہ کی؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب کتاب وہابیت کا دُوسرا ایڈیشن دیوبندیت کے نام سے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے لگا تو یہ اتنا میٹھا اور خوشنما زہر تھا کہ عوام الناس اس کی مضرت

پس نہ کر سکے اور اِس کثرت سے اس زہر ہلاہل کے طلبگار ہونے شروع ہو گئے کہ
دست بھی ہزار جان سے اِس کی بلائیں لینے لگی اور اہلحدیث جماعت پر جو خصوصی نظر تھی وہ
ے اضافہ دار العلوم دیوبند پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔
چند علما نے دیوبندی قسم کی روش اختیار کر کے دہلی کالج سے تربیت پا کر ، یہ مشہور
اری کیا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ درخت پروان چڑھا ، پھلا پھولا اور اِس کی شاخیں پاک و ہند
کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں کیونکہ بعض بھولے بھالے مسلمان اِن حضرات کے زبردست پروپیگنڈے
کے باعث اِنھیں خطرناک ترین وہابی نہیں بلکہ مُصلح سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ اسلامی عقائد میں اِس
غیر محسوس طریقے سے کفریہ عقائد و نظریات کی آمیزش کر کے مسلمانوں کے دین و ایمان
برباد کرتے رہے ہیں کہ مارے خوشی کے انگریزی حکام بھی پھڑک اُٹھتے تھے اور عنایات
نوازشات کا اندرونِ خانہ بھی اہتمام کیا کہ جس جماعت کی تعداد پانچ دس ہزار سے زائد نہ تھی
اُن کا مدرسۂ دیوبند، چھپروں اور جھونپڑیوں سے ترقی کرتا ہوا جامع ازہر کے بعد دنیا کی
سب سے بڑی مذہبی درسگاہ بن گیا۔
دار العلوم دیوبند اور دیوبندی گروہ کی ترقی گویا اہلحدیث حضرات کی تنزلی
پروانہ تھا۔ اِس کی ترقی کے ساتھ ہی یہ حضرات تنگی اور کس مپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور
ہو گئے۔ اِس دوران میں اِس محمدی یا اہلحدیث گروہ کا دو چار مقامات پہ انگریزوں سے
بھی ہوا، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا بلکہ نقصان ہی اٹھاتے رہے اور آخر کار یہ لوگ بھی اپنی اکثریت
کے ساتھ متفق ہو کر حکومت کی وفاداری اور بہی خواہی پر ایمان لے آئے۔ میاں نذیر حسین
دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) ، نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷ھ /
۱۸۸۹ء) اور مولانا محمد حسین بٹالوی وغیرہ حضرات کی سرکردگی میں ساری جماعت ہی حکومت
کے وفادار ہونے پر متفق ہو گئی۔ اِس جماعت کی زندگی کے یہ تین ادوار ہیں یعنی پہلے دور میں
گورنمنٹ کے منظورِ نظر ، دوسرے دور میں اکثریت وفادار اور بعض حکومت کے خلاف
تیسرے دور میں سب حکومت کے بہی خواہ اور منتظرِ نظرِ کرم۔
دار العلوم دیوبند جو دہلی کالج کی شاخ اور وہابی حضرات کا دوسرا مرکز بنا ، اِس

..ؤ دور گزرے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف۔ ابتدائی ایام اور پہلے دور میں انگریزوں
کی مکمل سرپرستی اور تائید وحمایت حاصل رہی۔ خوب جی بھر کر عنایت سرکار کے مزے لوٹے۔
دوسرا دور وہ ہے جب متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں گاندھی کی آندھی چلی۔ ہندوؤں نے منصوبے
کے تحت حکومت کے ہر محکمے میں فوج اور پولیس میں اپنے آدمی کثیر تعداد میں شامل کر لیے۔
تجارت وملازمت اور صنعت وحرفت کے ذریعے خوشحال ہونے لگے تو چھ ردیوں کے جال بچھا کر
سُود در سُود کے چکر میں مسلمانوں کی جائدادوں پر قابض ہونے شروع ہو گئے۔ غرضیکہ ہر قسم کی
طاقت وقوت حاصل کر لینے کے بعد ہندوؤں نے حصولِ آزادی کی خاطر انگریزوں سے سرد جنگ
جاری رکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس دور میں علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ ہندوؤں کی
بے پناہ تیاریوں کے مقابلے میں اب انگریز زیادہ عرصہ ہندوستان پر قابض نہیں رہ سکتے اور وہ
دن دور نہیں کہ ہندوستان کی فضاؤں میں اوم کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ صورتِ حالات کا
اس طرح تجزیہ کرنے کے بعد علمائے دیوبند نے اپنے سرپرستوں اور محسنوں کو الوداعی سلام
کیے بغیر توقع حکمرانوں کے در کی گدائی شروع کر دی۔ کانگرس نے ان حضرات کی ناز برداری
ور تالیفِ قلب کا پورا پورا خیال رکھا اور انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر انھیں نوازتے رہے۔
اس دور میں یہ حضرات مکمل طور پر ہندو مفادات کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دینے
کے لیے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت یہ حضرات ہندوؤں پر کچھ اس طرح پروانہ وار
اور گاندھی جی کے پجاری ہو کر رہ گئے کہ ہندوؤں نے انھیں انگریز کی گولیوں کا نشانہ
بننے کی ترغیب دی تو یہ لبیک کہہ کر سوراج کے دیوتا پر بھینٹ بن کر چڑھنے کے لیے تیار
ہو جاتے اور ایسی موت کو شہادتِ عظمیٰ سے کسی طرح کم ماننے پر تیار نہ ہوتے اور اگر
گاندھی جی یا پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا حکم دیا
ترغیب ہی دلائی تو یہ حضرات اپنے اصطلاحی مشرکوں اور بدعتیوں کو نقصان پہنچاتے ہیں
کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ پاک وہند
کے مفادات کو جتنا نقصان اس تحریک وہابیت نے پہنچایا ہے اتنا مشرکینِ ہند بھی
آج تک نہیں پہنچا سکے ہیں۔ اپنے دوسرے دور میں دیوبندی حضرات واقعی انگریزوں کے

ت بن کر بھی رہے لیکن ہندو مفادات کی خاطر مسلم مفادات کے لیے ان حضرات کا وجود
خوارج کی طرح ہمیشہ ایک چیلنج بن کر ہی رہا ہے۔ باری تعالیٰ شانہٗ ابنائے زمانہ کو
ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین۔

ی گڑھ مرکز

بقول مولوی عبیداللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) دہلی کالج کا
انگریزی حصہ، اسی کالج کے تربیت یافتہ سر سید احمد خاں کی گڑھ سے لگے
یا پہلے جو وہابی حضرات کا ماڈرن اور پُراسرار مرکز، دہلی کالج مقرر ٹھہرا تھا، آگے چل کر
س کے دو حصے یا دو مراکز بن گئے، ایک دیوبند اور دوسرا علی گڑھ۔ اس دوسرے مرکز
گڑھ کو مغربی علوم و تہذیب کے دلدادگان کا مرکز قرار دیا گیا اور آہستہ آہستہ پورے
ب میں اس کی برانچیں قائم کر دی گئیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مستقل مراکز کی حیثیت
صل کرتی چلی گئیں۔ اس طرح پورے ملک میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب چھا گئی اور یہ
دونوں چیزیں اس طرح پاک و ہند کے باشندوں کے دماغ و اعصاب پر سوار ہو گئیں
ریزوں کو ہمارے ملک سے گئے ہوئے چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے لیکن
مغربی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا تو دور کی بات ہے، خود مسلمان کہلانے والوں نے انھی
سی طرح اپنا ضابطۂ حیات اور لائحۂ عمل بنایا ہوا ہے، جیسے مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی
قرآن و سنت کے احکام کی پیروی میں مضمر نہیں بلکہ مغربی لعنتوں میں ہے۔ باری تعالیٰ
ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علی گڑھ کالج کے بارے میں عرض کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا
ضروری نظر آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد برٹش گورنمنٹ نے جو پالیسی وضع کی اس کو مولوی عبیداللہ
سندھی کے لفظوں میں بیان کر دیا جائے:

> "بات دراصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے تلخ تجربہ کے بعد انگریز سرکار اس قدر حساس
> ہو چکی تھی کہ وہ جب بھی ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں کسی قسم کے
> اضطراب و اشتعال کے آثار محسوس کرتی تو قبل اس کے کہ حالات خطرناک
> صورت اختیار کر جائیں، مسلمان قوم کے سامنے کوئی نئی چیز مسلمان لیڈروں

کے ہی ذریعے پیش کر دیتی جس سے مشتعل قوم کا رُخ خود بخود دوسری طرف پھر جاتا۔"[1]

علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کی تحریک کیوں چلائی گئی: مولوی سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) نے اس پُراسرار حقیقت کے چہرے سے یوں پردہ ہٹایا تھا:

"واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور اُن کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑ ہوتی تھی۔ حکام کے سامنے اِن ناخوشگوار حالات کا تدارک از بس ضروری تھا۔ اِس لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو اِدھر سے اُدھر پھیر دے۔ یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا، جس کو لے کر ہز ہائنس سر آغا خان، جو اُس وقت کے مسلم قومی راہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے۔"[2]

علی گڑھ کالج کے اصل کرتا دھرتا سر سید احمد خاں تھے۔ دہلی کالج سے تحریف شدہ مذہب یعنی وہابیت کو بشکل دیوبندیت لے کر آئے تھے لیکن علی گڑھ میں آ کر کریلا اور نیم پر چڑھ گیا، موصوف نیچریت کے بانی بن گئے اور اِس طرح مسلمانوں کی خیر خواہی و اصلاح کے نام پر ساتھ ساتھ مقدس اسلام کی بیخ کنی کا فریضہ، جو حکومت کی طرف سے عائد ہوا تھا، سرانجام دے کر گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرتے رہے۔ مسلمانوں کی خیر خواہی معیوب نہیں، انھیں تباہ کن حرکتوں کے نتائج سے خبردار کرنا دشمنی نہیں، دولت، علم و فن اور اخلاق و کردار میں مسلم قوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنا بدخواہی نہیں بلکہ یہ امور تو مستحسن ہیں۔ اگر واقعی یہ مصلح اور ریفارمر بننے والے یہی کچھ کرنا چاہتے تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

[2] سلیمان ندوی، مولوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۳۱

جسم کے دین پر عمل جراحی کی مشق کس غرض سے فرمائی گئی تھی؟ مسلمانوں کے دین وایمان
باہ و برباد کرنے والا کیا اُن کی حقیقی خیر خواہی کے تصور سے بھی آشنا ہو سکتا ہے؟
یت پر گفتگو ہم انشاء اللہ تعالیٰ باب سوم میں کریں گے۔ دہلی کالج کا انگریزی حصہ علی گڑھ
یا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ سے کہاں تک پھیلا۔ بریلی اور میرٹھ کی درس گاہوں کے
ے میں ملاحظہ ہو:

"بریلی کی یہ درس گاہ اور میرٹھ اسکول، دہلی کالج کی شاخ قرار پائے۔ ۱۸۴۸ء
تک بریلی اسکول میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں بریلی کا
اسکول، کالج بنا دیا گیا۔" [1]

کہ یونیورسٹی کے قیام کی وجہ مولوی سید سلیمان ندوی (۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے
تائی ہے:

"گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اس کا
نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں ان لوگوں
کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ نئے تعلیم یافتوں
میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اس سب کمیٹی
میں داخل ہوئے جو اسلامک اسٹڈیز کے لیے بنی تھی۔" [2]

زخم کیا تھا جس پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مرہم لگایا گیا؟ اس کا جواب مولوی عبد الحق
...ی کی زبانی سنیے:

"...۱۹۱۰ء میں جب تقسیم بنگال کی تنسیخ کا فیصلہ ہوا تو مسلمانوں میں
سخت اشتعال پیدا ہوا اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گورنمنٹ
نے اس کا علاج جو تجویز کیا، وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام تھا۔" [3]

---

[1] محمد ایوب قادری، چہرۂ ضمیر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۳

[2] سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۵۲۰

[3] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۰ء، ص ۵

یونیورسٹیوں کا قائم ہونا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلا دیا گیا اور انگریز نے اِن کے ذریعے جس مقصد کو حاصل کرنا تھا وہ بڑی آسانی سے حاصل ہو گیا۔ انگریزی زبان کا سیکھنا اور سکھانا بُرا نہیں یہ بھی دُوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے اور اِس کا سیکھنا کسی طرح معیوب نہیں ہو سکتا۔ اِن انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی دو باتیں معیوب تھیں جو سنتِ نصاریٰ کے طور پر آج تک کمال عقیدت کے ساتھ اپنائی جا رہی ہیں اور مسلمان کہلانے والے بھی اُن معائب کو دُور کر کے اپنی درسگاہوں کو باعثِ خیر و برکت کر دکھانے اور انھیں دنیا و عقبیٰ کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنانے سے کتراتے رہتے ہیں۔ اِن سرکاری درسگاہوں کی دونوں خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ادارے مغربی تہذیب و تمدن سکھانے کی تربیت گاہیں بنائے گئے ہیں اور دُوسری خرابی یہ کہ اسلامی علوم و معارف سے طلبہ کو علمی اور عملی طور پر بڑی حد تک دُور ہی رکھا جاتا ہے۔ انگریز تو مسلمانوں کو اور خصوصاً اُن کے پڑھے لکھے طبقے کو دین سے ناواقف دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا لیکن پاکستان کی کسی حکومت نے آج تک یہ وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اپنی درسگاہوں سے اسلام کو باہر نکال کر، مسلمانوں کی موجودہ نسل کو دین سے ناواقف رکھ کر کون سا مقدس مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے؟

پاک و ہند میں انگریزی درسگاہوں کے محرک بننے کا جس ہستی کو حکومتِ وقت نے شرف بخشا تھا: وہ سر سید احمد خاں تھے۔ موصوف کے بارے میں شیخ اکرام صاحب اِسی تعلیم سے متعلق یُوں وضاحت کرتے ہیں:

> "خود سرسید ۹۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جس سے قومی بھلائی کی اُمید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں"۔ [۱]

اصل بات یہ ہے کہ اِن درسگاہوں کے ذریعے حکومت یہی چاہتی تھی کہ مسلمان اپنے اسلاف

---

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، بارِ ہشتم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۸

؛ منقطع کرلیں اور حکومتِ وقت کے مکمل وفادار بن جائیں۔ شیخ اکرام صاحب نے اس
ت کو یُوں بیان کیا ہے :

"علی گڑھ تحریک کے راہنماؤں میں ذہنی آزادی کی کمی نہ تھی۔ قوم کو سلف کی
کورانہ تقلید سے آزاد کرانے اور اس تقلید کے حامیوں کی مخالفت برداشت
کرنے کے لیے بڑی جرأت اور صحیح آزاد خیالی کی ضرورت ہے اور سر سید،
حالی اور اُن کے رفقاء میں یہ آزاد خیالی پوری طرح موجود تھی، لیکن اس کے
باوجود ان بزرگوں کی تصانیف پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ انھیں مغرب سے
ایک قسم کا حُسنِ ظن تھا اور مغربی تعلیم، مغربی ادب اور مغربی علوم و فنون
سے اُنھیں ایسی توقعات تھیں جو زیادہ تر عقیدت یا ناواقفیت پر مبنی تھیں۔
مغرب سے ان بزرگوں کو تو فقط ایک حُسنِ ظن تھا لیکن جن لوگوں نے انگریزی
کالجوں میں تعلیم پائی، اُن میں غلامانہ ذہنیت بُری طرح جلوہ گر تھی۔ اُن کے
نزدیک مغرب کی ہر ایک چیز اچھی تھی اور مشرق کی ہر ایک چیز بُری۔" [1]

علی گڑھ تحریک نے مغربی علوم و فنون کو متحدہ ہندوستان میں رائج کر نے اور
لمانوں کو اُن کے دین و مذہب سے بے بہرہ رکھنے کی جس برطانوی پالیسی کی بیل منڈھے
ھائی اُس کے بدترین نتائج آج بھی پوری قوم کو بھگتنے پڑ رہے ہیں اور اب وہی لوگ
ی قسمت کے مالک اور ان کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بن جانے
بعد، جس اسلام کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اُسی سے پاکستان کی
ورست اس طرح ڈرتی اور بدکتی آئی ہے جیسے سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور اسی خطرے
ٹالنے کی خاطر اسلام کے رہے سہے نشانات کو مٹانے کی اس طرح سے مسلسل کوشش
جاتی رہی ہے کہ گویا اسلام دشمنی میں انگریز بھی ان کے شاگرد ہی تھے۔ ان درسگاہوں
مغرت کا یہ عملی نظر ہر وقت بھی نظر آتا تھا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اس حقیقت

---

[1] محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، ص ۲۰۰

ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے :

"اگر آپ اُن بزرگوں کا معاملہ اُن کے ضمیر اور احساسِ فرض پر چھوڑ دیں اور ارکانِ مذہب کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لیے نظرانداز کر دیں تب بھی علی گڑھ کی فضا میں اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کم ہمتی کا سراغ ملے گا۔"[۱]

اِس قدر تسلیم کر لینے کے بعد بھی آج تک کالج اُسی ڈگر پر چلائے جا رہے ہیں۔ خود علامہ شبلی نعمانی اور حالی پانی پتی بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اِن دونوں حضرات کے متعلق یوں مذکور ہے :

"علی گڑھ کی علمی پستی سے مولانا (شبلی) کو جو شکایت تھی وہ بجا ہے اور ہم اس پر گزشتہ اوراق میں تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ کالج کی یہ کوتاہی اِس قدر افسوسناک تھی کہ اُس نے حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کو بدظن کر دیا۔ وہ سرسید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں : "چھبیس برس کے تجربے سے اُن کو اِس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"[۲]

مسلم یونیورسٹی کے قیام، اسکولوں اور کالجوں کے اجرا اور اِن کے ذریعے مغربی علوم و فنون اور تہذیب سے مسلمانانِ ہند کو بہرہ ور کرنے نیز اسلام سے کورا رکھنے کی جو سرسید احمد خاں صاحب اور حکومتِ وقت نے کوشش کی تھی، اُس میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ اِس حقیقت کے چہرے پر آج تو مطلقاً کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر اپنی آنکھوں سے نونہالانِ قوم کی حالتِ زار دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے کہ یہ ہے قوم

---

[۱] محمد اکرام شیخ : موجِ کوثر، ص ۱۵۱

[۲] ایضاً : ص ۲۸۸

...سارِ گراں بار جن کے ہاتھوں میں کل ملت کی تقدیر ہوگی، جس قوم کی قسمت کے مالک یہ
...ل ہوں گے اُس کا مقدر اندھیری رات میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ مغربی علوم و فنون
فیض یاب ہونے والوں کی یہ افسوس ناک حالت پہلے ہی روز سے دکھائی دینے لگی تھی۔
...یہ مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کے شریک کار، فضل الدین احمد
...صاحب کا ایک بیان یوں منقول ہے:

"یہ بات عام طور پر مسلم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں اور اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے، نماز پڑھتا ہوا نظر آجاتا یا قرآن شریف کی کوئی آیت اُس کی زبان و قلم سے نکل جاتی تو لوگوں کو ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص واقعے کی طرح اُس کا ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے۔"[۱]

...تھے اینگلو انڈین علماء کے قائم کردہ دو مراکز جو دیوبند اور علی گڑھ میں قائم ہوئے۔ اول الذکر
...جس کے کارکنوں نے خود کو دینی تعلیم کی کمی دور کرنے اور مسلمانوں کو علوم دینیہ سے مالا مال کرنے
...لے ٹھیکیداروں کی صورت میں ظاہر کرنا شروع کیا اور موخر الذکر نے ملتِ اسلامیہ کو بتانا
...شروع کیا کہ ہم تو آپ کی مادی حالت کو سنوار کر مسلمان قوم کو ترقی کی منزلوں پر لے جانا
...چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی دونوں مراکز سے وہابیت کے دو نئے ایڈیشن بھی شائع ہوئے
...جو مستقل فرقوں کی شکل میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر مسلمانوں میں تفریق و تشتت کا باعث
...بنے۔ دونوں مراکز کے ظاہری طور طریقے اگرچہ ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن بہر صورت
...دونوں میں اشتراکِ عمل کا جذبہ موجود تھا۔ مثلاً:

"علی گڑھ اور دیوبند کے اختلافات اصولی تھے اور کسی بغض و عناد یا رشک...

---

[۱] ماہنامہ ... ، مورخ ... ، ص ۲۰۹

حسد پر مبنی نہ تھے ۔ اِس لیے اِن میں تلخی کبھی نہیں آئی ۔ اِس کے علاوہ چونکہ دیوبند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پورا کرتے تھے ، اِس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا جب اِنھوں نے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کیا ۔" [1]

اہلسنت وجماعت کے ناجی گروہ میں سے مسلمانوں کو اغوا کرکے جو فرقے بنائے جاتے تھے اُن کی تعداد یہاں آکر تین ہوگئی تھی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱۔ اہلحدیث ——— بانی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

۲۔ دیوبندی ——— بانی مولوی محمد اسحاق دہلوی

۳۔ نیچری ——— بانی سرسید احمد خاں علی گڑھی

اہلحدیث جماعت کی ترقی تو کسمپرسی کے باعث جامد ہوکر رہ گئی تھی مگر دین سے دلچسپ رکھنے والے بعض مسلمان دیوبندی گروہ کے جال میں پھنستے رہے ، پھر بھی ایک دو مدرسے آ ملک کے عوام پر کیا اثر انداز ہوسکتے تھے ! لیکن جب سے اِن حضرات نے اپنے تبلیغی رضا کو اِس امر پر مامور کر دیا کہ وہ اہلسنت کے عوام کو اغوا کریں اس وقت سے اِس جماعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا ہے ۔ نیچری مذہب خود تو ختم ہوگیا لیکن مرنے سے پہلے وارث چھوڑ گیا :

۱۔ منکرینِ حدیث

۲۔ مرزائی

نیچریت سے بھی زیادہ نقصان ، ملتِ اسلامیہ کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں ندوہ تعلیم نے پہنچایا ، جس کے باعث اکثر پڑھے لکھے صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور بعض تو زہرے ننگِ دین وملت ہی ثابت ہوتے ہیں اور قوم کو ذہنی آوارگی اور پ

---

[1] محمد اکرام شیخ ، موجِ کوثر ، ص ۲۲۹

یت دینے کا یہ سلسلہ ہنوز اُسی طرح جاری ہے۔ نونہالانِ ملّت اِن دونوں چکروں میں
جا رہے تھے اور اُن پڑھ مسلمان بھی، اِن دونوں جماعتوں کی کامیابی کے راستے میں
ے اہلسنت ہی مزاحم تھے لہٰذا اِن حضرات پر قابو پانے کی غرض سے ندوۃ العلماء کا
چایا گیا۔ لیکن کیسی مزیدار ڈپلومیسی کے ذریعے یہ جال پھیلایا، مندرجہ ذیل حوالے کی
ہجھانک کر اُس کا اندازہ کیجیے:

"اِس عمدہ خیال (قیامِ ندوہ) کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے،
مگر اِس کی تکمیل مولوی سید محمد علی کانپوری خلیفۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن
صاحب گنج مرادآبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، جو اِس کے بانی اور
ناظمِ اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحبِ تفسیرِ حقانی نے
اِس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اکابرِ قوم مثلاً سر سید، نواب محسن الملک
اور نواب وقار الملک نے بھی اِس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر
و تقریر کے ذریعے سے اِس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کے کچھ
ابتدائی درجے کھولے گئے اور ۱۸۹۹ء میں رؤساء شاہجہان پور کی فیاضی
سے کچھ زمینداری بطور وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہوئی۔ ایک عظیم الشان
کتب خانہ کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔" [۱]

وہ کون سی ضرورت یا مصلحت تھی جس کے تحت "ندوۃ العلماء" کا قیام عمل میں آیا؟
بارے میں جناب شیخ محمد اکرام ایم۔ اے نے اپنے خیالات کا اِن لفظوں میں اظہار
ہے:

"یہ علم الکلام بالعموم اُن شخصوں نے ترتیب دیا، جو عربی اور فارسی کے
فاضل تھے لیکن عام علماء کی جماعت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا اور بالعموم
علماء نے اُن کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ علماء میں بھی کچھ لوگ ایسے

---

[۱] اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۸۷، ۸۸۔

پیدا ہو گئے جنھیں اِس ضرورت کا احساس ہوا کہ اسلامی مدارس کا نصاب ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے اور قدیم علماء اور علی گڑھ پارٹی کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقہ کار قائم ہو۔ چنانچہ اِسی مقصد کیلئے ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا۔ [1]

ندوہ کے بارے میں دیو بندی جماعت کے حکیم الامت مولوی اشرف علی صاحب تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) نے اپنے تاثرات کا مشاہدے کی روشنی میں اِس طرح اظہار کیا ہے:

"خود ندوہ کا جو حشر ہوا سب کو معلوم ہے کہ وہ ایسوں کے ہاتھ میں مدت تک رہا جن کی طبیعت میں بالکل نیچریت تھی۔ وہی سر سید احمد خاں کے قدم بقدم اُن کی رفتار رہی۔ وہی جذبات، وہی خیالات، کوئی فرق نہ تھا۔" [2]

یہ ندوی حضرات کے عقائد و نظریات کی بات تھی۔ مناسب نظر آتا ہے کہ علی گڑھ اور دیو بند کی خرابیوں کا اظہار کرنے کا بیڑا اٹھانے والے، قوم کے دُکھوں کا علاج کرنے والے، مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل پر پہنچا دینے کا اعلان کرنے والے ندوی علماء زہد و تقویٰ، خلوص و للہیت اور خیر خواہی اسلام و مسلمین کی روحانیت سے لبریز اور سنسنی خیز کہانی مولوی ابو الکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء) کی زبانی پیش کر دی جائے ملاحظہ ہو:

"ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن علماء کی جو حالت منکشف ہوئی کیونکہ منتسبین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسن ظن تھا، اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علماء کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہو گئی۔ مخالفین ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اُن کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۹۰

[2] ملفوظاتِ تھانوی صاحب: الافاضات الیومیہ، جلد ۲، ص ۱۱۰

لیکن جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ
پانچ چھ مہینے تک ان سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اِس لیے
اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک لیڈروں
کی سی کارروائیاں کی جاری ہیں اور وُہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے
جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار
جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔
میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے
مشورہ کیا کہ مجلسِ وعظ میں کیونکر اُن کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر
آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہو گئی۔ اِس کے بعد
واعظ نے جونہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی دُوسرے صاحب نے معاً
کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اِس سے مجلسِ وعظ
میں بڑی رقت ہو گئی اور اِس قدر آہ و بکا ہُوا کہ اِس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اِس
طرح کی بیسیوں باتیں روز میں دیکھتا تھا اور میرے دل میں اِس حلقے کی طرف
سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔"[1]

العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد کس بزرگ نے رکھا تھا، یہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے:

"ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس
سال صوبہ (یو۔پی) کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد
رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لیے پانچ سو روپے
ماہوار امداد ملنی شروع ہوئی۔"[2]

جب ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا، اُس وقت رنگ برنگے

---

[1] آزاد کی کہانی ... ص ۲۱۸

[2] شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص ۱۷۸

حاضرین کا مجمع، ندوہ کے کرتا دھرتا، علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) کی روشن
کو کس طرح مسرور کر رہا تھا، اس کا اندازہ خود علامہ شبلی کے مندرجہ ذیل تحریری بیان سے
بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔
یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گزاری
کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی
درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ
ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب (یعنی انگریز) کے ہاتھ
سے رکھا جا رہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے
نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی،
واعظ، خرقہ پوش اور کج کلاہ سب جمع تھے۔" [1]

جس مقصد کی خاطر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، سعیِ بسیار کے باوجود
مقصد حاصل نہ کیا جا سکا۔ علمائے اہلسنت اِس پُرفریب جال سے دُور ہی رہے۔ بعض
سادہ لوح علماء جو بروقت صحیح اندازہ نہ لگا سکے وہ صورتِ حال کے سامنے آتے ہی مجتنب
ہو گئے۔ شروع میں ندوہ ہر قسم کی بدمذہبی کا معجون مرکب رہا اور نیچریت اِس کا جزوِ اعظم
یہ معجون صلح کلیت کے زہریلے قوام سے تیار کی گئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی
۱۳۷۳ھ/ ۵۳-۱۹۵۴ء) کے آخری دور میں یہ ادارہ "دار العلوم دیوبند" کی ایک شاخ
شمار کیا جانے لگا تھا۔

علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) اپنے آخری ایام میں کچھ دہریت کی
مائل ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں جیسا کہ اُن کی تصنیف "الکلام" کے مطالعہ سے واضح
ہوتا ہے۔ رہی موصوف کی ایجاد کردہ صلح کلیت، تو اس کے بعد گاندھویت کی بلاخیز آ

---

[1] شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص ۱۴۰

...ہمہ گیر بن کر چڑھی تھی کہ اِس کے عظیم نقصانات کے سامنے صدِ کلیت کے بگولے کی
...ہوں کا چرچا بھی عام زبانوں سے اُتر جانا قدرتی امر تھا۔ گاندھویت اور گاندھوی علما کے
...ناموں کی جھلک باب پنجم میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

انگریزوں نے جب برِّ صغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جما لیے اور سارے

...لئے قادیان ملک پر قابض ہو جانے کے اُنھیں امکانات بھی نظر آنے لگے تو اُنھوں نے
اپنے بعض پادریوں کو اِس امر کا جائزہ لینے کی دعوت دی کہ مسلمانانِ ہند کے اندر
...لی طور پر، مستقل اور پائدار انتشار و افتراق کس طریقے سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ
...ری حضرات نے جائزہ لے کر جو رپورٹ پیش کی وہ علامہ خالد محمود سیالکوٹی کے لفظوں
...میں ملاحظہ ہو:

"یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اِس وقت ہم کسی ایسے غدار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلّی نبوّت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اُس کے حلقۂ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے، لیکن مسلمانوں میں اس قسم کے دعویٰ کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اُس کی نبوت کو حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم اِس سے پہلے برِّ صغیر کی تمام حکومتوں کو غدار تلاش کرنے کی حکمتِ عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اُس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی، لیکن اب جبکہ ہم برِّ صغیر کے چپّے چپّے پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔"[1]

---

[1] عبد الرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، ص ۹

اِس رپورٹ کے بعد یا اِس سے بھی پہلے انگریزوں نے یہ منصوبہ ضرور بنایا ہوگا۔ معلوم
ایسا ہوتا ہے کہ "صراط المستقیم" کتاب سیّد احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)
کے دعویٔ نبوت کی تمہید ہی تھی، جس میں وحیٔ باطنی، عصمت، باری تعالیٰ شانہٗ تک صعود
اور اس سے ہمکلامی تک کے دعاوی بھرے پڑے ہیں لیکن دستِ قضا نے اُنھیں
منزلِ مقصود پر پہنچنے کی مُہلت نہ دی۔ اِس کے بعد "تحذیر الناس" کتاب بھی کچھ ایسے ہی
منصوبے کی تکمیل کا ساتھ دیتی ہوئی نظر آ رہی ہے لیکن اِس کے مصنّف مولوی محمد قاسم
نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) بھی اِس بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے یا تعمیر کروانے
سے پہلے ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گئے اور مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) ہی ایسے
نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اِس ناپاک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ مرزا صاحب
مذہبی خیالات و رجحانات کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب کا خیال یہ ہے:

"مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی اور جہاد کے
متعلق وہ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے۔ اسی طرح حضرت عیسٰی کے
متعلق اُنھوں نے بیشتر سرسیّد کے خیالات کی پیروی کی لیکن باوجودیکہ اُن
کی تعلیمات میں کئی باتیں نو معتزلہ خیالات سے قریب تھیں، وہ اکثر اصولی
باتوں میں قدامت پسند تھے اور عام مسلمانوں سے اُن کے معتقدین بالخصوص
قادیانی گروہ کا اختلاف بیشتر مرزا صاحب کے اپنے دعاوی کے متعلق ہے۔
اُنھوں نے مسیحِ موعود، مہدیٔ منتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعویٰ کیا اور
یہ ایسے دعوے ہیں، جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعویٰ کر کے
اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے اُنھوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا ہے
بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔"[۱]

مرزا غلام احمد قادیانی، جہاں سرسیّد احمد خاں اور اُن کے دستِ راست مولوی

---

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۰۸

علی صاحب کے متبع یا ہم خیال تھے وہاں انھیں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/
۱۹ء) سے بھی بڑی عقیدت تھی، چنانچہ دیوبندی عالم مولوی عبدالرشید ارشد نے اِس
لے میں یُوں وضاحت کی ہے:

> "مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور اُن کا
> اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا، اُس وقت اُن کو حضرت امام ربانی (یعنی گنگوہی
> صاحب) سے عقیدت تھی۔ اُس طرف جانے والوں کو پُوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا
> اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔
> اُسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یُوں فرمایا تھا کہ "کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے
> مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے"۔[1]

بہر حال یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں جنھیں ہمارے جیسے نا اہل افراد سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مرزا صاحب
و مولوی رشید احمد گنگوہی سے عقیدت کیوں ہوئی؟ گنگوہی صاحب نے مرزا صاحب کو مردِ صالح
کیوں قرار دیا تھا اور اُن کے کاموں کو کس بنا پر سراہا جا رہا تھا؟ نہیں معلوم کہ موصوف کو
زا صاحب کے پہلے پیر رہتے اور پیر کی ضرورت ہونے کا کس طرح علم ہوا، یا خود اُن کے پیر
بننے کا شرف حاصل کرنے کے خواہشمند تھے؟ ہم یہ عقدہ بھی حل کرنے سے عاجز ہیں کہ اِدھر
گنگوہی صاحب اپنی روحانیت سے قادیان کے ایک فرد کی گمراہی کا احتمال بھی دیکھ لیا کرتے
تھے لیکن دُوسری طرف انھیں وہ لوگ بھی نظر نہیں آتے تھے جو گنگوہ، انبیٹھ، سہارن پور
اور دیوبند میں بیٹھ کر باری تعالیٰ شانہٗ کو جھوٹا بتاتے رہتے تھے۔ اِس راز کو دیوبندی حضرات
یقیناً سمجھتے ہوں گے۔

پروفیسر ابو زہرہ مصری نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف یُوں کروایا ہے:

> "انگریز جو مغربی تہذیب و ثقافت کو دیارِ ہند میں لائے تھے، مغربی تہذیب کے
> دلدادہ مسلمانوں سے بڑا لگاؤ رکھتے، انھیں تقرب بارگاہ سے مشرف کرتے

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۲۳

اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازتے تھے۔ اس قسم کے مسلمان حاکم اُن دیار میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہی وجوہات تھے جن کی بنا پر سرزمینِ ہند گمراہ فرقوں کی قرارگاہ بن گئی۔ غالباً قلتِ تعداد کے علی الرغم اُن فرقوں میں زیادہ نمایاں، قوی تر اور ترقی یافتہ قادیانی گروہ تھا۔ قادیانی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کے بانی و مؤسس مرزا غلام احمد قادیانی تھے، جن کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُن کی نسبت قادیان کی طرف ہے جو ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مرزا غلام احمد وہاں مدفون ہیں۔ اُن کی قبر پر "مرزا غلام احمد موعود" کے الفاظ مرقوم ہیں۔ موعود سے مراد یہ ہے کہ مرزا صاحب وہی مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا تھا کہ وہ آکر شریعت کی احیاء و تجدید کریں گے۔"[1]

مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات کے بارے میں مذکورہ مصری فاضل کی رائے قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں:

"حق بات یہ ہے کہ آپ کا قریبی تعلق ائمۂ شیعہ سے ہے۔ شیعہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے ائمہ معصوم و ملہم ہیں اور اُن کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے تاہم وہ یہ نہیں کہتے کہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے یا وہ خدا سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتے ہیں۔ بہرحال مرزا صاحب کی تعلیمات کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔"[2]

قارئین کرام! جن حضرات کے ذریعہ برٹش گورنمنٹ نے تخریبِ دین اور افتراق بین المسلمین کے منصوبہ کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا، اُن میں سے بعض حضرات کا گزشتہ سطور میں مختصر تذکرہ کر دیا ہے۔ یہی تھے وہ حضرات جنھیں پُراسرار طریقے پر، پروپیگنڈا مشینری کے ذریعے

---

[1] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۳۰۵

[2] ایضاً، ص ۳۱۵

ے برطانوی دور میں مسلمانوں کے رہنما منوایا جاتا رہا اور آج تک انگریزوں کی اُسی سنّت
ال سعادت مندی سمجھ کر عمل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت تو ہر چشم بینا کے سامنے واضح ہے لیکن
ت کی ستم ظریفی نے اُلٹی گنگا بہائی ہوئی ہے یعنی: ؎

راہزن خضرِ رہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے، دیکھتے دیکھتے
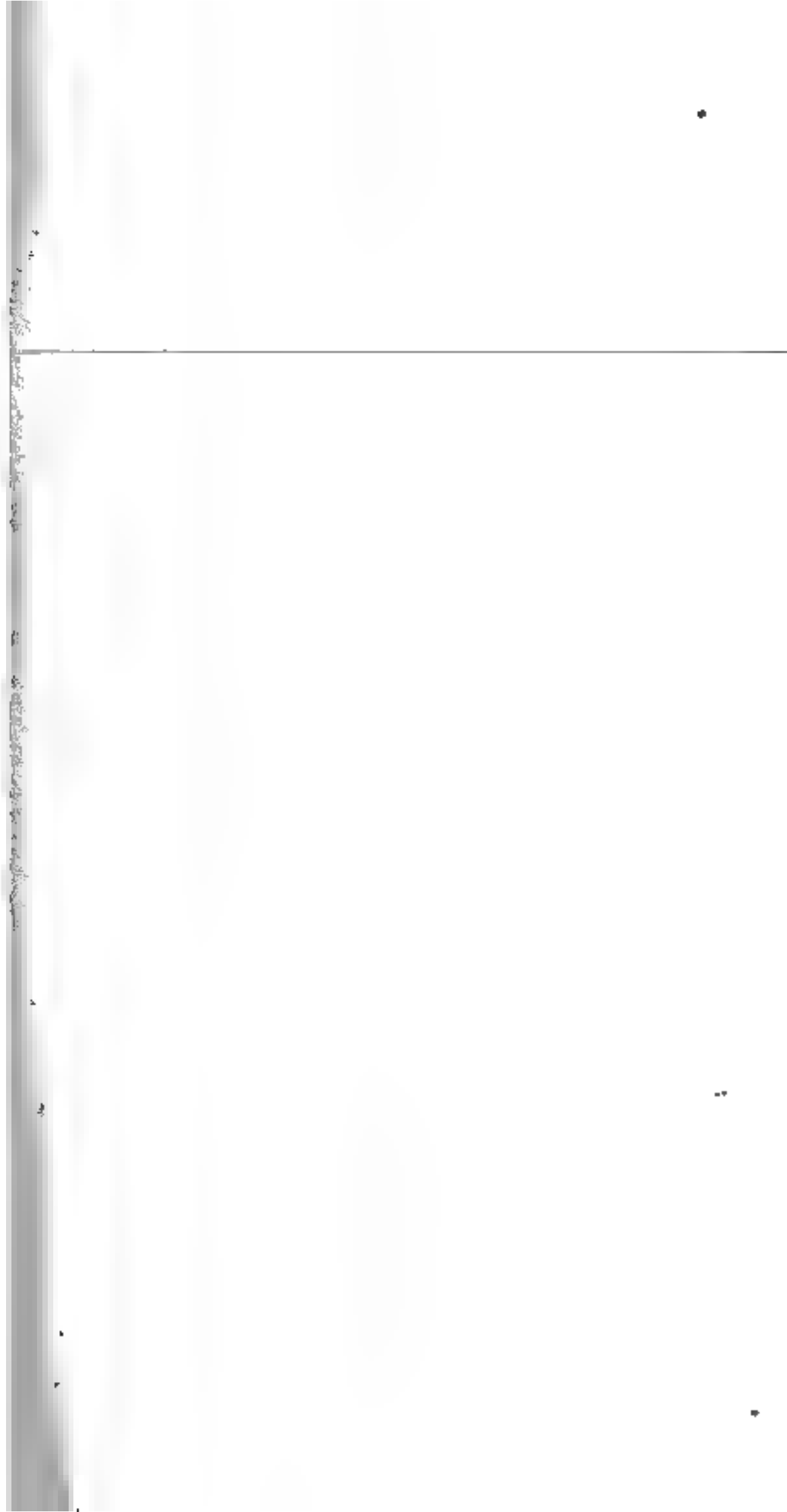
باب سوم

اعلانِ حق

غلامم جز رضائے تو نجویم
جز آں راہے کہ فرمودی نپویم
ولیکن گر بایں نادان بگوئی
خرے را اسپ تازی گو نگویم

(علامہ اقبال)

فرقہ سازی

قارئین کرام! گزشتہ باب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ برٹش گورنمنٹ نے انتہائی
ری کے ساتھ کن کن علماء کے ذریعے سچے اسلام کو بدلنے اور مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر
نان کرنے کا کام لیا۔ کہاں کہاں اُن کے مراکز قائم کیے۔ حکومت اور اُس کے کارندے
منصوبے میں یہاں تک کامیاب ہوتے کہ اہلسنت میں سے جن لوگوں کو غدار کے مختلف
ں علیحدہ علیحدہ قائم کرلیں، اُن جماعتوں کو کافروں اور مشرکوں سے مقابلہ کرنے کی تو آج تک
نصیب نہیں ہوئی لیکن اُن کے نمائندے اور کارندے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے
ل برسرِ پیکار چلے آتے ہیں، جو برطانوی منصوبے کی منزلِ مقصود تھی۔ مسلمانوں کی سابقہ
ت سے علیحدہ گروں تو کتنی ہی ٹولیاں بنائی گئیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں آج اُن میں سے
قابلِ ذکر اور مستقل فرقے موجود ہیں، جو مذکورہ برطانوی منصوبے پر اب بھی آٹو میٹک
ین کی طرح سرگرم عمل ہیں۔ وہ سارے جدید فرقے یہ ہیں:

اہلحدیث فرقہ اس گروہ کے بانی بلکہ برصغیر پاک و ہند میں جتنے بھی فرقے برٹش گورنمنٹ کے منحوس دور میں پیدا ہوئے اُن سب کے مورثِ اعلیٰ
محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) ہیں۔ سب جماعتوں کا سلسلۂ نسب
آکر یہی ملتا ہے جبکہ موصوف کی اصل جماعت وہی تھی جو آج فرقہ اہلحدیث کے نام سے
ف ہے۔ شروع ایام میں یہ فرقہ "محمدی گروہ" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ جب مسلمانانِ
ت و جماعت نے کہنا شروع کر دیا کہ واقعی یہ محمدی ہیں کیونکہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے
رو ہیں۔ اس نشان دہی سے بچنے کی خاطر ان حضرات نے اپنا سابقہ لیبل ہٹا کر خود کو
ہنا شروع کر دیا۔ علمائے اہلسنت کہنے لگے کہ یہ حضرات چونکہ عقیدۂ رسالت کے ایسے
قائل ہیں جو انکارِ رسالت سے چنداں مختلف نہیں، لہٰذا منکرِ رسالت ہونے کی صورت
یہودی کی طرح نرے موحد ہی تو رہ گئے، اگرچہ اِن کا عقیدۂ توحید بھی خانہ ساز یا خواسج مولانا

آخر اس لیبل سے بھی یہ فرقہ بدکنے اور کترانے لگا۔ ان حالات میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے
اس جماعت کا نام اپنی مہربان سرکار سے اہلحدیث منظور کروایا، سرکاری کاغذات میں لکھوا
اور ملک کے ہر گوشے میں برٹش گورنمنٹ نے یہ حکم پہنچایا کہ آئندہ اس جماعت کو اہلحدیث کے
سے موسوم کیا جائے۔ چند سال محمدی اور موحد کہلانے کے بعد ۱۸۸۸ء سے یہ فرقہ اہلحدیث کے
نام سے موسوم چلا آرہا ہے۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت اور
صراط المستقیم کتاب سے رفض پھیلایا تھا۔ اہلحدیث حضرات نے موصوف کے رفض کو چھوڑ کر ان کی
خارجیت و ظاہریت کو اپنے دین کی بنیاد بنا رکھا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر دیکھا جائے
تو یہ حضرات اب محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بالکل نزدیک اور رفض چھوڑنے کے باعث مولوی
محمد اسمٰعیل دہلوی سے کافی دور ہو چکے ہیں۔

۲۔ دیوبندی فرقہ

یہ فرقہ بھی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا متبع اور موصوف کا عاشق زار ہے۔
اس فرقے کے جماعت اہلحدیث سے جدا ہونے کی وجہ اور علیحدہ
تشخص کی ضرورت ان کی مخصوص ذہنیت اور سابقہ جماعت کی ناکامی سے سبق حاصل کرنا ہے۔
اس جماعت کا سنگِ بنیاد مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) نے رکھا
اس گاڑی کو باقاعدگی سے چلانے کی غرض سے علماء کی کھیپ مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی
۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) نے دہلی کالج میں تیار کی۔ جب مدرسہ دیوبند قائم ہو گیا، اسے مرکز
قرار دے کر علیحدہ جماعت کی تشکیل ہونے لگی تو اس نوزائیدہ گروہ کے مولوی رشید احمد
گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) اور مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ
۱۸۷۹ء) سرگروہ قرار پائے۔ وہابیوں کا یہ ٹولہ خود کو سُنّی حنفی ظاہر کر کے انتہائی دلفریب
انداز میں بھولے بھالے اور حقیقتِ حال سے بے خبر سُنّیوں کو رات دن اغوا کرنے میں مصروف
ہے۔ یہ گروہ اس لحاظ سے وہابیوں کی جملہ جماعتوں سے خطرناک ہے کہ ان کے دو رُخی پن کا
عوام تو اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ علاوہ بریں اس جماعت کے لگے بندھے تبلیغی رضاکار اس دور
تالیفِ قلوب اور دلفریبی کے ساز و سامان سے مسلح ہو کر سُنّیوں کو اغوا کرنے اور اپنی
جماعت میں ملانے کی خاطر نکلتے اور ملک کے کونے کونے میں پھیلتے ہیں کہ اس ہم اسرار جا

بد نصیب مسلمان ہی بچتے ہیں ورنہ کتنے ہی اس ظاہری دلفریبی سے دھوکا کھا کر خود اس
جال میں پھنسنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

نیچری فرقہ یہ بھی محمدی گروہ کی ایک شاخ اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے معتقدین
و متبعین کا ایک مخصوص ٹولہ ہے۔ اس کا سنگ بنیاد سر سید احمد خاں
دہلوی نے رکھا تھا۔ اس کا مرکز علی گڑھ کالج قرار پایا۔ موصوف کے معاونین میں آغا خاں،
الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سمیع اللہ خاں دہلوی وغیرہ حضرات تھے۔
مذہبی معاملات میں ان کے مشن کو مولوی چراغ علی (المتوفی ۱۸۹۵ء)، رائٹ آنریبل
سید امیر علی چنسوری (المتوفی) ، وقار الملک (نواب مشتاق حسین)، محسن الملک
سید مہدی علی خاں) اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے پروان چڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت
بلکہ ہر وقت نیا مذہب گھڑنے اور مقدس اسلام کو ذبح کرنے میں مصروف رہے۔
جب عبداللہ چکڑالوی، مولوی محمد اسلم جیراجپوری اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے
دور میں نیچری مذہب پہنچا تو اس نے چکڑالویت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ فرقہ عقیدۂ رسالت
اور سنت مطہرہ کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ قرآنی تعلیمات کے علمبردار ہونے کا مدعی لیکن
کلام الٰہی کے خلاف پُراسرار سازش ہے۔ دعویٰ مسلمان ہونے کا ہے لیکن ان کے نظریات
اسلامی تعلیمات کو مسخ کرتے ہیں۔ آج کل اس فرقے کے سربراہ، پروفیسر غلام احمد پرویز ہیں۔
جنہوں نے چکڑالویت میں کمیونزم اور سوشلزم کو بھی شامل کر کے ایک طلسمی معجون تیار کی
ہے جو پرویزیت کے نام سے متعارف اور ۲۵ بی گلبرگ لاہور سے دستیاب ہے۔

مرزائی فرقہ اس فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۳۲۶ھ/
۱۹۰۸ء) ہیں۔ موصوف نے دعویٰ نبوت کر کے اپنے متبعین کے
اسلام میں رہتے یا مسلمان کہلاتے جانے کا سوال ہی ختم کر دیا۔ مرزا صاحب شروع
میں نیچریت کی طرف مائل تھے۔ دیوبندیت سے کسی قدر پیار اور مولوی رشید احمد گنگوہی
(المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے بھی در پردہ عاشق زار تھے۔ شیعہ حضرات کی صحبت،
... کے مطالعہ اور گورنمنٹ کی حوصلہ افزائی سے نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے، جس کی جسارت

سمو بی مسلمان کہلانے والا ہرگز ہرگز نہیں کرسکتا۔ موصوف کی جماعت بھی دو گروہوں میں بٹ گئی ہے: (۱) قادیانی (۲) احمدی لاہوری

قادیانی حضرات مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور لاہوری پارٹی والے موصوف کے جھوٹی نبوت کی تاویلیں کر کے انھیں چودھویں صدی کا مجدد قرار دیتے ہیں۔ نبی اکرم اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھا جائے تو آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے حضرات کو سرور کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نبی، مجدد یا محض ایک مسلمان بھی نہیں بلکہ دجال ٹھہرایا ہے اور ایسے دجاجلہ کی فہرست کا اعلان فرماتے ہوئے اُن کی تعداد تیس بتائی ہوئی ہے۔ چونکہ قادیانی اور لاہوری مرزائی خود کو مسلمان ہی کہتے ہیں، لہٰذا ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ شانہٗ ان حضرات کو مسلمان ہی بنا دے اور ہمیں اسلام پر قائم رکھے۔ آمین

مذکورہ چاروں فرقوں کے علاوہ، جو برٹش گورنمنٹ کے منحوس دور کی زندہ یادگار ہیں، اور بھی چند فرقوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جن کا یہاں ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں:

۵۔ صلح کلیت ودہریت

جب دیوبند اور علی گڑھ کے مراکز قائم ہوئے تو ایک بالکل دینی اور دوسرا سراسر دنیاوی معلوم ہوتا تھا لہٰذا بعض حضرات کی رائے ہوئی کہ ایک ان کے مابین راستہ قائم کیا جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) اس کے کرتا دھرتا تھے۔ موصوف نے اپنی مخصوص ذہنیت وخیالات کے تحت ندوے سے تین فائدے حاصل کرنا چاہے:

۱۔ علمائے اہلسنت کو برٹش گورنمنٹ کے جال میں پھنسانا۔

۲۔ صلح کلیت کی تبلیغ کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے، خواہ وہ خدا کا انکار کرے یا رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ صحابۂ کرام کو گالیاں دے یا نبوت کا دعویٰ کرے، قرآن و سنت کا منکر ہو یا عقائد اسلامیہ سے منحرف، کسی حالت اور کسی صورت میں اس کے

مسلمان ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا۔

۔ وہابیت کا پرچار

لڈر کر نظریہ چونکہ دیوبندی حضرات نے ٹھکرا دیا تھا لہٰذا علی گڑھی حضرات بھی دب گئے۔ علمائے
ت کو اِس جال میں پھنسانے کی اسکیم بھی ناکام رہی، لہٰذا باقی رہ گئی صرف صبغ کلیت'
تحریکِ خلافت نے اپنا امتیازی علَم بنا کر گاندھی صاحب کی چوٹی پر بصد عقیدت لہرا دیا۔
یہ علَم بھی دیوبندی حضرات کے ہاتھوں میں آگیا تو علامہ سلیمان ندوی کے دور سے ندوۃ العلما
یوبندی ادارہ ہو کر ہی رہ گیا۔ ندویوں نے رنگ تو بہت سے بدلے لیکن خدا کا شکر ہے
ئی نیا فرقہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

خاکسار پارٹی

اِس فرقے کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) تھے۔ یہ فرقہ اِس صدی کے اوائل میں آندھی کی طرح
ا لیکن نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ اِس جماعت کا نام تو
ہے لیکن وجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے برائے نام ہی رہ گیا۔

جماعتِ اسلامی

اِس گروہ کے بانی مبانی جناب ابو الاعلیٰ مودودی ہیں۔ یہ جماعت
دینی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور مولوی
سمٰعیل دہلوی کے سیاسی عزائم اِس جماعت کی منزلِ مقصود ہے۔ دینی لحاظ سے بھی
رقے کا ذہن مخصوص ہے جو اہلحدیث اور دیوبندی حضرات میں سے کسی کے ساتھ
اتفاق اور مطابقت نہیں رکھتا۔ چونکہ اِس جماعت کا سیاسی اور مذہبی مزاج مودودی
ب کی ذات کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے، دریں حالات امید یہی ہے کہ اِس فرقے
بھی خاکسار پارٹی سے چنداں مختلف نہیں ہوگا۔ اگر مودودی صاحب کے بعد یہ
باقی رہی بھی تو محض ایک سیاسی جماعت کے طور پہ باقی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب
مذکورہ فرقوں کی اصل وہابیت اور اُس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے، متحدہ ہندوستان
یں کی نشر و اشاعت کرنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)
س باب کے اندر ہم نے اسی امر کی وضاحت پیش کرنی ہے کہ دہلوی صاحب موصوف

اور دیگر فرقوں کے بانیوں نے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر عمل جرا
کی مشقیں کر کے، اِن کے نزدیک دین میں خدا اور اُس کے آخری رسول سے جو غلطیا
ہو گئی تھیں اُن کی اصلاح کر کے، جو نئے نئے اسلام گھڑے تھے وہ تعلیمات و نظریات
کیا ہیں جو محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین سے متصادم اور سنّۃ اسلام کے سر
منافی ہیں۔ وباللہ التوفیق وبہ الوصول الی ذری التحقیق اللّٰھم ارنا الحق
حقا والباطل باطلا والحقنا بالصالحین آمین یا ارحم الراحمین
بحق سید المرسلین وصلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد وعلی آلہ وصحبہ
اجمعین الی یوم الدین۔

رئیس المبتدعین مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تخریب کاری

جیسا کہ قبل ازیں وضاحت کی جا چکی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں فرقہ بازی کا سنگ
مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے رکھا۔ موصوف نے اپنی رسو
اور ایمان سوز کتاب تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت کی تبلیغ کی۔ اس کے ساتھ ہی دا
ظاہری کے انکارِ تقلید اور معتزلہ کے مرداریہ فرقے سے امکانِ کذب کا عقیدہ لے کر
تقویۃ الایمان میں اکٹھا کیا گویا تقویۃ الایمان کی اصل بنیاد تو محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کتاب
پر رکھی گئی لیکن اُس میں ظاہری المذہب اور اعتزال کی قباحتوں کے لیے بھی پوری پوری گنجا
رکھی گئی۔ دوسری طرف "صراط المستقیم" کتاب کے ذریعے "رفض" کی بھی کھل کر اشاعت
شیعہ حضرات جو اپنے ائمہ کی شان بیان کیا کرتے ہیں، اُنھیں صاحبِ وحی و عصمت اور ا
کرام سے بھی افضل بتاتے ہیں، موصوف نے یہ تمام صفات اپنے پیر جی میں بتا دیں بلکہ ا
اتنا بڑھایا چڑھایا کہ اگرچہ دعویٰ نہیں کیا مگر ہر قدم پر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
بھی افضل و اعلیٰ ہی منوانے کی کوشش کی۔ یہ امر "صراط المستقیم" کتاب سے کھلی وضع
اس کا روشن بیان عنقریب آنے والا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ موصوف کے کارہائے نما
کے چند اہم گوشے ملاحظہ ہوں:

بِ تقلید

انکارِ تقلید کی طرف مولوی محمد اسمٰعیل کیوں راغب ہوئے جبکہ اُن کے پیشوا
نجدی وہابی بھی تقلید کے منکر نہیں بلکہ حنبلی ہونے کے مدعی تھے۔ حقیقت
و تقلیدِ ائمہ دین ہی ایک ایسی چیز ہے جو مسلمانوں میں فرقہ بازی اور دین میں فتنہ و فساد
نے والوں کے راستے میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہو جاتی تھی۔ حکومت نے محسوس کیا
یپ کاروں کے راستے کی اس رکاوٹ کا سب سے پہلے دُور ہونا از بس ضروری ہے
ون کے بعد جس پر بھی محقق، مصلح، ریفارمر اور شمس العلماء کا لیبل لگا کر کھڑا کیا جائے،
نہ سے انکارِ تقلید کی بدولت رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے، بہت سے مسلمان اُن کے
ل جائیں گے۔ چونکہ ہر مصلح و ریفارمر کی تعلیم جُدا ہو گی لہٰذا جتنے ریفارمر کھڑے کیے
ے گے اُتنے ہی فرقے بآسانی بن سکیں گے۔ اِس برطانوی منصوبے کے تحت موصوف
سلمانوں کا رشتہ اکابر سے منقطع کرنے اور فرقہ سازی کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض
قلید کو شرک اور گیارہ سو سال مسلمانوں اور اُمتِ محمدیہ کو مشرک و جہنمی ٹھہراتے ہوئے صاف
مشرک کہہ دیا اور اپنے خاندانی اکابر کو بھی دوزخ سے بچانے کی پرواہ کرتے ہوئے

یا:

لیت شعری کیف یجوز التزام	لیتی میں کیسے جانوں کہ ایک شخص کی تقلید
تقلید شخص معین مع تمکن الرجوع	کرتے رہنا کیونکر حلال ہو گا جبکہ اپنے
الی الروایات المنقولۃ عن النبی	امام کے مذہب کے خلاف صریح حدیثیں
صلی اللہ علیہ وسلم الصریحۃ الدالۃ	پا سکے۔ اس پر بھی امام کا قول چھوڑے
علی خلاف قول الامام فان لم یترک	تو اس میں شرک کا میل ہے۔
قول الامام ففیہ شائبۃ من الشرک[۱]	(نعوذ باللہ من ذلک)

کہنے کے ساتھ موصوف نے مقلدین کو زانی جرأت مندی سے نصرانی بھی ٹھہرایا ہے۔
لکھتے ہیں:

---

۱ اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تنویر العینین، ص ۲۷

باتباع شخص معین بحیث یتمسک بقوله وان ثبت علی خلافه دلائل من السنة والکتاب ویأول الی قوله شوب من النصرانیة وحظ من الشرک والعجب من القوم لا یخافون من مثل هذا الاتباع بل یخوفون تارکه ۔[1]

یعنی ایک امام کی پیروی کہ اُس کی بات کی سند پکڑے اگرچہ اُس کے خلاف کتاب وسنت سے ثابت ہو اور اُنھیں (آیات واحادیث کو) اُسی قول کی طرف پھیرے۔ یہ نصرانی ہونے کا میل اور شرک کا حصّہ ہے اور تعجب ہے کہ وہ لوگ خود تو اِس تقلید سے ڈرتے نہیں بلکہ اِس کے چھوڑنے والے کو ڈراتے ہیں۔

ائمّہ مجتہدین واکابر اسلاف سے مسلمانوں کو رشتۂ تعلق منقطع کرنے کی موصوف کنایۃً تلقین کرتے ہوئے تقلید کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے،

"اِس زمانہ میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں۔ کتنے پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں۔ کتنے قصّے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کتنے مولویوں کی باتوں کو جو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں اور کوئی اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں۔ اِن سب سے بہتر راہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے کلام کو اصل رکھیے، اُس کی سند پکڑیے۔"[2]

یہ بالکل بجا کہ اللہ ورسول کا کلام اصل ہے، سند بھی اُسی کی پکڑنی چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ اللہ ورسول کے کلام کو سند کون پکڑے؟ عالم یا جاہل؟ جاہل تو اللہ و رسول کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یقیناً وہ علمائے کرام کی طرف ہی رجوع کرے یا تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے تو بزرگوں کی آسان تصنیف سے دین سمجھنے کی کوشش کرے

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی : تنویر العینین

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۴،۲۵

بزرگوں کی تصانیف سے جن پر اُمتِ محمدیہ کا اعتماد رہا ہے لیکن دہلوی صاحب (ماننے میں
واہ تم قرآن و حدیث کا ایک لفظ نہیں جانتے، اس زبان سے مطلقاً ناواقف ہو لیکن پہلے
بزوں کی باتیں مت مانو، وُہ تو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکال کر گھڑی کر دی تھیں
ے قرآن و حدیث کی سند پکڑو۔ لیکن یہ نکتہ نہیں سمجھایا کہ وہ ناواقف کس طرح قرآن و حدیث
سند پکڑیں؟ نیز جب پہلے بزرگ اور مولوی سب ناقابلِ یقین ہیں تو خود یہ حضرت ناصح کیسا ا
ہ قابلِ اعتماد بن کر آ گئے تھے اور خود لوگوں کو کیوں تلقین کرنے اور تقویۃ الایمان و دیگر تصانیف
ھنے کی اور اپنی تقریریں سُننے کی تلقین فرمانے لگے تھے؟ کیا موصوف کے ارشادات کا تا
اب و سنّت ہے؟

عوام الناس کو اکابر سلف سے رشتہ منقطع کرنے کا درس دینے اور براہِ راست قرآن
یث سے استفادہ کرنے کی تلقین فرما تو دی لیکن کھٹکا ہُوا کہ کہاں متحدہ ہندوستان کے
لمان اور کہاں قرآن و حدیث کی تعلیمات۔ یہ بیچارے تو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے
یہ وہ عرض کریں گے کہ حضرت! ہم قرآن و حدیث سے براہِ راست کس طرح ہدایت حاصل
ریں، جب اسلاف کی تعلیمات پر کان ہی نہیں دھرنا تو موجودہ علماء میں ہی کون سے سرخاب کے
لگے ہُوئے ہیں کہ یہ اپنے ذہن کی تیزی سے باتیں نہ نکالیں گے یا خدا نے ان کے ماتھے پر
ھ دیا ہے کہ یہ ضرور کتاب و سنّت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ لہٰذا گزشتہ و موجودہ علماء کو چھوڑ
ب سے منہ موڑا۔ لیکن ہم تو قرآن و حدیث میں الف کے نام ب نہیں جانتے۔ اب بتایئے
ہن کیسے حاصل کریں، موصوف اِسی خدشے کے پیشِ نظر یُوں تلقین کرتے ہیں:

"یہ جو عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ و رسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے،
اِس کو بڑا علم چاہیے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں کہ اُن کا کلام سمجھیں۔ اُس راہ
پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے، ہماری کیا طاقت کہ اس کے موافق چلیں،
بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں جن پہ چلے جاتے ہیں۔ سو یہ بات بہت
غلط ہے۔ اِس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں
بہت صاف و صریح ہیں، ان کا سمجھنا مشکل نہیں۔"[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۶

ناخواندہ مسلمانوں کے سوال کا موصوف کے پ [illegible] دوں تھا لیکن چونکہ اُنھیں
سیدھے راستے پر لگانا مقصود تھا لہٰذا حوصلہ دینا پڑا کہ چاہے ایک لفظ بھی پتہ نہ چلے لیکن بات
قرآن و حدیث سے کرو۔ یہ خطرہ نزدیک بھی نہ آنے دو کہ ہم بے علم ہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ قرآن
و حدیث کو سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہی کب ہے ؟ اور قرآن و حدیث کے سمجھنے میں اُلجھن
ہی کہاں ہے جو تم ڈرتے پھر رہے ہو ؟ اللہ کا نام لے کر خود کو مفسر اور محدث سمجھنا شروع کر دو
آگے یوں تسلی دے دی ہے :

"اللہ و رسول کا کلام سمجھنے کو بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کے راہ بتانے
کو، جاہلوں کے سمجھانے کو اور بے علموں کے علم سکھانے کو آئے تھے۔"[1]

آگے سورۂ جمعہ کی آیت ۲ پیش کر کے، قرآنی تحریف کے مرتکب ہو کر یوں ایمانی حکم سُنا دیا :

"جو کوئی یہ آیت سُن کر پھر یوں کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے
کوئی نہیں سمجھ سکتا اور اُن کی راہ پہ سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا،
سو اُس نے اِس آیت کا انکار کیا اور اِس نعمت کی قدر نہ سمجھی۔"[2]

ہمیں اپنی اِس کوتاہ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کیونکہ
باوجود سعیٔ بسیار کے یہ معلوم کرنے سے ہم آج تک قاصر رہے کہ دہلوی صاحب موصوف کی
اصطلاح میں عالم اور بزرگ کی تعریف کیا ہے ؟ آخر یہ منکرِ قرآن ہونے کا حکم کس دلیل سے ہے ؟
ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ مذکورہ آیت میں جس حقیقت کا واضح ثبوت ہے اُسی کی ضد پہ دہلوی
صاحب اسے دلیل بنا لائے ہیں۔ یعنی آیۂ کریمہ میں تین امور کا تذکرہ ہے کہ نبی آخر الزماں
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشاغل یہ ہیں :

۱۔ لوگوں پہ قرآن پڑھنا
۲۔ انسانوں کا تزکیۂ نفوس کر کے اُنھیں پاک کر دینا۔
۳۔ اُنھیں کتاب و حکمت سکھانا۔

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۶
[2] ایضاً : ص ۲۷

آپ کے بعد یہ فرائض علمائے کرام و اولیائے عظام کے سپرد ہیں۔ لوگوں کو قرآن کریم نے ترغیب دی ہے کہ وہ کتاب و حکمت سیکھنے کے لیے علمائے کرام کی طرف اور تزکیۂ نفوس کے لیے اولیائے عظام سے رجوع کریں۔ چنانچہ حکم خداوندی ہے:

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ ۱؎	جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اہل علم (علماء) سے دریافت کرو۔

دوسرے مقام پر بزرگانِ دین کے اتباع کے بارے میں یوں واشگاف لفظوں میں فرما دیا ہے:

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔ ۲؎	اس کا اتباع کرو جو میری طرف رجوع لایا۔

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت باری تعالیٰ شانہ کے حریف بن کر کھڑے ہو گئے کہ جو مسلمانوں کو علمائے کرام اور اولیائے عظام کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے تو موصوف اس کے احکام کو قرآن کے خلاف اور انکارِ آیاتِ الٰہیہ بتا کر علماء و اولیاء سے کنارہ کش ہو کر خود قرآن و حدیث کو سمجھنے کی تلقین فرماتے ہیں حالانکہ جب تک علمائے کرام کی طرف رجوع نہ کیا جائے قرآن و حدیث کا ایک لفظ بھی کوئی جان نہیں سکتا۔ دہلوی صاحب کی اس تلقین سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ انکارِ تقلید کی وجہ سے فرقہ بازی و فتنہ پردازی کا دروازہ کھل گیا۔

۲۔ قرآن و حدیث کے علوم حاصل کرنے کی غرض سے وہابی حضرات اپنے علماء کی طرف تو رجوع کرتے ہیں لیکن تیرہ صدیوں کے اکابر سے ان حضرات نے اپنا رشتہ حقیقت منقطع کر لیا ہے۔ تعلق کا صرف نام باقی ہے۔

۳۔ تزکیۂ نفس کے لفظ سے یہ لوگ آشنا ہوتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت ان سے

۱؎ سورۃ النحل، آیت ۴۳

۲؎ سورۃ لقمان، آیت ۱۵

عنقا ہو کر رہ گئی ہے۔

۲۔ توہینِ اُلوہیت

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے معتقدین یہی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ جب دنیا شرک کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی تو موصوف نے مسلمانوں کو توحید سے آگاہ کیا اور شرک و کفر سے بچایا۔ لیکن حقیقت اِس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ جب وُہ خارجیت کا عَلَم لے کر کھڑے ہوتے تو باری تعالیٰ شانہٗ کو کس طرح معاف کر سکتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے باری تعالیٰ شانہٗ کو جھوٹا بتانے اور منوانے کی خاطر یُوں اپنی منطق دانی کا اظہار کیا ہے:

"لانسلم کہ کذب مذکور محال بمعنی مسطور باشد چہ عقد قضیۂ غیر مطابقہ للواقع و القائے آں بر ملائکہ و انبیاء خارج از قدرت الٰہیہ نیست و الّا لازم آید کہ قدرت انسانی ازید از قدرتِ ربّانی باشد۔" [1]

اِسی سلسلے میں موصوف نے مزید یُوں کھُل کر وضاحت کی ہوئی ہے:

"عدم کذب را از کمالاتِ حضرت حق سبحانہٗ می شمارند و اُو را جل شانہٗ بآں مدح میکنند برخلاف اخرس و جماد و صفتِ کمال ہمیں است کہ شخصے قدرت بر تکلم بکلامِ کاذب دارد و بنا بر رعایتِ مصلحت و مقتضائے حکمت بتنزہ از شوب کذب تکلم بکلامِ کاذب نماید، ہماں شخص ممدوح می گردد و بخلاف کسے کہ لسانِ اُو ماؤف شدہ یا ہرگاہ ارادۂ تکلم بکلامِ کاذب نماید آواز بند گردد یا کسے دہن اُو را بند نماید، ایں اشخاص نزدِ عقلاء قابلِ مدح نیستند۔ بالجملہ عدم تکلم بکلام کاذب ترفعاً عن عیب الکذب و تنزیہاً عن التلوث بہ از صفاتِ مدح است۔" [2]

اِس مسئلے کے بارے میں چونکہ اِسی مجموعے کے اندر ایک مستقل عنوان کے تحت بحث

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: یک روزہ، مطبوعہ صدیقیہ پریس ملتان، ص ۱۷

[2] ایضاً: ص ۱۷، ۱۸

وجہ ہے لہٰذا یہاں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ ناپاک نظریہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء میں
وٹ سکے اندر دفن ہو گیا تھا لیکن اٹھاونِ سال بعد برٹش گورنمنٹ کے ایما و اشارے سے
۱۳۰۱ھ/۱۸۸۷ء میں گنگوہ سے پھر ظہور پذیر ہوا اور "براہین قاطعہ" جیسی شرمناک کتاب
صفحات پر چہل قدمی کرتا ہوا دکھا گیا۔

موصوف صرف خدا کو جھوٹا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اُسے مجسّم مانتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا
شخص خدا کو زمان و مکان وجہت سے پاک جانتا اُس کی رویت بغیر جہت و محاذات
مانتا تو ایسے شخص کو بدعتِ حقیقیہ کا مرتکب یعنی کافر ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ اِن امور کی
ریح موصوف نے یوں کی ہے:

"تنزیہِ اُو تعالیٰ از زمان و مکان وجہت و اثباتِ رویت بلا جہت و محاذات
..... ہمہ از قبیلِ بدعاتِ حقیقیہ است، اگر صاحب آں اعتقاداتِ مذکورہ
را از جنسِ عقائدِ دینیہ می شمارد" ملخصاً [1]

موف کی اِس تصریح سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ جب مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے نزدیک اللہ تعالیٰ زمان و مکان میں گھرا ہوا ہے تو
اللہ تعالیٰ کے بارے میں وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ کیسے کہا جا سکے گا؟ اِس طرح تو
زمان و مکان کو ہر چیز پر محیط ماننا لازم آتا ہے۔ جن کے احاطے سے خالق بھی باہر
نہ رہا۔

۲۔ اِس صورت میں اللہ اکبر کہنا کس طرح درست قرار پائے گا، جبکہ زمان و مکان
اللہ تعالیٰ پر بھی محیط بنا دیئے اور تسلیم نہ کرنے پر بدعتِ حقیقیہ کا خطرہ سُنا دیا۔

۳۔ وہ جو زمان و مکان میں گھرا ہوا ہے، ثانیاً جس کا دیدار بغیر جہت و محاذات کے نہ
ہو سکے، یقیناً وہ مجسّم قرار پاتا ہے اور ہر مجسّم فانی ہے اور جو فانی ہو وہ الوہیت کے لائق
نہیں۔ اب کیا فرماتے ہیں توحید کا فرضی ڈھول بجا کر مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: ایضاح الحق، مطبوعہ دیو بند، ص ۴۴، ۵۰

علماء، کہ اُن کے امام نے الوہیت کا خاتمہ اور وجود باری تعالیٰ شانہٗ کے انکار کی یہ بنیاد کس خوشی میں رکھی تھی!

دہلوی صاحب موصوف نے اپنی نرالی توحید کی ترنگ میں، باری تعالیٰ شانہٗ کا عالم الغیب ہونا اپنے مخصوص اندازِ فکر سے اِس طرح بیان کیا ہے:

"ظاہر کی چیزوں کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے، جب چاہیں کریں، جب چاہیں نہ کریں۔ سو اسی طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔" [1]

یہ عبارت بالکل آسان اُردو میں ہے۔ ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بخوبی اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ کوئی مشکل یا غیر ملکی زبان کی فلسفیانہ عبارت تو ہے نہیں، جس کا مفہوم و مطلب بآسانی معلوم نہ کیا جا سکے۔ موصوف نے اِس دو سطری عبارت میں کئی قسم کا زہر گھولا ہے لیکن یہاں اظہار کرنا صرف اِس امر کا مقصود ہے کہ اُنھوں نے اپنے اللہ صاحب کی علمی شان کس قسم کی بیان کی ہے۔ اِس عبارت سے جو کچھ ہم سمجھ سکے، وُہ یہ ہے:

۱۔ دہلوی صاحب کے نزدیک اُن کا خالق عَالِمُ الْغَیْبِ نہیں اور نہ اُس کے متعلق وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ہی کہنا درست ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غیب پر اُس کا کنٹرول ہے۔ جب چاہتا ہے کسی خفیہ بات یا جملہ مغیبات سے باخبر ہو جاتا ہے اور جب نہ چاہے تو دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر کے ایک مجذوب کی طرح پڑا رہتا ہے۔

۲۔ موصوف کے نزدیک علمِ الٰہی قدیم اور واجب نہیں۔ اسی لیے تو دریافت کرنا پڑتا ہے

۳۔ اُن کے نزدیک باری تعالیٰ شانہٗ کا جہل ممکن ہے، نہ صرف ممکن بلکہ شانِ الٰہی کا ایک جزو ہے۔ کیونکہ جس بات کو دریافت کرتا ہے، قبل ازیں اُس سے بے خبر ہوگا، اسی لیے تو دریافت کرے گا۔ (نعوذ باللہ من ذالک۔ وما قدروا اللہ حق قدرہ)

۲۔ توہینِ شانِ رسالت

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا محبوب ترین مشغلہ توہین و تنقیصِ شانِ رسالت تھا۔

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۳

ف اِس میدان کے ایسے البیلے شہسوار تھے کہ اگلے پچھلے سارے گستاخوں کے کان کتر لیے
ے اُستادی کا لوہا منوا لیا۔ قرآنِ کریم سامنے رکھ لیجیے۔ انبیائے کرام کی شان میں
ں اور گستاخوں نے جو بیہودہ کلمات استعمال کیے اُنھیں لکھ لیجیے۔ پھر احادیثِ نبوی
رخائر اور کتبِ تواریخ و سیر سے گستاخوں کے سارے نازیبا کلمات نکال کر اسی فہرست
شامل کر لیجیے۔ اب اِس مجموعۂ خرافات کا تقویۃ الایمانی مغلظات سے مقابلہ کیجیے۔ اگر دل میں
ئے کرام کی عظمت و رفعت کا تصور موجود ہے اور کسی بے دین کے پیچھے لگ کر یہ رُوحِ ایمان تا
ج نہیں کی ہے تو ہر منصف مزاج ذی علم اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک
و رسالت میں جتنے گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں، مصنفِ تقویۃ الایمان اُن
ے پر سبقت لے گیا اور موصوف نے اِس میدان کی بین الاقوامی چیمپین شپ جیت لی ہے۔
نازیبا کلمات کے نقل کرنے سے دل دہلتا اور قلم شق ہوتا ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی اور
کفر کفر نباشد کے پیشِ نظر، اہلِ اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے چند عبارتیں کلیجے پر پتھر
ر نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں، وہ لکھتے ہیں،

بمقتضائے ظلمات بعضہا فوق بعض، از
وسوسۂ زنا خیالِ مجامعتِ زوجۂ خود بہتر
است و صرفِ ہمت بسوئے شیخ و امثالِ
آں از معظمین گو جنابِ رسالتمآب باشند،
بچندیں مرتبہ بدتر از استغراق در صورتِ
گاؤ خرِ خود است، کہ خیالِ آں با تعظیم و اجلال
بسویدائے دلِ انسان می چسپد، بخلاف
خیالِ گاؤ و خر کہ نہ آں قدر چسپیدگی می بود و
نہ تعظیم بلکہ مہان و محقر می بود و ایں تعظیم و اجلالِ
غیر کہ در نماز ملحوظ و مقصود می شود بشرک
می کشد۔ ۱؎

بمقتضائے ظُلُمٰتٌ بَعْضُہَا فَوْقَ بَعْضٍ
زنا کے وسوسے سے اپنی بی بی کی مجامعت
کا خیال بہتر ہے اور شیخ یا اُسی جیسے
بزرگوں کی طرف خواہ جنابِ رسالتمآب
ہی ہوں، اپنی ہمت کو لگا دینا، اپنے
بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے
سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ شیخ کا خیال
تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے
دل میں چمٹ جاتا ہے اور بیل اور گدھے
کے خیال کو نہ تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے
اور نہ تعظیم، بلکہ حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور

۱؎ اسمٰعیل دہلوی، مولوی : صراط المستقیم، ص ۹۵

غیر کی تعظیم اور بزرگی جو نماز میں ملحوظ ہو

وہ شرک کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔[1]

مذکورہ بالا عبارت کا مفہوم کتنا ایمان سوز، عبارت کا ہر تیور کتنا کفر بیز و کفر ریز ہے۔

قرآن کریم کو اوّل سے آخر تک پڑھیے، انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے مبارک تذکروں سے بھرا ہوا ہے۔ اُن مقدس ہستیوں کا ذکر اُن کے خالق و مالک نے انتہائی پیارے انداز میں کیا، وہ تذکرے اُمتِ محمدیہ کی ترغیب و تشویق کی خاطر اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل فرمائے، اُن محبت بھرے بیانات، تعظیم و جلال کے اعلانات کا نمازوں میں بھی پڑھنا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ جو اُن بزرگوں کے تذکرے، زبانِ الٰہی میں نمازوں کے اندر نہ پڑھے، اُن کے کمالاتِ عالیہ عین حالتِ نماز میں بیان نہ کرے، اُن کے گُن نہ گائے اُس کی نماز ہرگز نماز ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ہر نماز میں محبوبِ پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں ہدیۂ سلام پیش کرنا ہوتا ہے۔ آپ پر اور آپ کی آل پر جب تک صلوٰۃ و تسلیم کے پھول نچھاور نہ کیے جائیں نماز مکمل نہیں ہوتی۔ یہی وہ مبارک طریقہ ہے جو تیرہ سو سال سے اُمتِ محمدیہ میں جاری تھا اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ امام اہلسنت علیہ الرحمہ نے ایسے حضرات کو یُوں فہمائش کی تھی، ؎

ذکرِ خدا جو اُن سے جدا چاہو نجدیو!

واللہ ذکرِ حق نہیں، کنجی سقر کی ہے

دہلوی صاحب موصوف کے اِس اصطلاحی شرک سے وہ آدمی بچ سکتا ہے جو نمازوں میں قرآن کریم کی تلاوت کے نزدیک بھی نہ جائے۔ نمازوں میں درود پاک پڑھنے، تشہد میں عرضِ سلام کرنے سے پرہیز کرے ورنہ آنجناب کے نزدیک وہ شرک کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف کے اِس اصطلاحی شرک سے مسلمان رہتے ہوئے بچنے کا کون سا راستہ ہے؟

---

[1] صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۲۰۱

یہ اجلال و تعظیم جب نماز میں شرک ٹھہرائی تو دوسری عبادتوں میں یہی شرک جزو ایمان
نہیں بن جائے گا، وہاں جائز کیسے ہو جائے گا؟ کیا خدا کو صرف نماز کی حالت کا شرک ہی
ناپسند اور باقی عبادتوں میں مقبول و پسندیدہ ہے؟ ہرگز نہیں، جو امر نماز میں شرک ہے وہ
اوروں کے درمیان اگر اُس کا ارتکاب کیا گیا تو وہاں بھی شرک ہی ٹھہرے گا۔ پس جس نے
کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے محمد رسول اللہ کہا وہ بھی شرک کے سمندر میں گرا۔ درود پاک کا زیب وظیفہ
بنانے میں شرک کا پھندا اڑا لے گا۔ اذان و اقامت کے وقت بھی یہی ماجرا پیش آئے گا، قرآن
کی تلاوت کرنے بیٹھے تو ہر آیت شرک ساگر میں غوطہ دے گی۔ اِس وہابی شرک سے بچنے
کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ جملہ عبادتوں بلکہ اسلام ہی کو خیرباد کہہ کر، بیک بینی
و دو گوش شہر خموشاں کا مکین ہو جائے (نعوذ باللہ من ذٰلک) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے
باطل نظریات اور گمراہ گروں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین

انبیائے کرام و اولیائے عظام کا تصور لانے، دل میں خیال جانے کے بارے میں موصوف
کا نظریہ پیش کر دیا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن مقدس ہستیوں کے علوم مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی
نظر میں کیا تھے؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "جو کچھ اللہ اپنے بندوں سے معاملہ کرے گا، خواہ دنیا میں، خواہ قبر میں،
> خواہ آخرت میں، سو اُس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، نہ نبی کو، نہ
> ولی کو، نہ اپنا حال، نہ دوسرے کا۔"[1]

دوسرے مقام پر موصوف نے یوں وضاحت کی ہوئی ہے:

> "اسی طرح کچھ اِس بات میں بھی اُن کو بڑائی نہیں ہے کہ اللہ صاحب نے
> غیب دانی اُن کے اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کا احوال جب چاہیں
> معلوم کر لیں، یا جس غائب کا احوال جب چاہیں معلوم کریں کہ وہ جیتا ہے کہ
> مر گیا، یا کس شہر میں ہے، یا کس حال میں، یا جس آئندہ بات کو جب ارادہ کریں

---

1. محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۲

تو دریافت کریں کہ فلانے کے ہاں اولاد ہوگی یا نہ ہوگی، یا اِس سوداگری میں اُس کو فائدہ ہوگا یا نہ ہوگا، یا اِس لڑائی میں فتح پائے گا یا شکست؟ کہ ان باتوں میں بھی بندے بڑے ہوں یا چھوٹے سب یکساں بے خبر ہیں اور نادان ہیں۔[1]

اور جگہ اسی رسوائے عالم کتاب میں اِس طرح تصریح کی گئی ہے:

"کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلانے کے دل میں کیا ہے، یا فلانے کی شادی کب ہوگی، یا فلانے درخت کے کتنے پتے ہیں، یا آسمان میں کتنے تارے ہیں، تو اس کے جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ و رسول ہی جانے، کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟"[2]

منافقین مدینہ نے سرور کون و مکاں، عالم علوم اوّلین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا "مَا يُدْرِيهِ بِالْغَيْبِ" موصوف نے اُن دشمنانِ دین و ایمان کے ساتھ پورے طور پر موافقت کرتے ہوئے، اُن کا وہی نازیبا فقرہ اپنی زبان میں یوں دہرا دیا "غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟" نیز اولیائے کرام و انبیاء علیہم السلام دنیا و آخرت میں اپنے اور دوسروں کے حال سے بے خبر بتادیا، جرأت و جسارت کی حد کرتے ہوئے نادان تک لکھ دیا (نعوذ باللہ منہا)، رسول دشمنی کا رنگ اور چڑھا تو درختوں کے پتے اور آسمان کے تارے بھی غیب ہو کر رہ گئے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ رسول کسی درخت کے پتوں کی گنتی جانتے ہیں تو دہلوی صاحب کے نزدیک اُس شخص نے رسول کو خدا بنا دیا۔ موصوف نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علوم غیبیہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

"کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۵

[2] ایضاً: ص ۱۰۷، ۱۰۸

کی بات معلوم کرلیں، بلکہ اللہ صاحب اپنے ارادہ سے کبھی کسی کو جتنی بات چاہتا ہے خبر کر دیتا ہے۔ سو یہ اپنے ارادہ کے موافق، نہ اُن کی خواہش پر۔ چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بارہا ایسا اتفاق ہُوا ہے کہ بعضی بات دریافت کرنے کی خواہش ہُوئی اور وُہ بات معلوم نہ ہُوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہُوا تو ایک آن میں بتا دی۔"[۱]

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام غیب سے قطعاً بے خبر بتائے گئے۔ پیڑ کا علم بھی وُہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں جان سکتے کیونکہ موصوف کے نزدیک جنت میں بھی اتنی نورانیت نہیں کہ ایک درخت کے پتے تک معلوم کر سکیں۔ اب اسی تصویر کا رُخ ملاحظہ ہو کہ دہلوی صاحب کے خارجی گروہ میں شامل ہونے والے، انبیائے کرام سے بیعت کی بجائے اس گروہ کی جماعتوں میں اپنا نام لکھوا لینے والوں کی حالت کیا ہو جاتی تھی اور موصوف اپنے متبعین کو کس طرح عرش و فرش اور جنت و دوزخ کی سیر کروایا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"برائے انکشاف حالتِ سمٰوات و ملاقاتِ ارواح و ملائک و سیرِ جنت و نار واطلاع بر حقائقِ آں مقام و دریافت امکنۂ آنجا و انکشاف امرے از لوحِ محفوظ، ذکر یَاحَیُّ یَاقَیُّوْم است۔"[۲]

حضرات نے اپنے امام کی اِس عبارت کا ترجمہ یُوں کیا ہے:

"آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور مقاماتِ ارواح اور ملائکہ اور بہشت و دوزخ کی سیر اور اُس مقام کے حقائق پر اطلاع اور اُس جگہ کے مکانوں کے دریافت اور لوحِ محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یَاحَیُّ یَاقَیُّوْم کا ذکر کیا جاتا ہے۔"[۳]

۱۔ اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۲

۲۔ اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۲

۳۔ صراطِ مستقیم اُردو، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶

دُوسرے مقام پر موصوف نے اِسی بات کو اَور کُھل کر یُوں بیان کیا ہُوا ہے۔

"برائے کشفِ ارواح و ملائکہ و مقاماتِ آنہا و سیر امکنۂ زمین و آسمان و جنت و نار و اطلاع بر لوحِ محفوظ شغل دورہ کند و باستعانت ہمہ شغل بہر مقامیکہ از زمین و آسمان و بہشت و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسیر آں مقام احوال آنجا دریافت کند و با اہل آں مقام ملاقات سازد۔" [1]

اِس عبارت کا ترجمہ خود وہابی حضرات نے یُوں کیا ہے۔

"کشفِ ارواح اور ملائکہ اور اُن کے مقامات اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی سیر اور لوحِ محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے دورے کا شغل کرے پس زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے جس مقام کی طرف متوجہ ہو اسی شغل کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اُس جگہ کے حالات دریافت کرے، وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کرے۔" [2]

قارئین کرام! یہ ہیں اِس تصویر کے دونوں رُخ کہ دہلوی صاحب کے نزدیک انبیائے کرام اپنے یا کسی کے خاتمے تک کا پتہ نہیں، آئندہ کی ہر بات سے اُنھیں بے خبر اور نادان بتا حتیٰ کہ سیّد الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے متعلق بھی کہہ دیا کہ اگر وہ کسی ایک بات کو معلوم بھی کرنا چاہتے تو معلوم نہ کر سکتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک باری تعالیٰ شانہٗ نے اپنے محبوب کو ایسی کوئی طاقت نہ دی تھی اور اِس قسم کا کوئی طریقہ نہیں سکھایا تھا، جس کے ذریعے وہ کسی بات کو معلوم کر لیا کرتے لیکن دُوسری طرف مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے محبین و معتقدین کو ایسے عملیات سکھا دیے اور شائع فرما دیے تھے کہ اُن کے عامل جب چاہیں انبیاء و ملائکہ سے ملاقات کر سکتے تھے، جنت اور دوزخ کی سیر کر سکتے تھے۔ جس گزشتہ یا آئندہ واقعے کو معلوم کرنا چاہتے، اپنے یا کسی اور کے خاتمے کا حال معلوم کرنا منظور ہوتا تو لوحِ محفوظ سے پڑھ

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۸

[2] صراطِ مستقیم اُردو، مطبوعہ لاہور: ص ۲۰۰

ہے۔ گویا باری تعالیٰ شانہٗ تو انبیائے کرام بلکہ سید الانبیاء کو بھی اس طرح معلوم کرلینے کا طریقہ نہیں بتا سکا لیکن مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے خدمت گزاروں پر پردہ طبق روشن کر دکھا دیئے۔ یعنی جو کام اللہ تعالیٰ سے بھی نہ ہو سکا تو وہ دہلوی صاحب موصوف نے کیا اور جن علوم کے دروازے انبیائے کرام پر بھی بند رہے وہ دہلی کے ایک عالم نے اپنے مریدین کے لیے چوپٹ کھول کر دکھا دیئے۔ اندر کی طرح باہر کی آنکھیں بھی بند کرواتے اور خلوت میں دنیا و مافیہا کے جلوے دکھا دیا کرتے تھے۔ یہ فیصلہ اب قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ عطا کرنے میں دہلوی صاحب نے خود کو خدا سے کمتر بتایا ہے یا ذاتِ باری سے بھی آپ کو بڑھا کر دکھایا ہے، نیز موصوف کی تصریحات کے پیشِ نظر، علومِ غیبیہ پانے میں خدام بڑھ کر رہے یا دہلوی صاحب کے خدام بھی ان حضرات سے ہزاروں گنا سبقت لے گئے؟

پیارے قارئین! اتنا تو یہی ہے کہ کسی تصویر کے زیادہ سے زیادہ دو رُخ ہو سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلّم خارجیت اس قید سے بھی آزاد تھے۔ موصوف کے پاس بعض ایسی بھی تھیں جن کے بے شمار رُخ تھے۔ زیرِ بحث تصویر کے آپ نے دو رُخ ملاحظہ فرمالیے رُخ یہ تھا کہ دہلوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ایسے عملیات بھی بتا دیئے تھے کہ سے جب وہ چاہتے تو ارواح و ملائکہ سے ملاقات کرلیتے، جنت و دوزخ کی سیر ، لوحِ محفوظ سے گزشتہ و آئندہ کے واقعات اور ساری کائنات کے حوادث اور پڑھ دیتے۔ ہر مقام کا ان کے لیے کشف ہو جانا اور ہر جگہ پر وہ بنفسِ نفیس پہنچ سکتے تھے

اسی تصویر کا صرف تیسرا مزیدار رُخ ملاحظہ ہو:

> اس آیت (۴) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس ایسا کچھ علم ہے کہ جب چاہوں اس سے غیب کی بات دریافت کر لوں اور آئندہ باتوں کا معلوم کر لینا میرے قابو میں ہے، سو وہ بڑا جھوٹا ہے کہ دعویٰ خدائی کا رکھتا ہے۔ [۱]

اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۵

دوسرے مقام پر اپنے تعلیماتی چکر اور دعویٰ کشف کے بارے میں خود یوں فیصلہ صادر فرمایا

"اِس آیت (۳۴/۳۱) سے معلوم ہُوا کہ یہ سب جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، کوئی کشف کا دعویٰ رکھتا ہے، کوئی استخارہ کے عمل سکھاتا ہے، کوئی تقویم اور پترا نکالتا ہے، کوئی رمل اور قرعہ پھینکتا ہے، کوئی فال نامے لیے پھرتا ہے، یہ سب جھوٹے ہیں اور دغاباز۔ اِن کے جال میں ہرگز نہ پھنسنا چاہیے۔" [1]

اُدھر تو موصوف نے اپنے معتقدین پر چودہ طبق روشن کر دیئے ہیں لیکن اِدھر فرما رہے ہیں کہ کشف کا دعویٰ رکھنے والے سب جھوٹے اور دغاباز ہیں، ان کے جال میں ہرگز نہیں پھنسنا چاہیے کیونکہ ایسا دعویٰ کرنے والا خدائی کا دعویٰ رکھتا ہے۔ وہابی حضرات اپنے امام کی اِن تحریروں پر غور کریں، حق و باطل میں تمیز کریں اور کسی کی بے جا محبت و طرفداری میں ایمان جیسی متاع کو گنوانا کون سا نفع بخش سودا اور کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو کل قیامت خود فیصلہ ہو جائے گا۔ حقیقت کا بھید کھلنے پر اُس وقت کفِ افسوس ملنا کیا کام آئے گا؟ ہم نے اپنا فرضِ تبلیغ ادا کر دیا، باری تعالیٰ شانہٗ قبول فرمائے اور یہ دعا ہے

سے خدا راہِ ہدایت اُس مسلماں کو دکھا

لذّتِ ایمان کی دولت سے جو محروم ہے

اب قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ اولیائے عظام و انبیائے کرام بلکہ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے خدا داد تصرفات کے بارے میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا نظریہ کیا تھا؟ باری تعالیٰ شانہٗ نے جس محبوب کو اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَر اور وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا کے مژدے سنائے اُسی مالکِ تسنیم اور باری تعالیٰ شانہٗ کے خلیفۂ اعظم و تاجدارِ دوجہاں کے بارے میں موصوف یوں رقمطراز ہیں

"جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں۔" [2]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۶

[2] ایضاً، ص ۸۲

اختیار و تصرف کے مسئلے سے قطع نظر، اِس طرزِ تکلّم کے تیور تو ملاحظہ ہوں۔ کیا اِن الفاظ میں ذرّہ برابر ادنیٰ سا اشارہ بھی اِس امر کا ملتا ہے کہ اِن الفاظ کا لکھنے والا، نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمتی ہو۔ خالق و مالک جلّ جلالہٗ نے اپنے جس بے مثل بندے کو پورے قرآن کریم میں ایک مرتبہ بھی نام لے کر مخاطب نہ کیا، جس کی آواز سے کوئی اپنی آواز بلند کرے تو اُسے سارے اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید سُنا دی ہو، بزرگانِ دین نے جس ہولئے کائنات کے ادب کی یوں تلقین فرمائی ہو: ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اسی ہستی کا تذکرہ اِس عامیانہ انداز میں! اگر گولڑ میں بسنے والا جُھنگا فضا کی وسعتوں کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا، ایک چمگادڑ مہرِ درخشاں کی تابانیوں کا نظارہ نہیں کر سکتا، جوہڑ کا مینڈک بحرِ بیکراں کی وسعتوں سے تعقّ نا آشنا ہے تو اِس سے فضا کی وسعتوں، سورج کی تابانیوں اور سمندر کی بیکرانی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، یہ تو خود جُھنگے کی کوتاہ نظری، چمگادڑ کی محرومی اور جوہڑ میں مینڈک کی تنگ دامانی ہے۔

یہاں بعض حضرات یُوں مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ موصوف نے یہاں اختیارِ ذاتی کے بارے میں ایسا لکھا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ذاتی اختیار ہی کے متعلق نہیں بلکہ موصوف عطائی اختیار بھی ناپسند ہی کرتے رہے تھے ورنہ ضرور تصریح فرما دیتے۔ اِس صورت میں لب و لہجہ کے علاوہ نفسِ مسئلہ میں اُن سے اختلاف ہی کیوں ہوتا، علاوہ بریں ایسی تاویلوں کی دہلوی صاحب نے خود یُوں بیخ کنی کی ہوئی ہے:

اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی۔[1]

ایک اور مقام پر موصوف خُوب گُھلے ہیں اور وہاں اِسی امر کی تصریح کرتے ہوئے یُوں اپنے دل کی لگی بجھائی ہے:

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۴۲

"اس آیت (۲۳ [illegible]) سے معلوم ہوا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اِس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر اپنے بتوں کو اُس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے اسی سے کافر ہو گئے۔ سو اب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اُس کو مانے، سو اُس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اُس کے مقابل کی طاقت اُس کو ثابت نہ کرے۔"[۱]

مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی دُھن میں موصوف خارجیت کے سیلاب میں بہتے ہوئے حقانیت سے کتنی دُور نکل گئے کہ انھیں اللہ جل شانہ کے خلیفۂ اعظم اور اینٹ پتھر کی مورتیوں کے اختیارات میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ انبیائے کرام اور نبی الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی تو بات ہی اور ہے ایک جاہلِ مطلق اور معمولی سمجھ دار آدمی بھی زید و عمرو اور اینٹ پتھروں کے اختیارات کو اپنے مشاہدے کی بنا پر کبھی ایک جیسا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ زید و عمرو کتنے ہی بے اختیار سہی لیکن پھر بھی قدرت نے انھیں بہت سے اختیارات دیئے ہوئے ہیں لیکن اینٹ پتھر محض بے اختیار و بے حس۔ اِس کے باوجود کیا کہنا ہے اُن علماء کی بے بصری کا جنھیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے خلیفۂ اعظم اور اینٹ پتھروں کے اختیارات و تصرفات میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ اِس کے باوجود ایسے ہی حضرات کو مسلمانوں کے مصلح اور ریفارمر وغیرہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے تاکہ اِس گئے گزرے زمانے میں مسلمانوں کی اگر کوئی ایک آدھ آنکھ کھلی ہوئی ہے تو اُسے بھی چٹم کر دیا جائے اور پھر اسی کارنامے پر نازاں ہیں کہ وہ اسلام کی بے مثال خدمت کر رہے ہیں، ایمان کا نور پھیلا رہے ہیں۔ کاش یہ حضرات کبھی تنہائی میں سوچیں اور اپنی روش پر نظرِ ثانی کریں۔

موصوف نے انبیائے کرام حتیٰ کہ سیدالانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے معمولی تصرفات و اختیار کا یُوں کھل کر انکار کر دیا لیکن اہلِ انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے

۱ـہ محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۳ و ۲۴

غیرہ کی شان یُوں بیان کی ہے :

" ارباب ایں مناصبِ رفیعہ ماذون مطلق در تصرف عالمِ مثال و شہادت می باشند - ایں کبار اولی الایدی والابصار رامی رسد کہ تمامی کلیات را بسوئے خود نسبت نمایند ۔ مثلاً ایشاں رامی رسد کہ بگویند کہ از عرش تا فرش سلطنتِ ماست " لہ

سی عبارت کا ترجمہ وہابی حضرات کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایا جائے :

" اسی طرح ان مراتبِ عالیہ اور مناصبِ رفیعہ کے صاحبان عالمِ مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے مطلق ماذون و مجاز ہوتے ہیں اور ان بزرگوار کو پہنچتا ہے کہ تمام کلیات کو اپنی طرف نسبت کریں ۔ مثلاً ان کو جائز ہے کہ کہیں عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے " لہ

کیا اس ستم ظریفی کی داد کوئی دے سکتا ہے کہ اُدھر یہ حکم کہ " جس کا نام محمد یا ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں " لیکن پیر جی وغیرہ کو دنیا و ما فیہا کے اختیارات حاصل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ " عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے " مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کا معاملہ تھا ایا کہ " اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی " اور پیر جی وغیرہ شان بیان کرنے کا وقت آیا تو بتا دیا کہ یہ " عالمِ مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے ماذون و مجاز ہوتے ہیں "

وہابی صاحبو! کیا قیامت نہیں آئے گی؟ کیا حساب و کتاب نہیں ہوگا؟ تمام انبیائے کرام مداد اور اختیارات و تصرفات کا اس طرح انکار کر کے اپنے پیر جی کے خطبے پڑھنا، اُنھیں ے کرام سے بھی ہزاروں درجہ بڑھا چڑھا کر دکھانا، یہ پیر جی کی نبوت کی بنیادیں اُٹھانا تھا س میں کوئی اور ہی راز پنہاں ہے؟ آخر بتائیے تو سہی، یہ تماشا ہے کیا؟ نیز انبیائے کرام

لہ اسمٰعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، مطبوعہ مطبع ضیائی، ۱۲۸۵ھ، ص ۱۱۲

لہ صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ نامی پریس لاہور، ص ۲۲۴

کے لیے یہ تصرفات ماننے پر شرک کا خطرہ بار بار سُنایا ہوا ہے لیکن اپنے پیر جی وغیرہ کو کس مصلحت یا منفعت کے تحت خدا کا شریک بنا کر دکھایا ہُوا ہے ؟

؎ پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مقربین بارگاہِ الٰہیہ کے خداداد تصرفات و اختیارات کے پیشِ نظر اگر کوئی مسلمان اُن سے استعانت و استمداد کرتا ہے یا ذوق و شوق میں ندائیہ کلمات استعمال کرتا ہے تو وہ خوارج کی طرح مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے نزدیک ایسا شخص مسلمان ہی نہیں رہتا بلکہ مشرک ہو جاتا کیونکہ موصوف کے نزدیک اینٹ پتھروں کو پکارنا اور انبیاء و اولیاء کو پکارنا ایک ہی جیسا ہے اور اُن کا مشاہدہ یہی بتاتا تھا کہ بُتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے مقبول ترین بندے بھی بے حس و حرکت اور نفع و نقصان پہنچانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ چنانچہ وُہ لکھتے ہیں

"اکثر لوگ جو دعویٰ ایمان کا رکھتے ہیں سو وُہ شرک میں گرفتار ہیں۔ اگر کوئی سمجھانے والا اُن لوگوں کو کہے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور افعالِ شرک کے کرتے ہو، سو یہ دونوں راہیں کیوں ملاتے دیتے ہو ؟ اُس کو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کرتے، بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء اور اولیاء کی جناب میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا کہ ہم اُن اولیاء انبیاء کو، پیروں شہیدوں کو، اللہ کے برابر سمجھتے بلکہ ہم اُن کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اُسی کا مخلوق یہ قدرت تصرف کی اُسی نے اِن کو بخشی ہے۔ اُس کی مرضی سے عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ اِن کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے۔ اِن سے مدد مانگنی عین اُسی سے مدد مانگنی ہے۔ وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں، جو چاہیں سو کریں، وُہ اُس کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں اور وکیل۔ اِن کے ملنے سے خدا ملتا ہے اور اِن کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور جتنا ہم اِن کو مانتے ہیں، اُتنا اللہ سے ہم نزدیک ہوتے ہیں۔ اسی طرح کی خرافات بکتے ہیں"۔[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۰

کسی کو اللہ تعالیٰ جیسا جانتا یا باری تعالیٰ جیسی صفات یا کسی صفتِ مختصہ کا حامل
تنا شرک ہوتا ہے۔ لیکن موصوف کی سینہ زوری اور ستم ظریفی کا اندازہ کون کر سکتا ہے جبکہ
مسلمان کہتے ہیں کہ ہم انبیائے کرام و اولیائے عظام کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور اُسی کی مخلوق
مانتے ہیں۔ اِن بزرگوں کے تصرفات کو باری تعالیٰ شانہٗ کا انعام و عطیہ مانتے ہیں، جس کا صدور
نبی سے ہو تو معجزہ اور ولی سے ہو تو کرامت کہلاتا ہے۔ اِس کے باوجود موصوف اِسے شرک
قرار دیتے اور اسلامی و ایمانی وضاحت کو خرافات بکنا ٹھہراتے ہیں۔ جب مسلمان اپنے
بزرگوں کو نہ خدا جیسا یا اُس کے برابر مانتے ہیں اور نہ خدا کی صفاتِ مختصہ کا حامل جانتے ہیں
پھر شرک کہاں سے آگیا؟ اگر مثبتین کے دلائل موصوف کے نزدیک ناقابلِ یقین تھے تو وہ
اِس عقیدے کو زیادہ سے زیادہ غیر ثابت کہہ سکتے تھے، دلائل کو کمزور ٹھہرا سکتے تھے لیکن
جب مسلمان اپنے بزرگوں کو خدا کی ذات و صفات میں شریک نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ
دہلوی صاحب نے ہی مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر اپنا شوقِ تکفیر گویا کرنے کی غرض سے
اللہ تعالیٰ کو مقامِ اُلوہیت سے اُتار کر بندوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آخر وہ جب
مخلوق میں شامل ہو اور اُس کے تصرفات بھی کسی کے عطا فرمودہ ہوں تب ہی انبیائے کرام
و اولیائے عظام کے تصرفات سے مطابقت ہوگی اور شرک لازم آسکے گا۔ لیکن اِس شرک کو
ثابت کرنے سے پہلے اُلوہیت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق اور اُس کے
اختیارات کو عطائی ماننا لازم آتا ہے ورنہ شرک کا حکم صادر فرمانا محض ایک خیالِ خام، نرا تحکم
اور سینہ زوری کے سوا اور کچھ نہیں۔ موصوف مزید لکھتے ہیں،

"جن کو لوگ پکارتے ہیں اُن کو اللہ نے کچھ قدرت نہیں دی، نہ فائدہ پہنچانے کی
نہ نقصان کرنے کی۔ اور جو کہتے ہیں، یہ لوگ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس،
سو یہ بات اللہ نے تو نہیں بتائی۔ پھر کیا تم اللہ سے زیادہ خبردار ہو؟ سو اُس کی
بتا سکے جو وجود ہی نہیں جانتا۔ اِس آیت (پ ۱۱) سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان
و زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانیے اور اُس کو
پکاریے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔"[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۱

وہابی صاحبو! آخر قیامت سے آگے رہنا ہے، حساب و کتاب ضرور ہوگا۔ بتلایئے تم فریفی کس برتے پر ہے کہ آیت پیش کردہ میں لفظ (یَعْبُدُوْنَ) موجود، خود اِس کا ترجمہ کیا پوجتے ہیں، اِس کے باوجود تشریح کرتے وقت لکھ دیا کہ "جن کو لوگ پکارتے ہیں"۔ کیا یعبدون یعنی پوجنے کا مطلب پکارنا ہے؟ آخر ایسی دیدہ دلیری سے قرآنی آیات کے مفہوم و مطالب میں دن دہاڑے یہ معنوی تحریف کس برتے پر ہے؟ اگر آپ حضرات خوفِ خدا سے عاری نہیں ہو گئے اور صحیح قیامت کے منکر نہیں تو خدا کے لیے اِن امور پر غور تو فرمایئے!

۱۔ اِس آیت کے کون سے لفظ کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء و اولیاء نفع و نقصان کی قدرت نہیں رکھتے؟

۲۔ آیت میں کون سا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انبیاء و اولیاء مسلمانوں کے سفارشی نہیں ہیں؟

۳۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین میں کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہے؟

۴۔ آیت تو بتوں کے بارے میں ہے لیکن آپ کے امام کو کہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء و اولیاء بھی بتوں کی طرح اینٹ پتھر ہیں؟

قارئین کرام! پہلے سورۂ یونس کی زیرِ بحث آیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں تاکہ مفہوم سمجھنے میں آسانی رہے:

"وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○"

خود مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے اِس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"اور پوجتے ہیں ورے اللہ کے ایسی چیزوں کو کہ نہ کچھ فائدہ دیں اُن کو، نہ کچھ نقصان۔ اور کہتے ہیں، یہ لوگ سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ کہہ، کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں ہیں! سو وہ نرالا ہے اُن سب سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں۔" [۱]

---

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۱

یہ آیت بُت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جملہ مفسرین نے مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے بُت
لیے ہیں۔ علاوہ بریں تفسیرِ قرآن بالقرآن سب سے مقدم داعی ہے۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی تفسیر
در اس آیت میں مَا لَا یَنْفَعُھُمْ وَلَا یَضُرُّھُمْ سے باری تعالیٰ شانہٗ نے کی ہوئی ہے۔
ع و نقصان پہنچانے میں بُت ہی مجبورِ محض ہیں۔ انسان کو مجبورِ محض ٹھہرانا، ایمان کے ساتھ
عقل کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا نہیں تو اور کیا ہے؛ انسانوں میں زید وعمرو سے لے کر
یاء کرام و انبیائے کرام علیہم السلام تک سب کو باری تعالیٰ شانہٗ نے علیٰ قدرِ مراتب
ع و نقصان پہنچانے کی طاقت دی ہے۔
دہلوی صاحب موصوف نے یہاں ہاتھ کی صفائی کا جو کرتب دکھایا وُہ محیر العقول ہے۔
جناب کو بُت پرستوں کا نہ تو برضا و رغبت کفر میں پڑے رہنا کفر نظر آیا، نہ اُن کا بُتوں کو
خدا وہلوی سرکار میں کفر ٹھہرا، اُن کا کفر بس یہی بتایا کہ وُہ بُتوں کو اپنا سفارشی مانتے تھے۔
موصوف کی نظر صرف اِس آخری کفر پر کیوں پہنچی اور پہلے دونوں کفریات سے کیوں نظریں
چرا گئے؟ وجہ یہ ہے کہ وُہ انبیائے کرام کی عداوت میں اِتنے مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ
مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کو مجبورِ محض ثابت کرنے کی تلاش میں رہتے تھے۔ خوارج کو اِس کے سوا
اور چارہ کار ہی نہیں کہ وُہ تسکینِ خاطر کے لیے جو آیات بُتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں
انہیں انبیاء و اولیاء پر چسپاں کر کے اِس طرح بزرگوں کو بُتوں کی طرح مجبورِ محض ٹھہرا کر اپنے
دل کی لگی بجھایا کریں اور مسلمانوں پر شرک و کفر کی توپ داغتے رہیں۔ موصوف نے ایک مقام
پر انبیائے کرام کو بُتوں کی طرح مجبورِ محض ٹھہرا کر، دین و ایمان کے ساتھ شرافت کی حد بھی
عبور کر دی۔ مسلمانوں سے التماس ہے کہ وُہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمتی کی حیثیت
سے اِس عبارت پر غور کریں؛

اللہ سے زبردست کے ہوتے ہوئے ایسے عاجز لوگوں کو پکارنا کہ کچھ فائدہ اور
نقصان نہیں پہنچا سکتے، محض بے انصافی ہے کہ ایسے بڑے شخص کا مرتبہ ایسے
ناکارہ لوگوں کو ثابت کیجیے۔[1]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۵

اے مدعیِ اسلام، اے کلمۂ طیبہ کے ہمراہی! کیا انبیائے کرام تک کے لیے عاجز لوگوں اور ناکارہ لوگوں سُننا تجھے گوارا ہے؟ خدا نہ کرے کہ تیرا جواب اثبات میں ہو۔ تعظیم رسالت جو جانِ ایمان ہے، جس کے بارے میں تُعَزِّرُوْہُ وَ تُوَقِّرُوْہُ ارشادِ رحمٰن ہے۔ کیا اپنے نبی کو عاجز اور ناکارہ کہنا تعظیم و توقیر ہے یا توہین و تنقیص؟ کیا اُس سرکارِ ابد قرار کی توہین کرنے والا دولتِ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے یا مسلمانوں کا رہبر، پیشوا، مصلح اور ریفارمر بن جاتا ہے؟ جانِ برادر! شانِ رسالت کی توہین کر کے بیجا تاویلوں کا سہارا تلاش کرنا غضبِ الٰہی کو اور جوش میں لانا ہے۔ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ اور ملاحظہ فرمائے جا سکتے ہیں، چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

"ہمارا جب خالق اللہ ہے اور اُسی نے ہم کو پیدا کیا تو ہم کو بھی چاہیے کہ اپنے کاموں پر اُسی کو پکاریں اور کسی سے ہم کو کیا کام؟ جیسے جو کوئی ایک بادشاہ کا غلام ہو چکا تو وہ اپنے ہر کام کا علاقہ اُسی سے رکھتا ہے، دوسرے بادشاہ سے نہیں رکھتا اور کسی چوہڑے چمار کا تو کیا ذکر؟"[1]

وہابی صاحبو! انبیائے کرام کو بارگاہِ الٰہیہ کے چوہڑے چمار کہتے ہوئے کوئی شرم تو محسوس نہیں ہوتی ہوگی؟ مانا کہ آپ مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ سے استمداد کرنے کے منکر ہیں، لیکن مقرب ہونے سے تو کسی کو انکار نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ ننگی گالی کس عقیدت کے تحت دی ہے؟ اس کی صحت ثابت کرنا کون سی دین کی خدمت ہے؟ کیا آپ صاحبان کو کلمہ گوئی کا بھی کوئی لحاظ نہیں؟ آخر انبیائے کرام و اولیائے عظام نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو اس درجہ گرے ہوئے الفاظ اُن کی شان میں جاری کیے جاتے ہیں؟ کیا دین و دیانت کی طرح شرافت و اخلاق بھی آپ کے نزدیک بے معنی چیزیں ہیں؟ معلوم نہیں کہ ایمان آپ نے کس جانور کا نام رکھا ہوا ہے!

اب موصوف کا ایک عجیب و غریب اور اسلام دشمنی کا ایٹمی فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

"پیغمبرِ خدا کے وقت میں بھی کافر اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے"

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۵، ۱۰

بلکہ اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ سمجھتے تھے اور اُن کو اُس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے مگر یہی پکارنا، منتیں ماننی، نذر و نیاز کرنی، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اُس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہیں۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ موصوف انبیائے کرام کی دشمنی میں اتنے مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ اُن کے صرف وہی امور کفر و شرک ہو کر رہ گئے تھے جن سے عظمتِ انبیاء کا اظہار ہوتا ہو۔ مذکورہ میں دہلوی صاحب کو نہ تو کفار کا کافر رہنا کفر نظر آیا، نہ اُن کا بتوں کو پوجنا ہی موصوف کی خلاف تھا بلکہ وہ لوگ جو اپنے بتوں کو مدد کے لیے پکارتے، اُن کی منتیں مانتے، نذر و جاتے اور انھیں اپنا وکیل و سفارشی سمجھتے، اُن کے کفر کا صرف اسی میں حصر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ "یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔" مانا کہ بتوں کے ساتھ یہ معاملہ رکھنا یقیناً کفر و شرک ہے نہ اُن کے اندر نفع و نقصان پہنچانے کی صلاحیت اور نہ خدا نے انھیں کسی کا وکیل و شی بنایا، لیکن بتوں کے مجبورِ محض اور مبغوض ہونے کو انبیاء و اولیاء پر چسپاں کر کے یہ ارجیت پر مُہرِ تصدیق ہی کی ہے۔ وہابی علماء عوام الناس میں اپنا بھرم رکھنے کی غرض سے ارتے ہیں کہ ہم ہرگز شفاعت کے منکر نہیں بلکہ انبیاء و اولیاء کی شفاعت کے قائل اور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شفیع المذنبین مانتے ہیں۔ لیکن دہلوی صاحب بتا رہے ہیں سی کو اپنا سفارشی سمجھے وہ ابوجہل جیسا مشرک ہے۔ کیا وہابی حضرات کے لیے اپنے کے فتوے سے بچنے، خارجی یا ابوجہل جیسا ہو جانے سے بچاؤ کا کوئی راستہ ہے؟

کے لیے مزید عبارتیں ملاحظہ فرمالیجیے:

"کوئی کسی کی حمایت نہیں کرسکتا۔"[2]

---

[1] سمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۳-۲۴

[2] ایضاً، ص ۳۰

"کوئی کسی کا وکیل اور حمایتی نہیں بننے والا۔" [1]

آپ حضرات کی مزید تسلی کے لیے موصوف نے خود زبانِ رسالت سے اعلان کروا دیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسرے کو کیا بچا سکوں گا۔" [2]

"اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔" [3]

آگے موصوف نے سورۂ زمر کی ایک آیت پیش کر کے یوں اپنا ایٹمی فتویٰ داغ دیا ہے ملاحظہ ہو:

"اس آیت (۳۹/۳) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے، گو یہی جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر۔" [4]

قارئین کرام حیران ہوں گے کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے انبیائے کرام کی شفاعت برحق جاننا کیوں شرک ٹھہرایا؟ شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا یقین والوں کو ابو جہل جیسا مشرک کیوں بنایا؟ وجہ یہ ہے کہ وہابی حضرات کو شفاعت کی اُن کے مطابق ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ اُن کے رب (معلوم نہیں وہ ہندی تھا یا نجدی) نے اس سارے نوزائیدہ گروہ کی بخشش کا وعدہ کر لیا تھا۔ موصوف خود یوں رقمطراز ہیں:

"ازاں طرف حکم شد کہ ہر کہ بردستِ تو بیعت خواہد کرد گو لکھوکھا باشند ہر یکے را کفایت خواہم کرد۔" [5]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۲ [2] ایضاً: ص ۹۴

[3] ایضاً: ص ۷۶ [4] ایضاً: ص ۳۲

[5] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۶۵

[مذکور]ہ بالا عبارت کا وہابی حضرات نے خود یوں ترجمہ کیا ہے:

"جو شخص تیرے (سید احمد صاحب کے) ہاتھ پر بیعت کرے گا اگرچہ وہ لکھو کھہا ہی کیوں نہ ہوں ہم ہر ایک کو کفایت کریں گے۔" [۱]

قارئین حضرات اب اس تصویر کے دونوں رُخ اپنے سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ [دہلو]ی صاحب نے انبیائے کرام کو شفیع و حمایتی ماننا شرک بتایا یا ایسے لوگوں کا ابوجہل کے برابر مشرک [قرار د]یا اور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے حق میں تصریح فرما دی کہ وہ قیامت میں [اپنی] بیٹی فاطمہ تک کے کام نہ آ سکیں گے۔ یہ جملہ انبیائے کرام کی شان ہے دوسری طرف دہلوی صاحب کے پیر و مرشد سید احمد رائے بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) ہیں کہ اُنھوں نے دنیا میں [ا]پنے سارے متبعین کو بخشوا دیا۔ معلوم نہیں انبیائے کرام اور سید الانبیاء علیہ وعلیہم السلام کا [درجہ] اُونچا رہا یا سید احمد صاحب رائے بریلوی کا؟ وہابی حضرات اپنے امام کی تصریحات کو سامنے [رکھ] کر کوئی فیصلہ تو کریں۔ اب اسی تصویرِ شفاعت کا خارجی فلم اسٹوڈیو میں تیسرا رُخ جو دکھایا گیا [و]ہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"وہ تو بادشاہ کا امیر ہے، نہ چوروں کا تھانگی، جو چور کا حمایتی بن کر اس کی سفارش کرتا ہے تو آپ ہی چور ہو جاتا ہے۔ اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں۔" [۲]

معلوم نہیں اپنے سارے مریدین کو بخشوانے والے سید احمد صاحب کیوں خدا کے شریک [ب]ن بیٹھے اور دوسری طرف کیوں چور یا چوروں کا تھانگی بننے کا شوق پورا کیا۔ اگر کوئی وہابی [یہ] فرمائیں کہ سید احمد صاحب نے سفارش نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی کرم نوازی سے [ا]یسا وعدہ فرمایا تھا، تو اس سلسلے میں ہماری درج ذیل گزارشات پر غور فرما لیا جائے:

۱۔ اگر آپ حضرات یہ فرمائیں کہ مریدین میں سے کسی نے سید احمد صاحب سے سفارش

---

[۱] صراطِ مستقیم (اردو)، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱

[۲] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۶۹-۷۰

کرنے کی درخواست نہیں کی تھی کہ مشرک قرار پاتا، سید احمد صاحب نے بھی اپنے مریدین کی بخشش کے لیے سفارش نہیں کی تھی تاکہ یہ کہا جا سکے کہ وہ خدا کے شریک بن بیٹھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ بخشش کا مژدہ سنایا تھا اور سید صاحب کی بیعت سے منسلک کر دیا تھا۔ تو ہم عرض کریں گے کہ کیا آپ کے نزدیک باری تعالیٰ شانہٗ اپنا شریک بنا لیا کرتا ہے؟

۲ - یہ وعدۂ بخشش یا مژدۂ کفایت سید احمد صاحب کی بیعت پر ہی کیوں منحصر کیا گیا؟

۳ - بقول دہلوی صاحب اُدھر تو سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لختِ جگر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کے بارے میں ایسا مژدہ نہ سنایا گیا لیکن اِدھر سید صاحب کے جمیع مریدین کے متعلق یہ خوشخبری سنائی گئی، تو ان حالات میں خاتونِ جنت سے سید احمد صاحب کے ہر مرید کی شان آپ حضرات کی نظر میں زیادہ ہوئی یا نہیں؟

۴ - دہلوی صاحب کے نزدیک شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی تک کو نہ بخشوا سکے بلکہ قیامت میں بھی نہ بچا سکیں گے لیکن سید احمد صاحب نے اپنے جملہ مریدین کو دنیا میں ہی بخشوا لیا۔ ان حالات میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتبہ اونچا رہا یا سید احمد صاحب کا؟

۵ - دہلوی صاحب کی تصریحات کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، شفیع المذنبین ہوئے یا سید احمد صاحب؟

۶ - سید احمد صاحب تو چوریا چوروں کے ساتھی نہ بنے لیکن اُن کے رب نے اُنھیں چور اور چوروں کا ساتھی بنا دیا یا نہیں؟

ے

اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی!
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

خویینِ انبیاء کا عالمی ریکارڈ موصوف اپنے نبی کو افضل الرسل ضرور کہتے ہیں لیکن اُس کے خصائص کے قائل نہیں، بلکہ بدر رسولوں کے مقام پر رکھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے خود یوں تصریح کرتے ہوئے اپنے

ے دوسرے مقام کا ذکر کیا ہے:

"جو خوبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں، سو بیان کرو، وہ سب رسول
کہہ دینے میں آجاتے ہیں، کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں"[1]

رست ہے کہ آدمی کے حق میں رسالت سب سے بڑا مرتبہ ہے لیکن قرآن کریم کی تصریح کے
مطابق تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم افضل الرسل
نبی الانبیاء ہیں، آپ کو بعض ایسے کمالات سے بھی نوازا گیا ہے جو دوسرے رسولوں کو نہیں
ے اگر آپ کے سارے کمالات رسول کہہ دینے میں آسکتے تو یقیناً آپ کے مخصوص کمالات
ر انبیاء کو بھی ملے ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ کی جملہ خوبیوں کو رسول کہہ دینے میں محصور
انا، خصائصِ مصطفیٰ سے چشم پوشی کا مرض ہے، جو خارجیت کا خاصہ ہے۔ موصوف دوسرے
مقام پر یوں تصریح کرتے ہیں:

"اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکم کن سے چاہے تو کروڑوں
نبی اور ولی، جن اور فرشتے، جبرائیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر
پیدا کر ڈالے"[2]

قدرتِ خداوندی کے انکار کی کسے مجال، لیکن امکانِ نظیر کا یہ نظریہ، خصائصِ مصطفیٰ کا
انکار کرنے کی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے ایک آن میں کروڑوں پیدا
کیے جا سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ سراسر غیر اسلامی ہے اور خصائصِ مصطفیٰ کے انکار کا مترادف ہے
اسی لیے علمائے اہلسنت کو اس سے اختلاف رہا، جب موصوف نے دہلی میں اس نظریہ
کا پرچار کرنا شروع کیا تو علمائے کرام نے اُن کا محاسبہ شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں احقر
چند سرگذشات پیش کرتا ہے:

۱- نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باری تعالیٰ شانہ نے آخری نبی بنایا اور قرآن کریم میں

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۰۳

[2] ایضاً: ص ۳۳، ۲۸

اِس امر کا واضح اعلان فرمایا ہے۔ بقول دہلوی صاحب اگر آپ کے کروڑوں ہمسروں میں سے ایک بھی پیدا فرما دیا جائے تو آخری نبی ہمارے آقا رہیں گے یا آنے والا نبی؟ اگر آنے والا آخری نبی نہیں ہوگا تو ہمسر کہاں ہوا؟ اگر وہی آخری نبی ہوگا تو یہ کلامِ الٰہی کی تکذیب ہے کہ جو محال ہے۔ دریں حالات آپ کا مثل کیسے پیدا ہوگا؟

۲۔ حبیبِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنایا گیا اور کلامِ الٰہی میں اعلان فرمایا گیا۔ عالمین کے دائرے میں ساری مخلوق آتی ہے۔ جو پیدا ہو چکے اور پیدا ہوں گے، اُن میں سے ایک فرد بھی اِس زمرے سے باہر نہیں۔ آپ کے ہمسر بن کر آنے والے نبی بھی اِس زمرہ سے باہر نہیں ہوں گے، وہ بھی ہمارے آقا کی رحمت کے محتاج ہوں گے۔ پھر برابری کہاں ہوئی؟ اگر اُس آنے والے کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی رحمۃ للعالمین بنایا گیا تو فخرِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین نہ رہے بلکہ اُس آنے والے کی رحمۃ للعالمینی کے محتاج ہو گئے اور یہ صورت بھی کلامِ الٰہی کی تکذیب پر منتج ہوگی۔ پھر ہمسر کیسے آئے گا؟

۳۔ اِسی طرح بے شمار خصائص موجود جن میں دُوسرے کی شرکت محال ہے مثلاً آپ یومِ میثاق سب سے پہلے بلیٰ فرمانے والے، سب سے پہلے آپ کا نور پیدا ہوا، آپ باعثِ ایجادِ عالم ہیں۔ بھلا دُوسرے کو یہ اوصاف اب کیسے حاصل ہوں گے؟ اِسی طرح آپ کا دین آخری دین، آپ کی شریعت آخری شریعت، قرآنِ کریم آخری کتاب، دُوسرا آئے تو کلامِ الٰہی کی تکذیب اور اوہیت کا خاتمہ ہُوا اور یہ محال ہے۔ پھر کروڑوں کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اِسی طرح نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بروزِ حشر سب سے پہلے اُٹھیں گے، لواء الحمد آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا، جملہ نبی آپ کے جھنڈے تلے ہوں گے، مقامِ محمود پر آپ رونق افروز ہوں گے، پلصراط سے سب سے پہلے آپ گزریں گے، آپ سے پہلے شفاعت کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکے گا اور سب سے پہلے آپ جنت میں داخل ہوں گے وغیرہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جو صرف آپ کو عطا ہوں گے لیکن باری تعالیٰ نے اُن کا اعلان اپنے حبیب

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کروا دیا ہے۔ اگر کسی دُوسرے کو یہ صفات دی جائیں تو خدا اور رسول کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا اور دُوسرے کو اگر یہ کمالات نہ دیے گئے تو وہ آپ جیسا کہاں ہُوا؟ گویا: ؎

رُخِ مصطفیٰ ہے وُہ آئینہ نہیں جس کے رنگ کا دُوسرا
نہ کسی کے وہم وگمان میں، نہ دُکانِ آئینہ ساز میں

قارئین کرام کا شاید یہ گمان ہوگا کہ دہلوی صاحب صرف اپنے نبی کے خصائص سے چڑتے تھے [لیکن] دُوسرے رسولوں کے برابر اُن کا مرتبہ ضرور مانتے ہوں گے۔ لیکن صورت حال یہ بھی نہیں ہے۔ [ا]پنے خصائص و یکتائی کی کرسی سے اُتار کر عام رسولوں والی دوسری کرسی پر بٹھایا ہے تو، عزواز[ا]م کے لیے کبھی ایسا نہیں کیا جاتا۔ موصوف یہاں سے بھی اٹھا کر اپنے نبی کو ایسے انبیاء [کی] تیسری کرسی پر بٹھا گئے، جن پر ایمان لانا ضروری نہیں، جن کو ماننا محض خبط ہے۔ آئیے [اس] منصب کی کہانی خود موصوف کی زبانی ہی سُن لیجیے:

"جتنے پیغمبر آئے سو وہ اللہ کی طرف سے یہی حکم لاتے کہ اللہ کو مانیے اور اُس کے سوا کسی کو نہ مانیے۔"[1]

"میرے سوا کسی کو حاکم و مالک نہ جانیو اور کسی کو میرے سوا نہ مانیو۔"[2]

"اللہ کے سوا کسی کو نہ مان۔"[3]

"اوروں کو ماننا محض خبط ہے۔"[4]

"آدمی کتنا ہی گناہوں میں ڈوب جائے، محض بے حیا ہی بن جائے، پرایا مال کھانے میں کچھ قصور نہ کرے اور کچھ بھلائی برائی کا امتیاز نہ کرے مگر تو بھی شرک کر لینے سے اور اللہ کے سوائے اور کسی کو ماننے سے بہتر ہے۔"[5]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۳ — [2] ایضاً: ص ۲۴

[3] ایضاً، ص ۳۹ — [4] ایضاً: ص ۳۲

[5] ایضاً، ص ۵۴

یہ تھی وہ تیسری کُرسی جس پہ دہلوی صاحب نے اپنے نبی کو بٹھایا کہ وہ نبی تو ضرور ہے لیکن اُس پہ ایمان لانا نہ صرف غیر ضروری اور بے ضبط ہے بلکہ شرک کی طرح قابلِ اجتناب اور کفر سے بے حیا بن جانے سے بھی بدتر ہے۔ کوئی پوچھے کہ اِن حالات میں دہلوی صاحب کے نبی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ شرعی حیثیت بتانے کی غرض سے موصوف نے اپنے نبی کو وہاں سے بھی اُٹھا کر چوتھی کُرسی پہ بٹھا دیا اور اُس کے بیٹھنے والے کی شان یہ بتائی ہے:

"انبیاء و اولیاء کو جو اللہ نے سب لوگوں سے بڑا بنایا ہے سو اُن میں یہی بڑائی ہے کہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور بُرے بھلے کاموں سے واقف ہیں، سو لوگوں کو سکھلاتے ہیں۔" [1]

دہلوی صاحب نے خود اپنے نبی کی زبان سے بھی یہی اعلان کروا دیا تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے:

"سب لوگوں سے امتیاز مجھ کو یہی ہے کہ اللہ کے احکام سے میں واقف ہوں اور لوگ غافل، سو اُن کو اللہ کا دین مجھ سے سیکھنا چاہیے۔" [2]

چوتھی کُرسی پہ بٹھا کر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کا تعارف یوں کروا دیا ہے کہ وہ بھلے بُرے کاموں سے واقف تھے، اور لوگوں کو سکھایا کرتے تھے یعنی ایک مولوی صاحب ہی سمجھ لیجیے۔ اگرچہ عمل والا معاملہ یہاں زیرِ بحث نہیں کہ دین کی جو واقفیت تھی اُس کے مطابق وہ خود بھی عمل کرتے تھے یا نہیں، یہاں پہنچا کر بھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تسکین نہ ہوئی کیونکہ مولوی صاحبان کی [illegible] ہے، لہٰذا موصوف نے اپنے نبی کو یہاں سے اٹھا کر پانچویں کُرسی پہ بٹھایا اور [illegible] اپنے نبی کا تعارف یوں کروایا:

"جیسا ہر قوم کا چودھری اور گاؤں کا زمیندار، سو ان معنوں کو ہر پیغمبر اپنی اُمت کا سردار ہے۔" [3]

---

۱ محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۰ ۲ ایضاً: ص ۱۰

۳ ایضاً: ص ۱۵

موصوف نے سمجھا دیا کہ ہمارے نبی کا احترام محض اسی طرح کا ہے جیسے گاؤں کے چودھریوں اور زمینداروں کا ہوتا ہے۔ گویا دہلوی صاحب کے نبی اپنی اُمت کے چودھری صاحب ہیں۔ اس کرسی پر بٹھا کر بھی موصوف کو کھٹکا ناپڑا کہ شرعی حیثیت رہی لیکن نبی صاحب کسی لحاظ سے تو اب بھی معظم رہ گئے۔ ہمت کر کے اپنے نبی کو یہاں سے بھی اٹھا کر چھٹی کرسی پر بٹھا دیا اور یوں اُن کا تعارف کروانا شروع کیا:

"انسان آپس میں سب بھائی ہیں، جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے۔ سو اُس کی بڑے بھائی کی سی تعظیم کیجیے۔" [1]

"جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں، وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی۔" [2]

موصوف کو انبیائے کرام کی بڑائی سے تو خاص چڑ تھی۔ پہلی عبارت میں بھول کر اپنے نبی کو بھائی، ساری اُمت کا بڑا بھائی اور بڑے بھائی کی سی تعظیم کے لائق کہہ بیٹھے تھے لیکن فوراً سنبھل گئے اور اگلی عبارت میں بتا دیا کہ بڑے چھوٹے کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس یاد رکھو کہ ہمارے یہ نبی صاحب ہمارے بھائی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد اس پر بھی تململا اُٹھے کہ موصوف دہلی کے مشہور و معروف خاندان کے ایک فرد تھے۔ کسی کو اپنے برابر سمجھیں یہ ذرا مشکل بات تھی۔ لہٰذا فوراً اپنے نبی صاحب کو یہاں سے بھی اٹھایا اور ساتویں کرسی پر بٹھا کر ان کے منصب و مرتبے کا لحاظ رکھنے کی یوں تلقین کرنی شروع کر دی:

"کسی بزرگ کی شان میں زبان سنبھال کر بولو اور جو بشر کی سی تعریف ہو، سو بھی کرو، سو اُس میں بھی اختصار ہی کرو۔" [3]

اپنے نبی کا مقام مطلق بشر جیسا بتایا، پھر اُس کا غیر، نتھو خیرا جتنی تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے اُتنی کا حقدار بتایا جو ایک عام انسان سے بھی کم ہو۔ اتنے پر بھی دہلوی صاحب کے دل کو چین نہ ہوئی کیونکہ عام انسان بھی آخر اشرف مخلوق کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے

۱۔ اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۱ ۲۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۵

نبی کو آٹھویں کرسی پر بٹھا کر یوں اعلان کیا گیا:

"اِس بات میں اولیاء اور انبیاء، جن اور شیطان میں، بھوت اور پری میں کچھ فرق نہیں۔" [1]

"خواہ یہ عقیدہ انبیاء اور اولیاء سے رکھے، خواہ پیر اور شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ بھوت اور پری سے۔" [2]

"کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر شہید کی، بھوت پری کی یہ شان نہیں۔" [3]

"پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں شہیدوں کی، بھوت پری کی، اس قسم کی تعظیم کرے ۔ ۔ ۔ ۔ سو ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔" [4]

"جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جن اور فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور شہید کو یا نجومی اور رمال کو یا جفار کو یا فال دیکھنے والے کو یا برہمن رشی کو یا بھوت اور پری کو ایسا جانے اور اُس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے، سو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور اس آیت (۹/۵۹) سے منکر۔" [5]

"جو لوگ پہلے اور پچھلے، آدمی اور جن سب مل کر جبرائیل اور پیغمبر ہی سے ہو جائیں تو اِس مالک الملک کی سلطنت میں اُن کے سبب کچھ رونق نہ بڑھ جائے گی اور جو سب لوگ مل کر شیطان اور دجال ہی سے ہو جائیں تو اُس کی رونق گھٹنے کی نہیں۔" [6]

موصوف نے اعلان فرما دیا کہ ہمارے نبی صاحب علم و اختیار میں جن، بھوت اور پری جیسے ہیں، تعظیم و توقیر کے لحاظ سے انھیں جن و بھوت و پری کے زمرے میں ہی رکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے وجود سے خدا کی بادشاہت میں کوئی رونق نہیں ہے بلکہ

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۳ — [2] ایضاً: ص ۲۱

[3] ایضاً: ص ۳۶ — [4] ایضاً: ص ۲۸، ۲۹

[5] ایضاً: ص ۵۵ — [6] ایضاً: ص ۱۸

ن کی تسلی اِس پر بھی نہ ہوئی۔ اپنے نبی صاحب کو یہاں سے اٹھا کر نویں کرسی پر بٹھایا جاتا ہے
ن کا ایسا مرتبہ بتایا جاتا ہے جس سے کم رتبے کی کوئی چیز کائنات میں نہیں مل سکتی۔ مثلاً،

"سب انبیاء اور اولیاء اُس کے روبرو ایک ذرّۂ ناچیز سے بھی کمتر ہیں۔"[1]

"اور یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چمار سے بھی ذلیل ہے۔"[2]

یہ ہے دہلوی صاحب کے نبی کی آخری شان، امتیازی مقام کہ اگر اُسے ایک ذرۂ ناچیز
ے ساتھ موصوف بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، تو اُن کا کھوٹا جدا، اُن کے جیسے نبی
اِس ذرۂ ناچیز سے بھی کمتر شمار کرتا ہے اور دوسری دفعہ جب وہ اپنے نبی کو ساری مخلوق
یت بارگاہِ خداوندی میں مقابلے کے لیے حاضر کرتے ہیں، تو زمرۂ مخلوق سے الگ دہلوی صاحب
دریافت کردہ کوئی چمار بھی ہے، وہ بھی حاضر ہو جاتا ہے۔ خدا سے موصوف مقابلہ کرواتے ہیں۔
لوی محمد اسمٰعیل دہلوی اِس مقابلے کا نتیجہ خود یوں سناتے ہیں کہ خدا کے مقابلے میں چمار اتنا
یل نہیں ہے جس قدر ساری مخلوق اور موصوف کا خیالی نبی ذلیل ہے (نعوذ باللہ منہا)۔

یہ تھا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) اور اُن کے جملہ متبعین و
معتقدین کا نبی۔ لیکن ہمارے نبی وہ ہیں جو صرف ہمارے ہی نہیں بلکہ ساری کائنات حتیٰ کہ سارے
نبیوں کے نبی اور جملہ رسولوں کے سردار و سرور ہیں۔ دونوں جہانوں میں جس کو جو نعمت، رحمت،
عظمت، فضیلت مل پائے گی وہ اُنہی کے صدقے، اُنہی کے ہاتھوں ملی اور ملے گی کیوں کہ
باری تعالیٰ شانہٗ نے اُنہیں رحمۃ للعالمین اور اپنی نعمتوں کا تقسیم کرنے والا بنایا ہے۔ اُنہیں اپنا
خلیفۂ اعظم و نائبِ اکبر بنایا اور ساری کائنات کو اُسی محبوب کی خاطر وجود کا لباس پہنایا ہے۔
ہمارے خالق و مالک نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے پیارے نبی کو کونین کا آقا و مولیٰ، ملجا
و ماویٰ اور دونوں جہانوں کا تاجدار بنا کر، نائبِ کُل و حاکمِ کُل و مالکِ کُل اور ماذون و مختار و

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۰۴

[2] ایضاً، ص ۴۳

مجاز بنا دیا ہے۔ یعنی ؎

خالقِ کُل نے آپ کو مالکِ کل بنا دیا

دونوں جہاں میں آپ کے قبضہ و اختیار میں

ہمارا نبی، ہمارا اور ساری کائنات کا دو جگ میں سہارا ہے۔ ہمارا نبی روزِ جزا ہم جیسے تمام گنہگاروں کی شفاعت کرے گا اُس روز شفاعت فرمائے گا۔ جب جلالِ خداوندی کو دیکھ کر جملہ انبیائے کرام نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے، ہمارے نبی نے شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ کا جاں بخش مژدہ سنا کر ہم جیسے گنہگاروں اور سیاہ کاروں کے مردہ جسموں میں جان ڈالی ہوئی ہے۔ وہ اوّل شافع، اوّل مشفع، ساقیٔ کوثر و تسنیم اور صاحبِ مقامِ محمود ہے۔ بروزِ حشر اوّلین و آخرین ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوں گے، سب ان کا منہ تکیں گے، انھیں کا سہارا تلاش کریں گے۔ اس روز لواء الحمد ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا جب سورج سوا نیزے پر ہوگا، زمین تپ کر تانبے کی طرح ہو گئی ہوگی، اُس دن اس جھنڈے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ جس کو پناہ ملی اسی جھنڈے کے نیچے مل سکے گی۔ ان سے پھرا وہ خدا سے پھرا، جو ان سے مستغنی ہوا وہ خدا سے مستغنی ہوا۔ ان کی گستاخی تو دور کی بات جو ان کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کر دے اُس کے بھی ساری زندگی کے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہ ماننے والا مسلمان ہی نہیں۔ ایمان انھیں ماننے، انھیں جاننے اور ان کی تعظیم و توقیر کرنے ہی کا نام ہے۔ ان کی محبت جانِ ایمان، ان کا ذکر راحتِ جان، ان کی فرمانبرداری بخشش کا سامان، ان کی پیاری پیاری اداؤں کو اپنا لائحۂ عمل اور ضابطۂ حیات بنانے والے پکا مسلمان، دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران۔ ہمارا نبی دستِ قدرت کے کمال کا شاہکار ہے۔ ان جیسا نہ آج تک کوئی ہوا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ سب کے کمالات اس جانِ جہان میں موجود ہیں لیکن ان کے مخصوص کمالات کسی کو بھی نہیں ملے۔ ہمارا نبی ساری کائنات میں سب سے معزز و مکرم ہے۔ انھیں باری تعالیٰ شانہ نے کارخانۂ ہستی کا شاہد بنایا، انھیں اوّلین و آخرین کا علم عطا فرمایا، مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنُ

بھگایا، وہ بتایا ہے۔ لوح و قلم کے علوم ہمارے آقا کے معلومات کا ایک حصہ اور اسی بحر کی
رہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے علامہ ابن تیمیہ حرانی
ومسلمین (المتوفی ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) اور محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ)
ی چار قدم آگے بڑھ کر اس بے دردی سے مسلمانوں کی تکفیر کی کہ ساری اُمتِ محمدیہ کو
رکافر بتانے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کی۔ چنانچہ اپنے مخصوص پروگرام کے تحت مسلمانوں
رک ٹھہرانے کی بنیاد یُوں رکھی تھی:

"سُننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب۔ لیکن
اکثر لوگ شرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، حالانکہ شرک میں
گرفتار ہیں۔" [1]

موصوف نے چونکہ ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کو مشرک بنانا تھا، اسی لیے عوام کے ذہنوں
تیار کرنے کی خاطر پیشگوئی چھوڑ دیا کہ "شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید
ب، اب اپنے شرکیات کی فہرست یُوں شروع کرتے ہیں:

"اکثر لوگ پیروں کو، پیغمبروں کو، اماموں کو، شہیدوں کو، فرشتوں کو، پریوں
کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں۔ اُن سے مرادیں مانگتے ہیں، اُن کی منتیں مانتے ہیں
حاجت بر آنے کے لیے اُن کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ بلا کے ٹالنے کے لیے اپنے
بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبد النبی رکھتا ہے،
کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش، کوئی پیر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش، کوئی
غلام محی الدین، کوئی غلام معین الدین، اور ان کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی
کے نام کی بدھی پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے
نام کی بیڑی ڈالتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے جانور کرتا ہے۔ کوئی مشکل کے وقت

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۹

دُہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ بغرض جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں، وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے اماموں اور شہیدوں سے، فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانی کا کیے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ منہ اور یہ دعویٰ۔" [1]

موصوف کے یہ شرکیات یاد رکھیے اب دوسری فہرست ملاحظہ ہو:

"شرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمہ نشانِ بندگی کے ٹھہرائے ہیں، وہ چیزیں اور کسی کے واسطے کرنی، جیسے سجدہ کرنا، اس کے نام کا جانور کرنا، اس کی منت ماننی، مشکل کے وقت پکارنا، ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرت تصرف کی ثابت کرنی، سو ان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ پھر اللہ سے چھوٹا ہی سمجھے اور اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ۔" [2]

اب مولوی محمد اسمعیل دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے شرکیات کی تیسری فہرست ملاحظہ ہو:

"جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے، دور و نزدیک سے پکارا کرے، بلا کے مقابلے میں اس کی دُہائی دے اور دشمن پر اس کا نام لے کر حملہ کرے، اس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے یا اس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اس کا نام لیتا ہوں، زبان سے یا دل سے، یا اس کی صورت کا یا اس کی قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اس کو خبر ہو جاتی ہے۔ اس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری اور تندرستی کشائش اور تنگی، مرنا اور جینا، غم اور خوشی، سب کی ہر وقت اسے خبر ہے۔"

---

[1] محمد اسمعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۹

[2] ایضاً، ص ۲۲

ر بات میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے
ل میں گزرتا ہے، وہ سب سے واقف ہے۔ سو ان باتوں سے مشرک
ہو جاتا ہے۔" [1]

سے بتلائے ہوئے مشرکوں میں مندرجہ ذیل امور کے قائلوں کا بھی شمار کر لیا جائے:
"جو کوئی کسی اور کو ایسا تصرف ثابت کرے، اس سے مرادیں مانگے، اس توقع پر
نذر نیاز کرے، اس کی منتیں مانے، مصیبت کے وقت اس کو پکارے، سو
مشرک ہو جاتا ہے۔" [2]

کے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست تو کافی طویل ہے۔ لہٰذا اسی فہرست میں مزید اضافہ
کیا ہے:

"یعنی کام تعظیم کے جو اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ ان کو عبادت کہتے ہیں۔
جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اس کے نام پر مال خرچ کرنا،
اس کے نام کا روزہ رکھنا، اس کے گھر کی طرف دور دور سے قصد کر کے سفر
کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے یہ لوگ اس کے گھر کی زیارت
کو جاتے ہیں اور رستے میں اس مالک کا نام پکارنا، نامعقول باتیں کرنے سے
اور شکار سے بچنا اور اسی قید سے جا کر طواف کرنا، اسکے گھر کی طرف سجدہ کرنا،
اس کی طرف جانور لے جانے، وہاں منتیں ماننی، اس پر غلاف ڈالنا، اس
کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دعا مانگنی، التجا کرنی اور دین و دنیا کی مرادیں
مانگنی، ایک پتھر کو بوسہ دینا، اس کی دیوار سے اپنا منہ اور چھاتی ملنی، اس کا
غلاف پکڑ کر دعا کرنی، اس کے گرد روشنی کرنی، اس کا مجاور بن کر اس کی
خدمت میں مشغول رہنا، جیسے جھاڑو دینی، روشنی کرنی، فرش بچھانا، پانی

عیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ٣٥، ٣٦

یضاً، ص ٣٢

پلانا، وضو غسل کا لوگوں کے لیے سامان درست کرنا، اُس کے کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر پانی ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانا، رخصت ہوتے وقت اُلٹے پاؤں چلنا، اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا، مویشی نہ چگانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لیے اپنے بندوں کو بتائے ہیں۔

پھر جو کوئی کسی پیر پیغمبر کو، یا بھوت پری کو، یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو، یا کسی کے تھان کو، یا کسی کے چلے کو، یا کسی کے مکان کو، یا کسی کے تبرک یا نشان یا تابوت کو، سجدہ کرے، یا رکوع کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو، یا جانور چڑھائے، یا ایسے مکان میں دُور دُور سے قصد کر کے جاوے، یا وہاں روشنی کرے، غلاف ڈالے، چادر چڑھائے، اُن کے نام کی چھڑی کرے، اُن کی قبر کو بوسہ دے، مورچھل جھلے، اُس پر شامیانہ کھڑا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے، رخصت ہوتے وقت اُلٹے پاؤں چلے، وہاں کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے، سو اُس پر شرک ثابت ہوتا ہے۔[1]

دہلوی صاحب کے شرکیات کا دریا اپنی پوری طغیانیوں پر تھا، لہٰذا تھمنا کہاں ؟ دریا جیسے گنگا میں جمنا کہاں ؟ قارئین ابھی نہ اکتائیں۔ مسلمانوں کو مشرک بتانے کی دہلوی صاحب جو فہرست تیار کی اُس میں یہ بھی شامل ہیں :

"جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں شہیدوں کی، بھوت پری کی اس قسم کی تعظیم کرے، جیسے اڑے کام پر اُن کی نذر مانے، مشکل کے وقت اُن کو پکارے، بسم اللہ کی جگہ اُن کا نام لے، جب اولاد ہو اُن کی نذر نیاز کرے، اپنی اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش، پیر بخش رکھے، کھیت اور باغ میں اُن کا

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی : تقویۃ الایمان، ص ۳۶، ۳۷

حقہ لگائے۔ جو کھیتی باڑی سے آئے پہلے اُن کی نیاز کرے جب اپنے کام میں
لائے، دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کے جانور ٹھہرائے، پھر اُن جانوروں
کا ادب کرے، پانی دانے پر سے نہ ہانکے، لکڑی پتھر سے نہ مارے، کھانے
پینے میں رسموں کی سند پکڑے کہ فلانے لوگوں کو چاہیے فلانا کھانا نہ کھائیں
فلانا کپڑا نہ پہنیں، حضرت بی بی کی صحنک مرد نہ کھائیں، لونڈی نہ کھائے جس
عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وہ نہ کھائے، شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا
نہ کھائے، برائی اور بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے اُس کو ان کی طرف نسبت
کرے کہ فلانا اُن کی پھٹکار میں آ کر دیوانہ ہو گیا، فلانے کو انہوں نے رد کیا تو
محتاج ہو گیا، فلانے کو نوازا تو اُس کو فتح و اقبال مل گیا، قحط فلانے ستارے
کے سبب سے پڑا، فلانا کام جو فلانے دن شروع کیا تھا یا فلانی ساعت میں
سو پورا نہ ہوا، یا یوں کہیں کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں آؤں گا، یا پیر چاہے گا
تو یہ بات ہو جائے گی، یا اُس کے تئیں بولنے میں معبود، داتا، بے پروا،
خداوند خدائیگاں، مالک الملک، شہنشاہ بولے، یا جب حاجت قسم کھانے
کی پڑے تو پیغمبر کی یا علی کی، یا امام کی یا پیر کی یا ان کی قبروں کی قسم کھائے۔ سو
ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔ لہ

یا سجدہ تعظیمی کے بارے میں آنجناب کی تحقیق انیق ملاحظہ فرمائی جائے۔ چنانچہ
لکھتے ہیں :

"اس آیت (۱) سے معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں یوں ہی فرمایا ہے: سجدہ
بجز مالک حق خالق ہی کا ہے سو کسی مخلوق کو نہ کیا جائے کہ مخلوق ہونے میں چاند
اور سورج، نبی اور ولی برابر ہیں۔ جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی کسی
مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے، جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت

لہ اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۸ - ۳۹

یعقوب نے حضرت یوسف کو، تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں
سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے، تو
چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کر لیں۔ اصل
بات یہی ہے کہ بندے کو اللہ کا حکم ماننا چاہیے جب اس نے جو حکم فرمایا اس کو
جان و دل سے قبول کر لینا چاہیے اور حجت نہ نکالے کہ اگلے لوگوں پر تو یہ حکم نہ
تھا، ہم پر کیوں ہوا؟ ایسی حجتیں لانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔" ؎

بزرگوں کے سامنے ادب سے کھڑا ہونا بھی شرک ہے۔ دیکھیے موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمایئے۔

"اس آیت (۴) سے معلوم ہوا کہ ادب سے کھڑا ہونا، اس کو پکارنا اور
اس کا نام جپنا، انھیں کاموں میں سے ہے کہ اللہ صاحب نے خاص اپنی
تعظیم کے لیے ٹھہرائے ہیں اور کسی سے یہ معاملہ کرنا شرک ہے۔" ؎

دہلوی صاحب اپنے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے آگے یوں وضاحت فرماتے ہیں:

"اس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کے لیے نہ کیا چاہئیں۔ کسی کی قبر یا چلہ
پر یا کسی کے تھان پر دور دور سے قصد کرنا، سفر کی رنج و تکلیف، کھا کر
میلے کچیلے ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانور چڑھانے، منتیں پوری کرنی، کسی
کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، اس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی
وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا اور اسی قسم کے کام
کرنے اور ان سے کچھ دین و دنیا کے فائدہ کی توقع رکھنا۔ یہ سب شرک کی
باتیں ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔" ؎

اسی سلسلۂ شرکیاتِ وہابیہ کی آخری عبارت پیش خدمت ہے۔ اس کے شرکیات عجیب و
عجیب تر ہیں:

؎ محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۸۸۔ ؎ ایضاً: ص ۹
؎ ایضاً: ص ۱۰

• اس آیت (۶/۱۴۵) سے معلوم ہوا کہ جانور کسی مخلوق کے نام کا ٹھہرائیے اور وہ جانور حرام اور ناپاک۔ اس آیت میں کچھ اس بات کا مذکور نہیں کہ اُس جانور کے ذبح کرنے کے وقت کسی مخلوق کا نام لیجے جب حرام ہو۔ بلکہ اتنی ہی بات کا ذکر ہے کہ کسی مخلوق کے نام پر جہاں کوئی جانور مشہور کیا کہ یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے یا یہ بکرا شیخ سدو کا ہے، سو وہ حرام ہو جاتا ہے، پھر کوئی جانور ہو، مرغی یا اونٹ، کسی مخلوق کے نام کا کر دیجیے، ولی کا یا نبی کا، باپ کا یا دادے کا، بھوت کا یا پری کا، وہ سب حرام ہے اور ناپاک، اور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔[1]

سب نظر آتا ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے جن جن کاموں کے نے والوں کو مشرک بتایا اُن کی مذکورہ عبارات کی روشنی میں ایک فہرست پیش کر دی جائے س طرح بنتی ہے:

— جس نے مشکل کے وقت کسی نبی یا ولی کو پکارا تو مشرک۔
— اُن کی منتیں مانیں تو مشرک۔
— اُن کی نذر و نیاز دی تو مشرک۔
— بلا ٹلنے کے لیے اپنے کسی بیٹے کو اُن کی طرف منسوب کیا تو مشرک۔
— اپنے کسی بیٹے کا نام عبد النبی، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، مدار بخش یا غلام محی الدین وغیرہ رکھا تو مشرک۔
— کسی بزرگ کے نام سے غریبوں کو کپڑے پہنائے، کھانا کھلایا تو مشرک۔
— کسی بزرگ کے نام کا جانور ذبح کیا تو مشرک۔
— کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی تو مشرک۔
— کسی کو سجدہ تعظیمی کیا تو مشرک۔
— کسی کو اللہ کا بندہ سمجھ کر بعطائے الٰہی حاضر و ناظر سمجھا تو مشرک۔

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۱۸

۱۱ ——— کسی بزرگ کو خدا کی عطا سے تصرف کی قدرت مانی تب بھی مشرک۔

۱۲ ——— اُٹھتے بیٹھتے وقت کسی بزرگ کا نام لیا جیسے کلمہ یا درود کا ورد کرتا رہے تو مشرک۔

۱۳ ——— دُور سے کسی بزرگ کو پکارا تو مشرک۔

۱۴ ——— نزدیک سے کسی بزرگ کو پکارا تب بھی مشرک۔

۱۵ ——— مصیبت کے وقت کسی بزرگ کی دہائی دی تو مشرک۔

۱۶ ——— کسی بزرگ کا نام لے کر دشمن پر حملہ کیا جیسے عموماً مجاہدین یا علیؓ کہہ کر حملہ کرتے تو مشرک۔

۱۷ ——— کسی بزرگ کے نام کا ختم پڑھا، جیسا کہ تمام سلاسل میں صدہا سال سے مروج تو مشرک۔

۱۸ ——— اپنے پیر یا کسی بزرگ کا شغل کیا، جیسا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ نے خاص طور پر تعلیم دی ہے، تو مشرک۔

۱۹ ——— کسی بزرگ کی صورت کا خیال کیا تو مشرک۔

۲۰ ——— کسی بزرگ کو اپنے حالات سے خبردار مانا، جیسے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) نے پیروں کی شان بتائی ہے، تو مشرک۔

۲۱ ——— جو کسی بزرگ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا، وہ مشرک۔

۲۲ ——— جس نے کسی بزرگ کے نام پر مال خرچ کیا، وہ مشرک۔

۲۳ ——— جو کسی بزرگ کے گھر کی طرف سفر کر کے گیا، تو مشرک۔

۲۴ ——— جو کسی بزرگ کی طرف جاتے ہوئے نامعقول باتیں کرتے ہوئے رُک گیا، وہ مشرک۔

۲۵ ——— جو بزرگ کی طرف جاتے وقت شکار کرتا ہوا رُک گیا، وہ مشرک۔

۲۶ ——— کسی بزرگ کے لیے جانور لے گیا، تو مشرک۔

۲۷ ——— کسی بزرگ کے مزار پر چادر ڈالی، تو مشرک ہو گیا کیونکہ چادر تو دہلی صاحب خدا کے مزار پر ڈالنی چاہیے تھی۔

۲۸ ——— کسی بزرگ کے آستانے پر جا کر خدا سے دعا مانگی تو مشرک۔

— کسی کے مزار پر جا کر اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا کی مرادیں مانگیں تو مشرک۔

— کسی بزرگ کے آستانے کی کسی دیوار سے اپنا منہ لگایا یا چھاتی ملی تو مشرک۔

— کسی بزرگ کے مزار کا غلاف پکڑ کر خدا سے دُعا مانگی تو مشرک۔

— کسی مزار پر روشنی کی، تو مشرک۔

— جس نے کسی مزار کے پاس فرش بچھایا تو مشرک۔

— جس نے مزار کا مجاور بن کر کسی کو پانی پلایا تو مشرک۔

— جس نے مزار پر آنے جانے والوں کی خاطر وضو و غسل کے پانی کا خیال رکھا، تو مشرک۔

— جس نے مزار کا خدمت گار بن کر وہاں جھاڑو دی، وہ مشرک۔

— جس نے کسی بزرگ کے کنوئیں کے پانی کو برکت والا سمجھا تو مشرک۔

— وہ پانی بدن پر ڈالا تو مشرک۔

— اُسے آپس میں بانٹا تو مشرک۔

— اُسے غائبوں کے واسطے لے گیا تو مشرک۔

— کسی بزرگ یا مزار سے لوٹتے وقت اگر اُس کی طرف پیٹھ نہ کی تو مشرک۔

— کسی بزرگ کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کیا تو مشرک جیسا کہ از روئے احادیث ان مدینہ طیبہ اور اس کے گرد و پیش کو حرم جانتے اور ان مقامات کا ادب کرتے ہیں، ایسا ادب کرنے والے موصوف کے نزدیک سب مشرک۔

— وہاں شکار نہ کیا تو مشرک۔

— وہاں کے درخت نہ کاٹے تو مشرک۔

— وہاں کی گھاس نہ اکھاڑی تو مشرک۔

— وہاں مویشی نہ چگاتے تو مشرک۔

— کسی بزرگ کی قبر کو بوسہ دیا تو مشرک۔

— مورچھل جھلا تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدا نے اپنے لیے خاص کیا ہوا ہے کہ اسی پر مورچھل جھلا جائے۔

— کسی بزرگ کے مزار پر شامیانہ کھڑا کر دیا کہ آنے والوں کو دھوپ کی تکلیف نہ ہو

تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدا نے اپنے ساتھ خاص کیا ہوا ہے۔

۵۰ — جس نے اپنے کھیت یا باغ میں کسی بزرگ کا ازراہِ عقیدت و خدمت حصّہ رکھ
وہ مشرک۔

۵۱ — کھیتی باڑی میں سے جو حصّہ آتے اُس میں سے پہلے کچھ کسی بزرگ کی نذر کر دیا
مشرک۔

۵۲ — دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کا جانور ٹھہرا دیا، تو مشرک۔

۵۳ — ایسے جانور کا کوئی ادب لحاظ کیا، تو مشرک۔

۵۴ — اُس جانور کو پانی پینے سے نہ روکا تو مشرک۔

۵۵ — اگر اُس جانور کو لکڑی یا پتھر سے نہ مارا تو مشرک۔

۵۶ — کھانے پینے میں رسم و رواج کی سند پکڑی تو مشرک۔

۵۷ — اگر کھانے یا پہننے پر کسی قسم کی مصلحتاً بھی پابندی عائد کی، تو مشرک۔

۵۸ — اگر بی بی کی صحنک کا کھانا، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز اور اُن کے سارے
خانوادے کی طرح مردوں کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۵۹ — یہی کھانا اگر دوسرا خاوند کرنے والی عورت کو نہ کھلایا تو مشرک۔

۶۰ — شاہ عبدالحق کا توشہ اگر حقہ پینے والے کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۶۱ — اگر کسی نے یہ کہا کہ یہ آدمی فلاں بزرگ کی گستاخی کرنے کی وجہ سے دیوانہ ہوا
تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۲ — اگر کسی کی محتاجی کا سبب اُس کا بزرگوں کی بارگاہ میں گستاخ ہونا بتایا، تو مشرک

۶۳ — اگر کہے کہ فلاں شخص کو کسی ولی یا نبی نے نوازا تھا، تو ایسا کہنے والا مشرک

۶۴ — کسی ساعت کو نحس ماننا، تو مشرک۔

۶۵ — اگر کہا کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں آؤں گا، یا فلاں کام کر سکوں گا، تو
کہنے والا بھی مشرک۔

۶۶ — اگر خدا کے سوا کسی کو داتا کہا، تو مشرک۔

— اگر خدا کے سوا کسی کو بے پروا کہہ دیا، تب بھی مشرک۔

— اگر کسی انسان کو شہنشاہ کہہ دیا، تو مشرک۔

— کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی، تو مشرک۔

— اگر سجدہ تعظیمی کو شرک نہ سمجھا تو اس کے خلاف قرآن و حدیث سے دلائل پیش کرنے لگا، تو کافر۔

— اگر کسی بزرگ کے سامنے بے ادبی کے انداز میں کھڑا نہ ہو، تو مشرک۔

— اگر کسی بزرگ کے پاس میلے کچیلے کپڑوں سے پہنچا، تو مشرک۔

— اگر کوئی کہے کہ یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے، وہ مشرک۔

— کہے کہ یہ بکرا شیخ سدّو کا ہے، تو مشرک۔

— اگر کہہ دیا کہ یہ مرغی میری بیوی کی ہے، تو مشرک۔

— کہہ بیٹھا کہ یہ اونٹ میرے لڑکے کا ہے، تو مشرک۔

— کہہ دیا کہ یہ بھیڑ میرے والد محترم کی ہے، تو مشرک۔

— اگر کہا کہ یہ بھینس میرے دادا جان کی ہے، تو مشرک۔

— جو حرمت کے لیے بوقت ذبح غیر خدا کا نام لینا مراد لے، وہ مشرک۔

— جو ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام اور ناپاک تسلیم نہ کرے، وہ مشرک۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

آہ یہ ظالم تلخ حقیقت جتنے سفینے غرق ہوئے
اکثر اپنی موج میں ڈوبے، طوفاں سے ٹکرائے کم

قارئین کرام! یہ تھا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا ایک
ے سمجھے اور سیکھے سکھائے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کا زبانی جمع خرچ۔
فہرست کو سامنے رکھیے، تقویۃ الایمان سے مطابقت کر کے سوچیے! اگر تعلیمات قرآن و
ے اور نفس نیت علما سے دین پر نظر ہے تو بتائیے کیا موصوف کے اس خانہ ساز شرک سے
ِ محمدیہ کا کوئی ایک فرد بھی بچ سکا ہے؟ بات دراصل یہ تھی کہ موصوف نے محمد بن عبدالوہاب

والمتوفی ۱۲۰۶ھ) کی طرح مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرا کر اپنے خارجی ہونے کا عملی ثبوت
بھی پیش کرنا تھا۔ مسلمانوں سے قتل و قتال کر کے اپنی ہوسِ ملک گیری کو تسکین دینی تھی۔

قتل و قتالِ مسلمین

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے حصولِ سل
کی خاطر مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کے لیے تقویۃ الایمان کتاب
لکھی، تاکہ برٹش گورنمنٹ کے حکم کے مطابق پنجاب کے سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو ز
کیا جاسکے اور جس طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر آلِ سعو
کے سہارے خارجی حکومت قائم کی تھی، متحدہ ہندوستان میں بھی اسی طرح انگریزوں کے
سہارے اپنی سلطنت قائم کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ سکھوں سے لڑنے کی خاطر پنجاب
سرحد کے خوانین و رؤسا کا تعاون ضروری تھا۔ جب یہ حضرات اپنی جمعیت سمیت نواحِ پشا
میں پہنچے تو جن خوانین کو آپ کی اطلاع ہوتی گئی وہ بڑی خوشی سے دستِ تعاون بڑھاتے چلے
کیونکہ ابتداءً وہ انھیں رحمتِ خداوندی شمار کرتے تھے۔

۱۲ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ کو ہنڈ کے مقام پر مجمع عوام و خواص یعنی خوانین و رعایا نے
سید احمد صاحب کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی۔ آپ کو امیر المومنین بنا لیا، جمعہ میں آپ
خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سید صاحب کی مہر "اِسْمُہٗ اَحْمَدْ" اور آپ کے مشیرِ خاص و سپہ
افواج یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی مہر "وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْل" مقرر ہوئی۔ عمال و
قاضی مقرر کیے گئے، علاقے کا انتظام سنبھال لیا، زکوٰۃ و عشر کا وصول کرنا شروع کیا
مقدمات کی سماعت کرنے لگے تو جن مسلمانوں نے انھیں تالیفِ قلوب کے سہارے اسب
سے لیس دیکھ کر رحمتِ خداوندی سمجھا تھا، انھیں چند روز میں ہی معلوم ہو گیا کہ ظلم و
کے اصل بانی نیز ہلاکو اور چنگیز خاں کے اصل جانشین یہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان پر
حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور ان کی آبروریزی کا سلسلہ
اس لیے جاری ہے کہ یہ اجنبی مجاہد خارجیت کے مرض میں گرفتار اور مسلمانوں کو مشرکین و
سمجھتے ہیں۔ برطانوی ڈپلومیسی میں پورے ماہر ہیں کہ جو امیر ان سے تعاون کا اعلان کرتا
اُس کا علاقہ زیرِ نگیں و خزانہ زیرِ تصرف۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر رئیس ذرا پیچھے ہٹا، ا

اور منافق قرار دے کر واجب القتل ٹھہرا دیا۔ موقع ملنے پر حملہ کر دیا، مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی، قیدیوں کو لونڈی غلام بنایا اور جو مال ہاتھ لگا وہ کافروں کا مال ٹھہرا کر غنیمت شمار کیا اور خمس نکال کر باقی فوج میں تقسیم کر دیا جاتا۔

یار محمد خاں حاکم یاغستان نے اس بھیڑ چال کو دیکھا تو آثار اچھے نظر نہ آئے کہ ان سوائیوں بھاگتے کر سکھوں کی منظم قوم کی دشمنی مول لی جاتے اور مسلمانوں کی جان و مال اور عزت کو خطرے میں ڈالا جاتے۔ لہٰذا وہ پیچھے ہٹنے لگا تو خارجیت کی پیشانی پر بل آگئے، وہابیت کے تیور بدل گئے اور مسلم کشی کا دریا جوش میں آگیا۔ یار محمد خاں کے بارے میں مختلف خطوط میں لعنت کی گئی، سید احمد صاحب نے مختلف رنگوں کو اس کا کافر، منافق، دشمن اسلام، فرنگیوں کا یار و رازدار، فریبی، مکار وغیرہ ہونا بتایا اور اپنے ارادہ مسلم کشی کے لیے راہ ہموار کرتے رہے۔ سوانح احمدی کا تیسرا مکتوب جو اعلام ہے، اس میں سید احمد صاحب نے بہ وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

"سردار مذکور نے اگرچہ اس فوج کے ظہور کے آغاز کے وقت ہی اپنے حسد بھرے دل میں مخالفت کا ارادہ رکھا تھا اور اپنے سینہ پر کینہ میں لڑائی جھگڑے کا تخم بویا تھا، آخر کار ایسے وقت میں جبکہ دشمن کے مقابلہ میں لڑائی کا سمندر موجیں مار رہا تھا اور توپ و بندوق کی گرجدار آوازیں معرکہ وجدال کی داد دے رہی تھیں، بدبختی اور جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی اور اس نے مسلمانوں کی فوج کو تتر بتر کر دیا اور جہاد کے معاملہ کو لیت و لعل میں ڈال دیا اور دغا و مکر کی چال چلی اور اپنے زعم میں کفر و فساد کی جڑیں مضبوط کر دیں اور اسلام و جہاد کی بنیاد متزلزل کر دی۔ اس طرح ایک مجہولی باطل حکومت کی تنظیم کی اور سچی امامت میں خلل ڈال دیا۔ اس کے علاوہ اس خاکسار کی ہلاکت اور اس ناچیز کو برباد کرنے میں سخت جدوجہد کرتا رہا اور اسی ناکام میں مصروف رہا۔"[1]

---

[1] سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۰۳

یار محمد خاں حاکم یاغستان ذی شعور آدمی تھا، حکمتِ عملی کے ساتھ سکھوں سے نباہ کرکے
اسلامی علاقوں کو اُن کی دست بُرد سے بچاتے ہوئے تھا کیونکہ خوانین بھی آپس میں متفق و متحد
نہیں تھے۔ شروع میں تو دیگر بعض خوانین کی طرح موصوف نے بھی بیعت کر لی لیکن صورتِ حال
سے آگاہ ہونے پر وہ شرعی اور سیاسی لحاظ سے تعاون نہ کرنے پر مجبور تھا۔ جس کے وجوہ حسبِ ذیل

۱۔ اِس بیعت کی شرعی حیثیت وہی تھی جیسے کوئی بے خبر مسلمان اپنے وقت کے کسی ابنِ تیمیہ
حرانی یا محمد بن عبدالوہاب نجدی یا مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کر بیٹھتا۔

۲۔ موصوف کو جب آگاہی ہوئی کہ وہ لشکرِ علی المرتضیٰ کے قلب میں خوارج کو جگہ دے بیٹھے
محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھیڑوں کے ریوڑ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیر
بھیڑیوں کو داخل کر چکے، مسلمانوں کو کافر و مشرک جاننے والوں کو اُنھوں نے اپنی
گردنوں پر مسلط کر لیا۔ تو حکمتِ عملی سے چھٹکارے کی صورت نکالنی اور اِن بلائے ناگ
سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا شرعی اعتبار سے ضروری ہو گیا تھا۔

۳۔ یہ معلوم ہونے پر کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی تو انگریزوں کی فوج کا ہراول دستہ ہے
اُنھوں نے محسوس کیا کہ اِس جتھے کی جتنی بھی مدد کی جائے گی اُس کا فائدہ براہِ راست
انگریزوں ہی کو پہنچے گا، کیونکہ سید احمد صاحب کی کامیابی انگریزوں کو ایک ہی جست
میں ستلج سے کابل و قندھار تک پہنچا دے گی۔

۴۔ پانچ سو علماء و مشائخ نے پنجتار کے مقام پر جمع ہو کر اِن حضرات کو فہمائش کی کہ وہ
اپنے غیر اسلامی عقائد و نظریات ترک کر دیں، تاکہ مسلمان دل کھول کر اُن کی مدد کریں
سکھوں سے بڑی آسانی کے ساتھ نبٹ سکیں، نیز انگریزوں کے آلۂ کار بننے سے با
آ جائیں لیکن یہ دونوں باتیں نامنظور ہوئیں۔

یار محمد خاں نے پیچھے ہٹنے کی جو وجہ بتائی اُسے اِسی اعلام کے اندر یُوں بیان کیا گیا ہے:

"اس کافرِ رُوسیاہ (یار محمد خاں) کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کہتا ہے
کہ کافروں سے دوستی محض شعائرِ دین کی حفاظت کے واسطے ہے، مسلمانوں
کے مقاصد اور جان و مال بچانے کے لیے ہے، یہ بھی مذہبِ اسلام کی

بدعت گزاری کا ایک طریقہ اور سنت سید الانام کے پاس و لحاظ کا ایک
ذریعہ ہے۔ بغرض یہ صریح مکر و فریب اور گمراہی اور اپنے عیب کو چھپانے کا
حیلہ ہے۔ دین کے احکام کی پاسداری کا دعویٰ بھی خوب ہے یہ تو اللہ کا نہیں
اس کا اپنا دین ہے۔" [1]

وقت سے بڑا منصف کون ہے؟ ایک صدی بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ سید احمد صاحب
کے متبعین کے فتوے، ایک خبیث مشرک یعنی بت پرست، یعنی گاندھی جی کی جنبش لب کے
بیٹر گردش کرنے لگ گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو ہنود کی دست برد سے بچانے اور
اسلامی اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی خاطر "پاکستان" کا نعرہ بلند ہوا، تو ان حضرات
نے سوراج (اکھنڈ بھارت) کی تائید اور مشرکین ہند کو اپنا ان داتا بنائے رکھنے کی حمایت میں
نام پاکستان کی اتنی سرتوڑ مخالفت کی جتنی ہنود کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ یار محمد خاں حاکم یاغستان
کے بارے میں سید احمد صاحب کے اس ریمارک کو سامنے رکھتے ہوئے کیا فیصلہ ہے موصوف
کے معتقدین کا کیا فیصلہ ہے کانگرسی اور گاندھی دوست، گاندھوی علماء کے بارے میں؟ ان کے
متعلق دیوبندی مولوی ظفر علی خاں تو یوں مرثیہ خواں تھے:

رسول اللہ کے گھر میں یہ کیسا انقلاب آیا
کہ گاندھی جی کی کٹیا عالمان دین کا ڈیرا ہے

بہر حال، یار محمد خاں کے بارے میں سید احمد صاحب نے جو فیصلہ کر لیا تھا، انہیں کی زبانی
ملاحظہ ہو:

"سردار مذکور کی منافقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہر عقلمند، ہوشیار،
تجربہ کار کی رائے میں جہاد قائم رکھنا بغیر ایسے فتنہ برپا کرنے والوں کے استیصال
کے ممکن نہیں۔ ان حالات کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ قتل و
جدال اور اس کی بیخ کنی بھی ایک صورت ہے ازالۂ فساد کی۔ ان لوگوں کی

---

[1] سعادت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۳۴-۳۵

توہین اور بیخ کنی اقامتِ جہاد میں شامل ہے۔ جہاد کے نفاذ اور اُن کے حقو
کے لیے ہم مامور ہیں اور اُن سے ہاتھا پائی کرنا ہمارے لیے باعثِ ثواب
ہماری فوج کا ہر مجاہد غازی ہے اور اللہ تعالیٰ کی فوج کا سپاہی ہے اور اُ
لشکر کا مقتول گنہگار ہے اور ہمارا شہید اللہ کے پاس مقبول اور مومن سہا
اُن کا مقتول مردود و ملعون۔ اور یہ حکم اسلام کے چاروں مقررہ اصولوں یعنی
کتاب و سنّت، اجماع اور قیاس سے ثابت ہے۔ لیکن قرآن کی رُو
پھر یہ کہتا ہوں کہ سردارِ مذکور منافقین کی ایک قسم میں شامل ہے اور اُن
قتال پر خلاقِ جہاں جل شانہٗ کی آیات بلحاظِ استحقاق ناطق ہیں۔ بلا س
وُہ منافقین میں سے ہے۔ کفّارِ بدانجام کے ساتھ موالات اور یگانگت بنا
سے بھائی چارہ وُہ اِس حد تک رکھتا ہے کہ اُس کے آثار روزِ روشن کی
ظاہر ہیں اور اُن سے باہم دوستی ہی نفاق کی علامت ہے۔"[1]

کیا سیّد احمد صاحب کے اِسی فیصلے کی رُو سے ہندوؤں سے نہ صرف
کرنے والے بلکہ اُن کے ہندو بےدام بننے والے حضرات بھی منافق قرار پائیں؟
اگر جواب نفی میں ہے تو اس کی وجہ، کیا سیّد احمد صاحب کے متبعین پر قرآن
اجماع و قیاس کا کوئی حکم اثرانداز ہونے کی اہلیت نہیں رکھتا، تعصب کو بالائے
ہُوئے غور تو فرمائیے کہ سکھوں سے دوستی رکھنے کا یار محمد خاں پر الزام لگا کر اُسے
اور اُس پر فوج کشی کی گئی۔ اُسے شکست ہُوئی تو اُس کی ساری فوج کو لشکرِ کفّار
جنگی قیدیوں کو غلام بنا لیا گیا، اُن کا مال، غنیمت کا مال شمار ہُوا۔ لیکن جب یہی
گاندھی صاحب کا علی الاعلان [illegible] ہندوؤں کا یار و غمخوار اور مسلمانوں سے بیزار ہو
کیا اُن دنوں مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل تھا یا نہیں کہ وُہ سیّد احمد صاحب کے
پر عمل کرتے ہُوئے ہندو نواز حضرات کو منافق اور واجب القتل قرار دے کر

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سیّد احمد شہید، ص ۲۵۔ ۲۶

اور اجماع و قیاس کے بتاتے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا شروع کر دیتے، جس طرح کہ سید احمد صاحب نے یار محمد خاں حاکم یاغستان کے خلاف عمل کر کے دکھایا تھا؟ وا دیجیے مسلمانوں کے اینڈ بھینی کی اور فیصلہ کیجیے کہ کون مفسد ہے اور مصلح کون ہے؟

سید احمد صاحب نے اپنے فتوے پر عمل کیا۔ یار محمد خاں پر لشکر کشی کی اور اُسے شکست دی۔ اس سلسلے میں مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کی مندرجہ ذیل وضاحت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ موصوف لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی اور مولوی محمد حسن صاحب رامپوری بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب حضرات سید صاحب کے ہمراہ جہاد میں شریک تھے۔ سید صاحب نے پہلا جہاد مسمّی یار محمد خاں حاکم یاغستان سے کیا۔"[1]

یہ تو میرٹھی صاحب کی تاریخ دانی اور صحتِ بیانی کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کہاں مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی اور کہاں سید احمد صاحب کی یہ رزم آرائیاں؛ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ موصوف کے نزدیک سید صاحب کا پہلا جہاد یہی تھا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے گئے تھے، اس سے پہلے جو لڑائیاں ہوئیں، شاید وہ موصوف کے نزدیک جہاد نہ تھیں۔

خادی خاں حاکم ہنڈ اور یار محمد خاں حاکم یاغستان اور دیگر خوانین و رؤسا کو کافر و مشرک اور مرتد و واجب القتل ٹھہرانے کے سلسلے میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا عجیب و غریب اور سنسنی خیز بیان ملاحظہ ہو:

"اس موقع پر ذرا تامل سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہاں دو معاملے درپیش ہیں؛ ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل و خون کے جواز کی صورت نکالنا اور اُن کے اموال کو جائز قرار دینا، اس بات سے

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی، تذکرۃ الرشید جلد دوم، ص ۲۰۰۔

قطع نظر کہ وہ اُن کے ارتداد پر یا اُن کی بغاوت پر مبنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اِس کا آیا کوئی سبب ہے یا کچھ اَور ہے، جبکہ بعض اشخاص کے مقابلہ میں اُن کا مرتد ہونا ثابت ہو چکا ہے اور بعض کے متعلق بغاوت یا اِس کا کوئی اور سبب۔ اگرچہ کہ پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی یعنی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے کیونکہ ہم ان فتنہ پردازوں کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کو اہلِ کتاب کے مثل جانتے ہیں۔" [1]

مسلمانوں کے قتل و خون اور اُن کے اموال کا جواز نکال کر دہلوی صاحب موصوف نے پیر شاہ علی کو یُوں مطلع کیا تھا:

"جنابِ والا (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر لازم ہوئی۔ جو شخص جنابِ والا کی امامت کو ابتداء میں قبول نہ کرے یا قبول کرنے کے بعد اِس سے انکار کر دے، تو یہ سمجھیے کہ وہ باغی، مکار اور فریبی ہے۔ اُس کا قتل کرنا کافروں کے قتل کی طرح عین جہاد ہے اور اُس کی ہتک کرنا تمام فساد کرنے والوں کی ہتک کرنے کے مماثل ہے اور پروردگار کی عین مرضی پہ مبنی ہے۔ ان اشخاص کی مثال حدیثِ متواتر کی رُو سے کتوں کی سی ہے اور یہ تمام ملعون شریر النفس ہیں۔ اِس عاجز کا مذہب اِس معاملہ میں یہی ہے۔ پس معترضین کے جوابات اِس خصوص میں اِس عاجز کے پاس تو اُن کو تلوار کے گھاٹ اتارنا ہے، نہ کہ تحریر اور تقریر ہے۔" [2]

سید صاحب کے سوانح نگار مولوی ابوالحسن علی ندوی نے دہلوی صاحب کا یہ فتویٰ یُوں ادیبانہ رنگ میں نقل کیا ہے:

"پس آپ (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوئی۔ جو

---

[1] سعادت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۱۴۲

[2] ایضاً: ص ۵۵

آپ کی امامت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کر دے ،
وہ باغی مستقل الدم ہے اور اُس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور
اُس کی بے عزتی تمام اہلِ فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے۔ اِس لیے کہ
ایسے لوگ بحکم احادیثِ متواترہ ، کلاب النار اور ملعونین اشرار ہیں۔ اِس مسئلے
میں ابنِ حنیفہ کا یہی مذہب ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے
نہ کہ تحریر و تقریر۔" [1]

مولوی محبوب علی صاحب بھی مسلمانوں کے کفر پر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور دوسرے
وہابی حضرات کی طرح متفق تھے۔ موصوف نے فتویٰ بھی جاری کیا تھا، جس کا خلاصہ مرزا حیرت
دہلوی نے یوں نقل کیا ہے:

"سکھوں سے زیادہ اِن کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔" [2]

وہابی حضرات کی طرف سے یار محمد خاں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی فوجوں کے
ساتھ جنگِ شیدو میں شامل ہوا۔ اپنے بھائیوں اور دیگر خوانین کو بھی ساتھ لایا لیکن تماشا
دیکھتا رہا ، لڑائی میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیا اور اِس فعل کو اُس کی غداری پر محمول کیا جاتا ہے،
مثلاً غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"اِس مدت (دورانِ جنگ) میں یار محمد خاں اپنی سپاہ کے ساتھ بے حس و
حرکت کھڑا رہا۔ نہ یورش میں شریک ہوا ، نہ لڑائی میں حصہ لیا۔" [3]

سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگار وضاحت کرتے ہیں کہ یار محمد خاں جنگِ شیدو
کے دوران اُن کے مجاہدوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور جملہ وہابی حضرات کا یہی فیصلہ ہے
کہ یار محمد خاں کا یہ اقدام اُس کی منافقت ، سکھ دوستی ، مسلمان دشمنی اور غداری ہے لیکن
ان حضرات کی خدمت میں ہماری ایک دردمندانہ التماس ہے کہ فیصلہ تو آپ صادر فرما چکے لیکن

---

[1] ابو الحسن علی ندوی ، مولوی ، سیرت سید احمد شہید ، جلد اول ، ص ۴۰۵

[2] حیرت دہلوی ، مرزا ، حیات طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۱۰

[3] غلام رسول مہر ، سید احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ، ص ۳۰۰

اگر نظرثانی کی گنجائش باقی ہو، تو اپنے ہی مرزا حیرت دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمایئے،

"مولانا شہید (اسمٰعیل دہلوی) نے پہلے سکھوں کے خونخوار حملہ کو روکا مگر جب دیکھا کہ سید صاحب تو بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور اُن کا ہاتھی جنبش نہیں کھاتا اور وہ عنقریب سکھوں کے قبضہ میں آنے کو ہیں۔ آپ نے میدان سکھوں کے ہاتھ سونپ کے سید صاحب کو سنبھالا اور بمشکل کئی آدمیوں کی مدد سے آپ گھوڑے پر بٹھا کے صاف میدان جنگ سے نکل آئے۔ جب مجاہدین نے سید صاحب اور مولانا شہید کو اپنے میں نہ پایا، اُن کے پیر بھی اکھڑ گئے۔ نہ کوئی کمانڈر تھا نہ اُنھیں کوئی خالد جیسا لڑانے والا اور نہ کوئی مثنیٰ جیسا حملہ آوروں کے پنجہ سے نکالنے والا تھا۔ جدھر اُن کا سینگ سمایا سراسیمہ ہو کے بھاگے۔ سکھوں نے تعاقب کیا اور مظلوم مسلمانوں کو نہایت بے بسی کی حالت میں قتل کیا۔ اُن کا سامان لٹ رہا تھا اور اُن کی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ اِدھر سید صاحب کے لینے کے دینے پڑ رہے تھے اور اُدھر مجاہدین کی جانوں پر بن رہی تھی۔ بہت سے مسلمان سکھوں نے قید کر کے لاہور روانہ کیے جہاں وہ نہایت بے رحمی سے قتل کیے گئے۔"[1]

جناب غلام رسول مہر نے اِس لڑائی کے بارے میں ابتدائی فتح کی وضاحت بھی یوں فرمائی ہے،

"جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگے تھے وہ پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ستہ کے غازیوں نے اس اوٹ پر بھی دھاوا بول دیا اور دشمن کو جاروب کی طرح صاف کرتے ہوئے سکھ لشکر گاہ کی سنگر کے پاس پہنچ گئے۔ اِسی اثنا میں گوڑی شہزادہ اپنے مجاہدوں کو لے کر گاؤں سے نکلا اور ہر رکاوٹ بے نذر ہٹاتا ہوا سکھ لشکر گاہ میں گھس گیا۔ غازیان سے ...

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، ص ۲۱۴-۲۱۵

اور گوہری شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہل چل مچا دی اور اُن کی توپیں بھی
بند ہو گئیں جب بہ ظاہر اسلامیوں کی فتح میں شبہ باقی نہیں رہا تھا بلکہ
ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارک باد بھی دے دی۔"[1]

یہاں یہ بات بھی تو جائے غور ہے کہ جس لشکر کی حالت یہ دیکھی جا رہی ہے کہ اُس کا سپہ سالار
فراری کتنا پھر رہا ہے۔ یہ نہیں کیا کہ سید صاحب کو بعض اشخاص کے ذریعے کسی محفوظ مقام
پہنچا کر ہزاروں مسلمانوں کی جانوں کا خیال کرتے اور لشکر کو جنگی تدابیر کے مطابق دشمن سے لڑاتے
پیر و مرشد کو لے کر میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے اور ہزاروں مسلمانوں کو جنگ کی بھٹی میں
جھونک گئے، موت کے منہ میں ڈال دیا۔ کیا اس مزے کی سپہ سالاری اور ایسی قیادت
سے زمین پر کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟

اس کے باوجود یہ حضرات جھگڑے اور مسلمانوں کے بدخواہ نہیں بلکہ اس ڈوبتی کشتی
کے ناخدا بھی رہے لیکن جن حضرات نے ان کی ملائیت کا کرشمہ اور جنگی سوجھ بوجھ کا بچشم خود معائنہ
کر کے اپنے ساتھی مسلمانوں کو بچانے کی تدبیر کی وہ غدار، باغی، منافق، مرتد اور اصل کافر
قرار پا گئے۔ کیا سپہ سالار کے بھاگ جانے کے بعد کسی فوجی یا اس جنگ میں حصہ لینے والوں میں
سے کسی جان بچانے والے کو ازروئے شرع سپہ سالار سے زیادہ ملزم یا گنہگار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟
غضب تو یہ ہے کہ بھاگتے وقت کسی کو اپنا قائم مقام بھی مقرر نہیں کیا۔ سرداروں کی کوئی مجلسِ
شوریٰ بھی چند منٹ کے لیے نہ بلائی گئی کہ صورتِ حال سے کس طرح نپٹا جائے گا۔ بس خرابی
نظر آئی تو یار محمد خاں کی کہ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بچایا کیوں، گاجر مُولی کی طرح سکھوں
کے ہاتھوں کٹوا کر برطانوی امیر المومنین سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ کیوں حاصل نہ کیا؟ بہرحال
اسی جرم کی سزا یار محمد خاں کو یہ ملی کہ جنگِ زیدہ میں شکست کھائی اور ستمبر ۱۸۲۹ء میں ان
حضرات کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ ہنڈ کے سردار خادی خاں کو یار محمد خاں سے بھی پہلے اگست
۱۸۲۸ء میں ان کے قلعے کے اندر شہید کر دیا تھا۔ حالانکہ خادی خاں تو حضرت آخون صاحب کا

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۳۷۰، ۳۷۱

مرید اور سچا مسلمان تھا۔ لیکن پیر و مرشد نے ان حضرات کی خارجیت کو بھانپ لیا تھا، پہلے فہمائش کی، باز نہ آئے تو تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا اور خادی خان کو بھی علیحدگی کا حکم دیا۔ بالآخر مجاہدوں نے حقیقی اسلام قبول کرنے کے بجائے خادی خان کو بھی موت کے گھاٹ اتار کر جشن فتح منالیا۔

خادی خان سردار ہنڈ کو ان حضرات نے کس درجے کا کافر بھا، یہ واقعات کی روشنی میں ملاحظہ ہو:

"میں (مولانا اسمٰعیل دہلوی) یہ کہتا ہوں کہ خادیخان نے امیرالمومنین کے ہاتھ پر اعلان کے بعد بیعت کی تھی کیونکہ وہ صاحب ممدوح کی امامت سے منحرف ہو گیا ہے اور اپنے محفوظ مکان پر، جس سے مراد قلعہ ہنڈ ہے بھروسہ کیا اور کافروں سے امداد طلب کر کے حضرت امام کی مخالفت پر کمر باندھلی، اس لیے حضرت موصوف نے اُس کو کیفرِ کردار کو پہنچایا اور اُس کا مال تقسیم کر دیا، بلکہ اُس کے ہتھیاروں اور گھوڑوں کو بھی ضرورت کے وقت استعمال فرمایا اور اُس کے دوسرے مال کو ضبط کر کے حفاظت کی خاطر مجاہدین پر تقسیم فرمادیا۔" [1]

یار محمد خان حاکم یاغستان، اُس کے ساتھیوں اور اُن کے اموال کے بارے میں کا فتویٰ یہ تھا، جس پر ان حضرات نے عمل کر کے دُرانیوں کے سینوں میں خنجر گھونپ دیے تھے:

"یار محمد خان بلاشک وشبہ اس معاملہ میں ظلم و تعدی کا رہبر تھا۔ ایسے رہبر کا قتل اور اُس کا مال ضبط کرنا بلکہ اُس ظالم رہبر کی فوج کا قتلِ عام اور اُس کی فوج کے تمام مال پر ہر قسم کا تصرف کرنا، یعنی اُس کی فروخت اور تقسیم حسبِ شرع جائز ہے۔" [2]

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۴۴

[2] ایضاً: ص ۲۴۵

ہر سمجھدار آدمی کے ذہن میں یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب جب دور دراز کا سفر کر کے وہاں پہنچے تو آپس میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں انھیں دور کرنے کی کوشش کیوں نہ کی گئی اور حالات پر قابو پا کر اتفاق و اتحاد کی فضا کیوں پیدا نہ کی گئی؟ یا خوانین و روسا ہی بدنیت تھے کہ وہ کسی طرح اتحاد پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، یا اُن کی کوئی فاسد غرض تھی؟ اس سلسلے میں خود سید صاحب کا یہ ارشاد قابلِ غور ہے:

"ہم نے ہرگز ہرگز منافقوں کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کی ہے اور نہ کبھی ان سے موافقت کی کوئی راہ نکالی ہے۔" [1]

...دی خان اور یار محمد خان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، جس نے نواحِ پشاور کے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کون سی بُری گھڑی میں اس مصیبتِ ناگہانی کو اپنے گھر میں بٹھا لیا۔ لیکن خانہ جنگی سے بچتے ہوئے نباہ کرتے چلے گئے۔ حضرت سلطان محمد خان نے ایک دفعہ اِن سے ٹکر لی مگر شکست کھائی۔ علمائے سرحد کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے اپنی جماعت کے متعلق بعض شکایات یوں کی ہیں:

"اِن بہتان لگانے والوں کے الزامات کے منجملہ ایک الزام یہ ہے کہ نہ صرف اِس فقیر کو بلکہ مجاہدین کے گروہ کو وہ ملحد و زندیق کہتے ہیں یعنی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اِن مسافروں کی جماعت کا کوئی مذہب ہی نہیں ہے اور نہ اِن کا کوئی مسلک ہے بلکہ یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہیں اور کسی نہ کسی طرح لذتِ جسمانی کے جویاں رہتے ہیں، خواہ وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔" [2]

"اِن افترا پردازوں کا یہ اتہام بھی ہے کہ میں ظلم و ستم ڈھاتا ہوں کہ یہ فقیر بلاوجہ مسلمانوں کی جان و مال پر دست درازی کرتا ہے اور اس خصوص

---

[1] سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۰۱

[2] ایضاً، ص ۲۲۹

میں چرب زبانی اور حیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ سبحانک ھٰذا بہتان عظیم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو کچھ تنبیہ اور سزا اُس بادشاہِ جبار کی طرف سے اِس بندہ ناچیز کے ہاتھ سے بعض مرتدوں، اشرار اور بدخصلت منافقوں کو پہنچی ہے اُن کو میں اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں اور اپنی مقبولیت کے آثار اپنے میں پاتا ہوں بلکہ دین کی اعانت کی غیرت اور دشمنوں کی اہانت کی طرف رغبت تو ایمان کا لوازمہ ہے ؛ [1]

"جو کچھ خدائے قادرِ مطلق کی جانب سے اِس فقیر کے ذریعہ خادی خان اور یار محمد خان کی دار و گیر ہوئی ہے، اُس کی وجہ سے ان مجاہدین اور مہاجرین کو ظلم و ستم کرنے کا ملزم سمجھتے ہیں اور اُن باغیوں اور فتنہ پردازوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں ؛ [2]

مذکورہ اعلانات کے تحت علمائے اہلسنت اکٹھے ہو کر آئے۔ ان حضرات سے یا مشافہ گفتگو کی، مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عقائد کو غیر اسلامی ثابت کر کے انھیں توبہ پر مجبور کیا۔ موصوف نے دفع الوقتی کے لیے توبہ کر لی لیکن بعد میں پرنالہ اسی جگہ رکھا۔ اِس مناظرے کا تذکرہ محمد جعفر تھانیسری نے یُوں کیا ہے :

"صدہا مولوی اور عالم، کابل، قندھار اور سمرقند اور ماوراء النہر وغیرہ کے جمع ہو کر مقام پنجتار مسئلہ وجوب تقلید میں آپ سے بحث کرنے کو آئے تھے چنانچہ ایک ہفتہ تک یہ بحث رہی۔ آخر کار وہ سب مولوی لاجواب ہو کر عدم وجوب تقلید شخصی کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ شخص تو قرآن و حدیث کا حافظ اور محقق اور اِس میں غوطہ لگاتے ہوئے ہے، اِس سے کون جیت سکتا ہے۔ لیکن اِس فتح یابی کے باوجود سید صاحب نے مولوی محمد اسمٰعیل

---

[1] سعادت مرزا : ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۲۶

[2] ایضاً : ص ۲۲۰

صاحب نے فرمایا کہ یہ وقت ترکِ تقلید کا نہیں ہے۔ ہم کو اس وقت کفار سے
جہاد کرنا ہے، تقلید کا جھگڑا اٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں ہے۔"[1]
سید احمد صاحب کی فہمائش بجا اور بر موقع لیکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس
نعرے کا جو فیصلہ سنایا ہے وہ سمجھ بوجھ سے بالاتر ہے۔ اگر وہ صدہا علماء لاجواب ہو گئے تھے
یقیناً اُن میں سے کئے ہی دہلوی صاحب کی طرح منکرِ تقلید ہو جاتے۔ ہزاروں دُرّانی اور پٹھان
بیت قبول کر لیتے، اصل اختلاف مٹ جاتا اور جنگ و جدل والا معاملہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن
ا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی مغلوب اور تائب
نے، توبہ کرنا دفع الوقتی تھی ورنہ مذہب اہلسنت قبول کرنا مرتے وقت تک بھی منظور نہ
تھا۔ اس کے ساتھ ہی دُرّانیوں اور پٹھانوں نے ہرگز ہرگز ان کی خارجیت و وہابیت کو
ل نہ کیا بلکہ نفرت کی نگاہوں سے ہی دیکھتے رہے۔ اسی لیے جناب ابوالاعلیٰ مودودی کو یوں
یہ خوانی کرنا پڑی:

"یہی وجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد میں ان دونوں شہیدوں کا اور ان کے کام کا
کوئی اثر ڈھونڈے نہیں ملتا، حتیٰ کہ وہاں کے لوگ ان کے ناموں سے اب
کچھ اُردو لٹریچر کی بدولت واقف ہونے لگے ہیں۔"[2]

یرتِ ایمانی کچھ عجیب ہی خدائی عطیہ ہے، حالانکہ سید احمد صاحب نے خادی خان کے
ارثوں کو یوں تحریص دلائی تھی،

"نیز اُس (خادی خان) کے ورثا کو بھی اِس کی ترغیب دی کہ وہ آئیں
اور اطاعت قبول کر لیں، تاکہ تمہارے مورث کا مال تم کو دے دیا جائے لیکن
اُن اشقیاء نے امام کی اطاعت پر ہرگز سرِ تسلیم خم نہ کیا بلکہ انھوں نے بغاوت
اور فساد کے معاملہ میں اُن باغیوں کی تقلید کی۔"[3]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۱۱
[2] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۲۴
[3] ایضاً، ص ۲۲۴

یار محمد خاں کے ورثا، ساتھیوں اور فوجیوں کو تحریص دلانے میں کوئی کمی نہ کی۔ سکھ
یہ جانتے ہوئے کہ ان کے غیر اسلامی نظریات نہ صرف عوام بلکہ اجلّہ علمائے کرام تک
واضح ہو چکے ہیں اور وہ سب انھیں خارج المذہب شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مذہب
اہلسنت قبول کرنے یا مصلحت کی کوئی راہ تلاش کرنے کی بجائے سیاسی رشوت ہر کسی کے
سامنے پیش کرنے لگے۔ چنانچہ سید صاحب نے دُرّانیوں کو اپنے خط میں یوں لکھا

"بعض کلمہ گو منافقین نے کفار کی محبت اور خیر خواہی کو اپنے منافقت بھرے
دل میں جگہ دی ہے اور تمام مسلمانوں کی بدخواہی کو عام طور پر اور خاص کر
بڑے بڑے علماء کے دل میں مہاجرین اور مجاہدین کے حق میں اس قدر
عداوت پیدا کر دی ہے کہ ان کی نقصان رسانی کافروں کے نقصان پہنچانے
کے مقابلہ میں بہت زائد اور بے انتہا ہے اور ان کی عداوت اس حد تک
پہنچ گئی ہے کہ ایمان والوں کو جہاد قائم رکھنے سے باز رکھا ہے۔ لہٰذا جس
شخص کو اپنا ایمان عزیز ہے اور دین اسلام کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور حضرت
محمد رسول اللہ کو اپنا پیشوا جانتا ہے اور قیامت میں آنحضرتؐ کی شفاعت کا
امیدوار ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ خود کو مجاہدین کی صف میں شریک
کر دے اور غیرت ایمانی اور اسلامی حمایت کو کام میں لائے اور کافروں کی
خیر خواہی اور منافقوں کا ساتھ دینا چھوڑ دے اور اپنے دل سے ان دونوں
بدبخت جماعتوں کی محبت کو نکال دے اور مجاہدین کے لشکر میں منسلک ہو جائے
اور جو کچھ کافروں اور منافقوں کی رفاقت میں اس کو دنیوی فائدہ حاصل
ہوا ہے اس سے کہیں زائد مراتب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اس کو حاصل ہوں گے
اور دنیا و آخرت میں اس کو بزرگی اور سرخروئی حاصل ہو گی۔ غرض جو شخص
ایمان والوں کی شرکت کا ارادہ رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اس عاجز کو
اس سے اطلاع کر دے تاکہ صورتِ حال کا جائزہ لے کر اس کی گزر بسر کا
تعین کر دیا جائے۔"[1]

---

[1] سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۱۵

پشاور اور اس کے گرد و نواح کے مسلمانوں نے ان حضرات کی موافقت سے منہ موڑ لیا، ان کے نزدیک یہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی مہربان سرکار کی مملکت کی حدود کو وسیع کرنے کے لیے تھے وہ جہاد نہیں بلکہ مفسد نظر آ رہے تھے، مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں بلکہ مسلم کشی کا رواج قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا سید صاحب بھی علی الاعلان انھیں منافق اور واجب القتل قرار دے کر ان کے استیصال کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر ولایت خان خاقان خلجانی کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے یوں تحریر کیا تھا:

"بالخصوص جہاد کے نفاذ اور بغاوت و فساد کے فرو کرنے کے متعلق نیز اور بھی محبت و خلوص کی باتیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں اُن کو پڑھ کر دل کو بیحد سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا...... اگر اس طرف جناب اپنا فاتحانہ قدم اٹھائیں گے تو منافقین اور مفسدین فتنہ و فساد برپا کر دیں گے۔ لہٰذا نہایت مناسب اور مصلحت یہ ہے کہ ایسا کیا جائے کہ سب سے پہلے تو منافقوں کے استیصال کے متعلق انتہائی کوشش کی جائے اور جب جناب والا کے قرب جوار کے علاقہ میں ان بدکردار منافقین کا قصہ پاک ہو جائے تو پھر اطمینان خاطر اور دلجمعی کے ساتھ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مصلحت وقت یہی ہے کہ پہلے تو منافقین کے فتنہ و فساد کے دفعیہ کے لیے سخت کوشش فرمائیں۔ ان منافقین کے ساتھ جنگ کرنے اور فساد کو دور کرنے کی تدابیر کے متعلق خود جناب والا خوب جانتے ہیں اور لشکر کشی اور کشور کشائی کے فن میں بھی آپ کو کمال مہارت حاصل ہے، لیکن میری رائے میں مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ گو آپ کا دل ہیبت و جلال کا مرکز ہے۔ آپ اس بڑی مہم کے انجام دینے کے لیے بغیر کسی کی اعانت کے قدم نہ اٹھائیں۔ اگر منافقین کے استیصال میں جناب کی پیش قدمی سے فتنہ و فساد اور شورش کے بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر کسی کی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی فوج اور قبیلہ کو جمع کر کے جناب والا خود سرزمین کے نواح میں منافقین پر چھاپے مارنا شروع کر دیں اور اپنے ساتھیوں

میں سے بعض کو قبائل اور فوج کی کثیر تعداد کے ساتھ کابل کے اطراف متعین فرمائیں
تاکہ وہ بھی منافقین پر شب خون مار کر اس مقام کو تاخت و تاراج کریں۔ اور
میں بھی اِدھر سے پشاور کے منافقوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جب منافقین
بدکار کی موجودگی سے وہ مقام پاک ہو جائے تو میں جلال آباد پہنچ جاؤں گا اور
اسی طرح پھر وہاں سے کابل جاؤں گا۔ اِس طرح مردود منافقین جو پشاور سے
قندھار تک پھیلے ہوئے ہیں اُن کے پاؤں ایسے اکھڑ جائیں گے اور ہر شخص جو
اپنے خیال میں خود گرفتار ہے بے دست و پا ہو کر آپس میں ایک دوسرے کی
مدد نہیں کر سکے گا اور اُن کا باہم اتحاد اور اجتماع دشوار ہو جائے گا۔ اگر جناب والا
اس سلسلے میں اپنے استقلال کو شورش اور فساد کا باعث تصور فرمائیں اور
یہ گمان ہو کہ دُرّانی قوم اپنی قومیت و ریاست باہمی کے اتحاد کی وجہ سے [illegible]
قبائل کے ساتھ جمع اور جناب سے مقابلہ پر متحد ہو جائے گی، تو پھر اس بات کی
ضرورت ہوگی کہ اُن کے سرداروں کو اپنے ساتھ شریک کر دیا جائے اور [illegible]
سلطنت سے امداد بھی طلب کر لینی چاہیے۔"[1]

ایک مسلمان حکمران کو دوسرے مسلمانوں کے خلاف کس جوش و جذبے سے ابھارا
مسلم کشی کا بھوت کس بُری طرح سوار ہے کہ خان قلات جو ان حضرات کے [illegible]
بے خبر اور انھیں اسلام و مسلمین کا خیر خواہ سمجھ بیٹھا تھا۔ موصوف نے اِس صورتِ حال
آشنا نہ ہوتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں یوں جھوٹے الہاموں اور تحریصوں کی دھول جھونکی

"ہم پر لازم ہے کہ جان و مال، بھائی بندوں اور اوطان کی محبت کو پسِ پشت
ڈال کر حق تعالیٰ کی رضامندی کو اپنی ہمت کا قبلہ بنائیں اور دینِ متین کی تائید کی
نیت سے پروردگارِ عالم کے کلمہ کی اشاعت کے لیے کمر ہمت باندھیں اور [illegible]
کے لشکر میں شامل ہو کر معرکۂ جنگ و قتال میں خود کو دھکیل دیں۔ انشاء اللہ

---

[1] مخاورت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۴۷، ۴۸

تعالیٰ اس سلسلے میں بموجب کلام الٰہی جس کا وعدہ سچا ہے، فتوحات کے دروازے کھل جائیں گے اور ان اشرار و کفار منافقین کے بے شمار خزانوں، ملک و مال اور شہروں پر ضرور بالضرور قبضہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن ان تمام دنیاوی چیزوں اور مادی منافع پر جہاد کا ہرگز دارومدار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ جہاد کے لیے بلند ہمتی سے کام لینا چاہیے۔ پس جس وقت آپ اس نیت پاک سے خود کو مجاہدین کی جماعت میں منسلک کرلیں گے تو بلاشبہ اللہ کے لشکر میں آپ کا شمار ہوگا اور اللہ کے سچے وعدے کے مطابق فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ و معروض یہ ہے کہ اس فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے وارد ہونے والی روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعہ جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے اور چونکہ الہامی وعدے اس بادشاہ حقیقی کے کلام کے مطابق ہوا کرتے ہیں اس لیے ان کو ضرور مان لینا چاہیے اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔"[1]

یہ اعلان سید صاحب اور اُن کے متبعین نے الہام کے نام سے بارہا کیا۔ ان الہاموں اور فتح کی بشارتوں کا جو انجام ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے کہ فتح و نصرت کے بجائے آپ کو شکست اور عبرت ناک ہزیمت کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہو سکا۔ اوّل سے آخر تک سارے الہامات جھوٹے ثابت ہوتے گئے۔ موصوف کے سچے ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ جملہ دعاوی و الہامات اور بزرگی و کرامات سے دست بردار ہو کر صاف طور پر اقرار کر لیا جائے کہ یہ الہامات خدا کی طرف سے نہیں بلکہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہو رہے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان حضرات کے لیے حقیقت کا تسلیم کر لینا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کتنے ہی دعاوی و الہامات جھوٹے ثابت ہوتے لیکن بزرگی پر حرف نہ آیا، مسلمانوں ہی کو چلنے گئے تھے لیکن انھیں

---

[1] مستفاد من ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۴۹، ۵۰

مسیحائے آرم بنانا اور منوانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت سید احمد صاحب نے فرزند جنگ بہادر کے نام اپنے خط میں لکھا تھا،

"آپ اپنے ایک فاتح لشکر کو اس طرف روانہ فرمائیں اور مجاہدین کی اعانت کے لیے کمر ہمت باندھ کر خزانہ کھول دیں تاکہ جناب والا کی شرکت پروردگار عالم کے دین کا پرچم بلند کرنے، کافروں اور تہام لگانے والوں کا استیصال کرنے کے متعلق اچھی طرح منظر عام پر آجائے اور آیت کریمہ فضل اللہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین کی بے عدالت اور مرتبہ آپ کو حاصل ہو جائے، جس طرح کہ اس دنیا کی ریاست اور امارت میں بنی نوع انسان ممتاز ہیں، اسی طرح جنت نعیم کے مدارج عالیہ اور مقام صدق پر اس صاحب بخشش وکرم کے سایہ میں آپ کو فرزند ناز ہو۔ اللہ نے چاہا تو کلام الٰہی کے سچے وعدوں کے مطابق کہ فرمایا ہے" کان حقا علینا نصر المومنین —— وان تنصر اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم نیز غیبی اشاروں اور بشارتوں کے بموجب، جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، جس کی اس فقیر کو بشارت دی گئی ہے عنقریب فتح ونصرت ظہور پذیر ہوگی اور بے شمار خزانے ذلیل وخوار کافروں (مسلمانوں) کے شہروں سے لے کر دریائے تیلح یکمت نیک لوگوں کے قبضہ میں آجائیں گے۔"[1]

یار محمد خاں کے معتمد ومتوسل یعنی احمد خاں ابن لشکر خاں کے نام سید صاحب نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے ؛

"جب تک ان (مسلمانوں) کا ملیا میٹ کرنا متحقق نہ ہو اس وقت تک کافروں اور دشمنوں کے خلاف جہاد کی کوئی صورت نہیں اس بنا پر اس عاجز، خاکسار، ذرۂ بے مقدار نے چند نیک مہاجرین کے ساتھ بموجب حکم خداوندی یا ایہا

---

[1] سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۱۲، ۲۱۳

السعی صاحب انگفاس والمنافقین الخ جو قابلِ تعمیل ہے ہم نے کمر باندھ لی ہے اور موضع پنجتار تک پہنچ گئے۔ اللہ نے چاہا تو اُس بادشاہ جبار اور مالک و قہار کے دبدبہ و قوت سے اِن تمام بدکردار منافقوں کی شان و شوکت آسانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں خاک میں مل جائے گی انشاء اللہ آپ اُس قادرِ مطلق کی قدرت کا تماشا ملاحظہ فرمائیں اور منافقوں کے ساتھ رواداری کو پروردگارِ عالم کی خاطر اور رضا جوئی پر قربان کر دیں۔ جو کچھ اِس زمانہ کے سردار دنیوی فائدوں کے حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں اُس سے دُگنی توقع اُس شہنشاہِ حقیقی سے جو دونوں جہان کا خالق ہے، توقع رکھنی چاہیے۔ بارگاہِ الٰہی سے قوی امید ہے کہ آپ دل جمعی کے ساتھ یکسو ہو کر دینِ متین کے معاونین میں منسلک ہو جائیں گے تو آپ کو دنیاوی فوائد بھی اِس قدر حاصل ہوں گے جو وہم و خیال میں بھی نہیں آ سکتے ۔"[1]

جہاں مقصود اعلاء کلمۃ الحق ہوتا ہے وہاں مادّی ترغیب و تحریص کا ایسا سیاسی جال بچھانے کی ہرگز کوشش نہیں کی جاتی۔ سید صاحب نے جس قسم کا جال مسلمانوں کے خلاف بچھایا خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو قتل کروانے کی کوشش کرتے رہے اور اِس طرح ترغیب و تشویق دنیا سے دنی سے اپنی حمایت کا دم بھرنے والوں کو مسلم کشی پر اُبھارنے کی نظیر محمد بن عبد الوہاب نجدی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ نجدی صاحب نے امیر عیینہ کو اپنی تحریکِ وہابیت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا:

"اگر تم لا الٰہ الا اللہ کی امداد کے لیے آمادہ ہو جاؤ تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمھیں غالب کرے گا اور نجد اور اہلِ نجد کی باگ تمھارے ہاتھ میں ہو گی۔"[2]

اسی طرح محمد بن سعود امیرِ درعیہ کو تحریکِ وہابیت کا معاون بننے کی دعوت دی تو امیر

---

[1] غلام رسول مہر / مرزا، ترجمہ مکتوباتِ سید احمد شہید، ص ۱۴۱

[2] مسعود عالم ندوی، محمد بن عبد الوہاب نجدی، ص ۴۳

مذکور نے دو شرطیں عائد کیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ فتح کے بعد آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑنا اور دوسری شرط یہ تھی کہ اہلِ درعیہ سے وہ فصل کے وقت کچھ محصول لیا کرتے تھے اس سے نہ روکا جائے۔ ابن عبدالوہاب نے دونوں شرطیں منظور کیں۔ دوسری شرط کو اس نے جن لفظوں میں منظور کیا وہ تحریر یوں منقول ہے:

"رہی دوسری شرط، سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائیگا کہ اس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔" [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی یہ تحریک جسے وہابیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسی کے زیرِ اثر شروع کی گئی تھی۔ ان حضرات نے بھی مسلمانوں کو مشرک اور منافق ٹھہرا کر انہیں مستحل الدم قرار دیا، ان کے قتل و قتال سے لطف و لذت حاصل کرتے رہے۔ ان کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر لوٹتے رہے، جس طرح ان سے پہلے محمد عبدالوہاب نجدی کرتا رہا تھا۔ اگر ان برطانوی مجاہدوں سے کوئی کہتا کہ آپ مسلمانوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں تو جواب یہی دیا جاتا کہ ہم تو مشرکوں اور منافقوں کو قتل کرتے ہیں، مسلمانوں کی جان و مال میں تو ہم ذرا بھی دست اندازی کرنا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے اُن کی اُن کے ہم عقیدہ خارجی لوگ تھے یا وہ حضرات جو اس جنگ جوئی میں اُن کے معاون و مددگار بن گئے تھے۔ ابن عبدالوہاب پر جب مسلم کشی کا الزام لگایا جاتا تھا، تو وہ بھی یہی جواب دیا کرتا تھا۔ مخدومی پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ہندی و نجدی خوارج کے اس مفسدانہ طرزِ عمل کے بارے میں کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہیں؟ شاید لاکھوں میں معدودے چند ہوں تو ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخِ اسلام میں اس قسم کے بہت سے روح فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا ہے"

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۱۰

مگر یہاں ذکر اُس شخص کا ہے جو پیغمبرانہ آن بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف
دعوت دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرانہ صفات کو تلاش کیا جائے
اور اُسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔
پیغمبرِ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ
کے خلاف آمادۂ پیکار رہے مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے۔ [1]

یہاں پر طاغوتی مجاہدوں کا منصوبہ یہی نہیں تھا کہ مسلمان خوانین و رؤسا سے دوسرے مسلمانوں
کی گردنیں کٹوائی جائیں اور اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کروایا جائے بلکہ یہ
حضرات خود بھی پشاور اور اُس کے گردونواح کے اہلِ اسلام کو ختم کرنے کا عزم بالجزم کر چکے تھے
چنانچہ سید صاحب نے شہزادہ کامران کو خط لکھتے ہوئے وضاحت کر دی تھی کہ،

"چونکہ منافقوں اور فساد برپا کرنے والوں نے سرکش کفار کی حمایت پر کمر باندھ
لی ہے اور مجاہدین سے دشمنی برت رہے ہیں، اس لیے اُن کی گوشمالی اور
کفر و فساد کے خلاف جہاد کی مہم کا چلانا ضروری ہے، اسی بنا پر میں نے تمام
مجاہدین کو منافقین کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ترغیب دی ہے۔" [2]

۵ محرم ۱۲۴۲ھ کے مکتوب بنام ملک فیض اللہ خاں میں سید صاحب نے یوں
وضاحت کی تھی:

"جنابِ والا جیسے روشن دماغ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عزمِ نہانی کا اشارہ
اس عاجز کی پشاور آمد کی طرف ہے تاکہ مجاہدین ہندوستان کو منافقین کے
گروہ سے اور دشمنوں اور شقی صفت اشخاص کے روڑوں اور کانٹوں سے
پاک صاف کر دیں اور یہ معاملہ تو ہرگز کوئی ایسا پوشیدہ راز نہیں ہے بلکہ میں نے
تو اس کو ملا میر عالم اخوند زادہ سردار سلطان محمد خاں کے وکیل کے رو برو علی الاعلان

---

[1] محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواخذہ مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷، ۱۷
[2] سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۹۵

کہا ہے اور اس معاملہ سے متعلق نہ تو کوئی بات پوشیدہ کہی اور جناب کے مہربانی نامہ کے جواب میں اشارتاً کچھ کہا۔ البتہ میں نے کوئی مدت مقرر نہیں کی ہے یعنی یہ کہ کس وقت اس مہم کو سرانجام دیا جائے گا اور اس عبادت کی کس لمحہ اور گھڑی کوشش کی جائے گی، کیونکہ ہر کام کا تعلق اس قادرِ مطلق کے ہاتھ ہے۔ بہرحال میں کچھ ایسا ہی ارادہ رکھتا ہوں۔"[1]

سردار امیر عالم خان باجوڑی کو مطلع کرتے ہوئے سید صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں یوں تحریر فرمایا تھا:

"اب صورت یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ جہاد کرنا بحکم مقدمۃ الواجب، ایک واجب معاملہ ہے، اس لیے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر پشاور اور قرب و جوار سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجتار تک پہنچ گیا ہے اور اس زبردست حاکم برحق کے فرمان عالی شان کے بموجب جس کا ذکر کلام موثق یعنی کلام اللہ میں ہے کہ جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم۔ ہم نے کمر ہمت باندھ لی ہے ...... شہر مذکور کی طرف چل پڑے ...... سرکش کفار، منافقین اور خسارہ اٹھانے والوں کے استیصال کی حتی الوسع جدوجہد کریں گے۔"[2]

اپنے ایک خط میں سید صاحب سلطان محمد خان کو مسلم کشی کی اطلاع دیتے ہیں اور اس صورتِ حال سے بے خبر حکمران کو اس حرکتِ قبیحہ میں شمولیت کی کیسے پُراسرار انداز میں ترغیب و تحریص دیتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی غرض سے یوں وضاحت کرتے ہیں:

"اس مختصر عرصہ میں ضلع سوات، بنیر، مہمند، خلیل، خلیانی اور دُرّانی کے تمام مسلمان اور پشاور کے رہنے والے اور اس شہر کے امراء کے تمام فوجی سپاہی

---

[1] سعادت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۱۰۳

[2] ایضاً: ص ۱۳۵، ۱۳۶

نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ پائندہ قبیلے کی دولت اور اُن کی شان و شوکت
کو پامال کیے بغیر ہرگز ہرگز جہاد کا دروازہ کھلنے والا نہیں ہے۔ اُنھوں نے اس
فقیر کو اِسی بات کی ترغیب دی ہے کہ ماہ رمضان المبارک گزر جانے کے بعد
بدبخت منافقوں کے استیصال کی طرف توجہ کریں، یعنی شہر پشاور کو ان منافقوں
کی گندگی سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ چنانچہ اِس بات کو اس فقیر نے نیز
تمام ایمان والوں نے بہت پسند کیا۔ لہٰذا رمضان شریف کے گزر جانے کے انتظار
میں ہم سولت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جونہی مبارک ماہ مذکور ختم ہو جائے گا تو غازیوں
کی تیاری کا وقت پہنچ جائے گا۔ اِس معاملہ میں بظاہر ملاقات جسمانی کے لیے
فی الحال بعض اعتراضات مانع تھے لیکن ایک وجہ سے ملاقات کا بیحد اشتیاق
پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اِس فقیر کے پُرخلوص دل کا منشاء تھا کہ آپ جیسے برادر عزیز کو
بھی دونوں جہان کی دولت اور ہمیشہ کی سعادت میں اپنا شریک حال بناؤں
اور آپ کو بھی طرح طرح کی ترغیب اور تحریص دلا کر اِس عظیم الشان مہم کو
انجام دینے کے لیے کشاں کشاں لے آؤں، تاکہ اگر آپ اس عظیم مہم میں بنفس نفیس
شریک ہو جائیں تو اِس سے بڑھ کر آپ کی کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ البتہ
چار و ناچار آپ کو اِس بات پر آمادہ کرتا ہوں کہ اپنے لشکر ظفر پیکر سے
تھوڑی فوج اور مجاہدین کے لیے اپنے حسبِ استطاعت کچھ مصارف اِس
عاجز کے پاس بھجوا دیں۔"[1]

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کیا کسی ہستی نے مصلح کا روپ دھار کر
مسلمانوں کو ختم کرنے اور اُن کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کی اتنی منظم کوشش کبھی کی تھی؟
قیناً تاریخ اِس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ مسلم کشی کی غرض سے اور مسلمانوں کے شہروں پر
قبضہ کرنے کی خاطر خود مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر کے، ایک کو غازی و مجاہد

---

[1] سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۰۸، ۲۰۹

اور دوسرے کو مشرک و منافق ٹھہرا کر، اُن میں کشت و خون کرانے کا پارٹ اِس انداز میں کسی اور نے بھی ادا کیا تھا؟ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اِس میدان میں اِن حضرات کا حریف کوئی نہیں لیکن جہاں مزارات کے منہدم کرنے اور قبہ شکنی میں ابنِ عبدالوہاب کا نظیر کوئی نہیں یہی طرح مسلم کشی میں اِن حضرات نے ایک نیا ہی عالمی ریکارڈ قائم کر دکھایا تھا۔ کاش! مسلمانوں کو مشرک اور منافق قرار دے کر، اُنھیں مستحل الدم ٹھہرانے والے، اُن کے جان و مال اور ننگ و ناموس سے کھیلنے والے کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے کہ: ؎

بُت توڑنا تو فرض ہے، لیکن یہ شرط ہے
دِل میں بھی جھانک، اِس میں کوئی بُت چھپا نہ ہو

اِن حضرات کے جہاد کی کہانی تو کچھ اسی قسم کی ہے لیکن بُرا ہو سیاسی مصالح اور بعض ہستیوں کو ارباباً من دون اللہ بنا لینے کا۔ کہ بعض ایسے حضرات جو تحقیق کے علمبردار کہلاتے ہیں اور کسی بڑی سے بڑی ہستی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے، جب وہ اپنے اکابر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو اُن کی ہر بھونڈی سے بھونڈی ادا، ہر گندے سے گندا فعل، ہر بُرے سے بُرا عقیدہ، ہر مضر سے مضر اقدام بھی دل موہ لینے والا قرار پاتا ہے۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی تحریکِ جہاد کے بارے میں جناب ابوالاعلیٰ مودودی یوں رقمطراز ہیں:

"انھوں نے اِتنے وسیع پیمانے پر، جو اُنیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے پُر سر تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی اور اِس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبّر کے ساتھ آغازِ کار کے لیے شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا، جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اِس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہو سکتا تھا۔ پھر اِس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانینِ جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے اور اِس طرح انھوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں رُوحِ اسلامی کا مظاہرہ کر دیا۔ اُن کی جنگ، ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض

کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ اُن کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظامِ حکومت قائم کریں جو خالق اللہ مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ لڑے تو حسبِ قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمامِ حجت کر کے تلوار اٹھائی، اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل اُن سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مُصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔"[1]

موصوف کے یہ جملہ دعاوی اُن کی اسمٰعیل پرستی کی بنا پر بغیر کسی تحقیق و ثبوت کے ہیں۔ سید صاحب موصوف کے ان بیانات کی تائید و تصدیق کرنے سے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا طرزِ عمل اور خود وہابی حضرات کی تاریخیں قاصر ہیں۔ ان حالات میں راقم الحروف انصاف کا اس طرح خون کرنے والوں کے متعلق یہی کہہ سکتا ہے کہ:

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا
ہم اُلٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا

یہاں تک بیان اس امر کا تھا کہ ان حضرات نے مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے اور انھیں مستقل الدم قرار دینے کی غرض سے کیسے کیسے غیر اسلامی اور چنگیز خانی بہانے تلاش کیے۔ اب ان لوگوں کی مسلم کشی کے چند واقعات پیش کرتا ہوں۔ قلعہ ہنڈ پر قبضہ کرنے اور خادی خان کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی نے یوں تصریح کی ہے:

"ابھی صبح کی پو پھٹی تھی کہ آپ (مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی) قلعہ ہنڈ کی دیواروں کے نیچے جا پہنچے۔ کل ڈیڑھ سو آدمی ساتھ تھے اور باقی ماندہ (ساڑھے پانچسو) پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ نے خاموشی سے بارہ بندوقچیوں کو بھیج دیا کہ تم دروانہ

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی و لیڈر، تجدید و احیائے دین، ص ۱۱۵، ۱۱۶

کے پاس اس ٹیلہ کے پیچھے چھپ کے کھڑے ہو جاؤ۔ جونہی دروازہ کھول کر
قلعہ میں سے لوگ نکلیں اور شہر کی طرف جانے لگیں، تم فوراً قلعہ میں گھس جانا اور
اُنھیں گولیاں مار دینا۔ بھاگتے ہوؤں کو روکنا نہیں، مقابلہ کرنے والے کو
تہ تیغ کرنا۔ ابھی بہت روشنی نہ ہوئی تھی، نسیم سحری طفلانہ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی
چل رہی تھی اور خادی خان کو خبر دے رہی تھی کہ تیرا یہ خواب نوشیں زہرآلود ہے
مگر وہ کچھ اپنے قلعہ کی مضبوطی میں ایسا مخمور تھا کہ اُسے نسیم سحری سے چوروں کی
اطلاع کی بھی ذرا خبر نہ تھی۔ جونہی مولانا شہید نے بندوقوں کی آواز سنی، آپ
بھی فوراً بندوق چھتیائے ہوئے سپاہیوں کے داخل قلعہ ہوئے، ہتھیار
اُٹھانے کی بھی فرصت نہ دی اور سب کو خوف دے کر باہر نکال دیا۔ قلعہ کے
دوسرے حصہ میں خادی خان سوتا تھا۔ ٹھائیں ٹھائیں بندوقوں کی آواز ہوئی
اور لوگوں کا غل سنائی دیا تو بے خبر رئیس ہڑبڑا کے اٹھا اور پریشان باہر
نکل آیا۔ دیکھا تو گل ہی اور کھلا ہوا ہے۔ فوج کے سرداروں کو ڈراؤنی صدا
میں پکارا۔ وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے کے زینہ سے قلعہ کی چھت
پر چڑھ گیا اور وہاں سے غل و شور مچانا شروع کیا۔ سراسیمہ اِدھر اُدھر بھاگتا
پھرتا تھا۔ آخر ایک مسلمان کی گولی نے اُسے تخت بجرے سے بٹھایا۔"[1]

یار محمد خان حاکم یاغستان سے معرکہ آرائی کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یوں رقمطراز ہیں:

"مولانا شہید گھوڑے پر سوار تھے اور دو سو آدمی اور بھی آپ کے ساتھ قدم بقدم
علاوہ چار سو پیدلوں کے آ رہے تھے۔ مولانا شہید کی پہلی نظر بیک توپوں پر لگ
رہی تھیں۔ آپ سب سے پہلے اُن ہی پر جا پڑے۔ گولہ انداز نے متابی کو
روشن کرکے چاہا کہ پہلے مولانا کو اُڑا دوں کہ مولانا نے تلوار کا چھرّی سے وار
کرکے اُس کی گردن اُڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے
فوراً وہ دونوں توپیں دُرّانیوں کی طرف پھیر کے فیر کرنے شروع کیے۔ ایک

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۲، ۲۳۳

وفادار ہندو، جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام) گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اُس نے اس قدر پھرتی سے گولہ اندازی کی کہ دُرّانیوں کے پیر اُکھڑ گئے۔ اُدھر مولانا شہید اُن پر گر پڑے۔ تکبیروں کی آوازیں خوب زور شور سے بلند ہو رہی تھیں۔ بھلا اب دُرّانی کیونکر میدان میں ٹھہر سکتے تھے؛ اپنا کُل سامان چھوڑ کے بھاگے۔ جب وُہ فرار ہو رہے تھے، سیّد صاحب بھی اُن پر آ پڑے۔ جتنے دُرّانی مارے گئے ان کی تعداد ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں، ہاں جن مُردوں کو وُہ میدان میں چھوڑ گئے تھے، وُہ چار سو سے زیادہ شمار ہیں ستھے۔ مولانا شہید کی فوج کا ایک آدمی بھی زخمی نہ ہوا۔" [1]

یار محمد خاں کی فوج کے چھٹے مال کو مالِ غنیمت قرار دے کر ان بریلوی مجاہدوں نے ہضم اس کی مکمل تفصیل تو کسی سوانح نگار نے بیان نہیں کی۔ بعض اشیاء کی فہرست جناب غلام رسول مہر کی زبانی ملاحظہ ہو:

"مولانا نے مالِ غنیمت جمع کرایا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں۔ ایک ہاتھی، ساٹھ ستّر اُونٹ، کچھ کم تین سو گھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاہینیں، تلواروں اور بندوقوں کا شمار نہ تھا۔ ملکی لوگ جو مال اٹھائے لیے جا رہے تھے اُسے حُسنِ تدبیر سے واپس لیا۔ بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جُوتے بھی چھوڑ گئے تھے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں، منوں خشک میوہ موجود تھا۔" [2]

خادی خان اور یار محمد خاں کو ٹھکانے لگانے کے بعد مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے زواری کے ساتھ مسلمانانِ سرحد کو بزورِ شمشیر زیر کرنے کا ایک پروگرام بنایا اور سیّد احمد صاحب سے منظوری لے کر اس پر یُوں عمل کیا گیا:

"پائندہ خاں سے مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تو قاضی سیّد محمد حبان نے یہ

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۶

[2] غلام رسول مہر، سیّد احمد شہید، ص ۵۲۶

تجویز پیش کی کہ علاقہ سمہ میں سرکشی کے آثار نمودار ہیں۔ جن لوگوں نے خود بخود ادائے عشر کا اقرار کیا تھا، وہ بھی بے پروا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کچھ لشکر میرے ہمراہ کر دیں تو میں وعظ و نصیحت سے سارے اہلِ سمہ کو حلقہ بگوش بنا دوں۔ جو نہ مانیں انھیں بزور راضی کروں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیے جائیں، اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں اور اپنے اہلِ وطن کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں، ایسا آدمی یہاں کوئی اور نہیں۔ مولانا شاہ اسمٰعیل کو میرے ساتھ کر دیں تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسول کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو مولانا روک دیں۔ سید صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔"[1]

اس پروگرام کے مطابق سب سے پہلے موضع کھلاوٹ پر فوج کشی کی گئی۔ جناب غلام رسول مہر نے یہ کارنامہ یوں بیان کیا ہے:

"کھلابٹ سے ایک کوس پر نماز ظہر ادا کی۔ جب بستی پاؤ کوس پر رہ گئی تو قاضی صاحب نے حکم دیا کہ سب ٹھہر جائیں۔ پھر رسالدار عبد الحمید خاں سے کہا کہ آپ یہاں تیار کھڑے رہیں، ہم پیادوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، جب ہماری طرف سے بندوق چلے تو فوراً باگیں اٹھا کر بستی کی جنوبی سمت سے حملہ کر دیں۔ قاضی صاحب نے شمالی سمت میں ایک ٹیلے پر زنبورک لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ اس اثنا میں رسالے کے ایک سوار کو پیشاب کی حاجت ہوئی، وہ اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھا، گھوڑے کی باگ پاؤں کے نیچے دبا کر پیشاب کے لیے بیٹھ گیا۔ دفعتہً گھوڑا بدکا اور اس کی باگ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ رسالدار نے آواز دی کہ لینا جانے نہ پائے۔ دو دو چار چار سوار اس کے تعاقب میں نکلنے لگے

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۵۹۶

قاضی صاحب نے سمجھا کر سواروں نے ہلہ بول دیا، چنانچہ اُنھوں نے بھی گولہ باری چھوڑ کر حملہ کر دیا۔ اِس طرح ایک معمولی سا واقعہ کامیاب یورش کی شکل اختیار کر گیا۔ پیادہ فوج بستی میں داخل ہوگئی۔ سرداروں کا مقابلہ صرف دو آدمیوں نے کیا اور دونوں مارے گئے۔ غازیوں میں سے کسی کے چرکہ بھی نہ لگا اور کھلابٹ فتح ہوگیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں مقابلے کے لیے پانچ ہزار آدمی فراہم تھے۔" [1]

اِس کے بعد مرغز، ٹھنڈ کوئی، کڑا اور پنج پیر پر جوشِ ملک گیری میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے گئے۔ اِن سرگرمیوں کی کہانی وہابیوں کے مورخ نامدار، عالیجناب غلام رسول مہر کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"کھلابٹ کے اصلی خان (یعنی سردار) ابراہیم خاں اور اسمٰعیل خاں تھے۔ قاضی صاحب نے ابراہیم خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا، چار سوار اُس کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اسمٰعیل خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور مرغز پہنچے، جو کھلابٹ سے ایک میل پر تھا۔ مرغز کے لوگ مجاہدین کے آنے کی خبر سُنتے ہی مطیع ہوگئے۔ وہاں جس غاصب نے خانی پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھاگ گیا۔ قاضی صاحب نے مرغز کو وہاں کے اصلی خان، سرفراز خاں کے حوالے کر دیا۔ چار سوار اُس کی حفاظت کے لیے بھی چھوڑے اور خود ٹھنڈ کوئی کی طرف روانہ ہوگئے۔ ٹھنڈ کوئی اور اُس کے بعد کڑا میں بھی مرغز کی سی صورت پیش آئی، یعنی دونوں بستیوں کے لوگوں نے بے چون و چرا فرمانبرداری کا عہد کر لیا۔ مغرب کی نماز قاضی صاحب نے زیدہ اور کڑا کے درمیان ایک نالے پر ادا کی اور وہیں مع لشکر ٹھہر گئے۔ اِسی جگہ پنج پیر کے خان نے خود آکر اطاعت کا اقرار کیا۔ اِس طرح ایک دن میں کھلابٹ، مرغز، ٹھنڈ کوئی، کڑا اور پنج پیر زیرِ فرمان آگئے۔" [2]

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۵۹۸، ۵۹۹

[2] ایضاً، ص ۵۹۹

اب قلعۂ ہنڈ کی فتح کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :

"ہنڈ وہاں سے قریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں اپنے سوار اور چار ضرب زنبورک لے کر ہنڈ چلا جاؤں۔ اگر حالات سازگار دیکھوں گا تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ صبح کے وقت آپ بھی پیادوں کو لے کر آجائیں۔ اگر دیکھوں گا کہ ٹھہرنا مناسب نہیں تو چلا آؤں گا۔ دونوں اور قاضی صاحب دونوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا چنانچہ رسالدار بے توقف اُدھر روانہ ہو گیا۔ جب ہنڈ ایک گولی کے فاصلے پر رہ گیا تو چند گھوڑے زور سے ہنہنائے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے چاروں بُرجوں پر اتنی روشنی ہوئی کہ ارد گرد کی ہر شے دُور دُور تک صاف نظر آنے لگی۔ رسالدار نے سواروں کو وہیں روک دیا پھر آہستہ آہستہ انھیں جنوبی سمت میں تالاب کے کنارے کی اوٹ میں پہنچا دیا۔ وہاں زنبورک لگا کر قلعے پر چار پانچ گولے پھینکے۔ بعد ازاں سارے سوار قاضی صاحب کے پاس لشکر گاہ میں پہنچ گئے صبح صادق نمودار ہوئی تو دو آدمیوں نے آکر یہ خوشخبری سُنائی کہ ہنڈ خالی پڑا ہے، آپ قلعے کے انتظام کے لیے وہاں تشریف لے چلیں، پھر ایک ملا آیا اور اُس سے ہنڈ کے تخلیے کی تصدیق ہو گئی" ؎

اب ہوتی مردان کی فتح کی کہانی، جناب غلام رسول مہر کی زبانی سُنیئے اور اِس جہاد کا رنگ رُوپ دیکھیے :

"ہوتی مردان کے رئیس احمد خاں کو بھی بلایا گیا۔ اُس کی طرف سے جواب آیا کہ آٹھویں روز ملاقات کروں گا۔ قاضی صاحب نے سمجھا کہ شاید اُسے کوئی ضروری کام ہو گا۔ اِسی اثناء میں گوجر گڑھی کے ایک غازی اخوند خیر الدین آئے اور بتایا کہ احمد خاں اپنے بھائی رسول خاں کو نائب بنا کر خود دُرانیوں سے

؎ غلام رسول مہر: سیّد احمد شہید، ص ۵۹۹، ۶۰۰

فوجی مدد لینے کے لیے پشاور چلا گیا ہے۔ دو تین روز میں پے در پے اس خبر کی
تصدیق ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان حالات میں مردان کو بزور
مسخر کر لینے کے سوا چارہ نہیں۔ چنانچہ سب کے مشورے سے مردان پر
پیش قدمی کا فیصلہ ہو گیا۔" ۱؎

"مردان پر حملے کے لیے تیاری کا حکم دینے کے بعد قاضی سید محمد حبان نے
دو ملکی آدمیوں کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ خبر لائے کہ ہوتی
کی گڑھی میں بیس پچیس اور مردان کی گڑھی میں تیس چالیس آدمی ہوں گے رسول خان
موجود ہے اور احمد خان پشاور گیا ہوا ہے۔ حملے کا اس سے بہتر موقع اور کیا
ہو سکتا تھا؟ اگر انتظار کیا جاتا تو درانیوں کا لشکر آ جاتا۔" ۲؎

"رہبروں کو آگے بھیج دیا تاکہ وہ پورے حالات دیکھ کر مزید خبر لائیں اور بسم اللہ
کہہ کر قدم آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ جب ہوتی آدھ کوس پر رہ گیا تو
مخبروں کا انتظار کرنے لگے۔ بستی میں نقارہ زور سے بج رہا تھا۔ لوگوں کا شور
و غل بھی سنائی دیتا تھا۔ غازیوں کے گھوڑے بدستور ہنہنا رہے تھے۔ اسی
اثنا میں مخبر خبر لائے کہ ہوتی کی گڑھی سے گولی کی زد کے فاصلے پر بسمت جنوب
کھلیان ہیں، وہاں چالیس پچاس آدمی بندوقیں لیے بیٹھے ہیں۔ بستی کے دروازے
پر بھی کافی جمعیت ہے۔ البتہ گڑھی سے مغربی سمت کا میدان خالی ہے اور شمالی
سمت میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ قاضی صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے
کہا کہ آپ جیش کو لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں۔ رسالدار عبدالحمید خان کو
حکم دیا کہ سواروں کو لے کر مغربی جانب کے میدان میں پہنچ جائیں۔ جب
کھلیانوں کی سمت سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہوئے بستی پر

ام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۶۰۱، ۶۰۲

ایضاً، ص ۶۰۴

حملہ کر دیں۔ خود دروازے کا قصد کیا، جہاں دشمن کی بھاری جمعیت کی اطلاع ملی تھی۔ ملکیوں کو قاضی صاحب نے صفِ اوّل میں رکھا اور ہندوستانیوں کو صفِ دوم میں۔ دُعا کے بعد تینوں جیش اپنے اپنے مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔" [1]

"مولانا نے رسالدار عبد الحمید خاں کو حکم دیا کہ چالیس پچاس سواروں کو بستی میں بھیج دیجیے۔ وہ گھوڑے چھوڑ دیں۔ شاہینیں لے کر پیدل چلیں اور شاہینوں سے گڑھی کے بُرجوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ گڑھی مردان کے جو بُرج تھے سب پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ دو شاہینیں صرف اس بُرج کے خلاف لگائی گئیں جس کی گولیوں سے قاضی سید حبان اور دوسرے غازی شہید ہوئے تھے۔ بہرحال شاہینوں نے دشمن کا عزمِ مزاحمت مضمحل کر کے رکھ دیا۔ گڑھی کے پانچ بُرجوں پر خاموشی چھا گئی، صرف ایک باقی رہ گیا، جس سے گولیاں آ رہی تھیں۔ اس اثنا میں لعل محمد قندھاری اس بُرج کے نیچے پہنچ گئے اور بآوازِ بلند پشتو میں پکارے: " اندر پائی راوڑا ــــــ اندر پائی راوڑا " یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔ حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سُن کر بُرج والوں پر ہراس طاری ہو گیا اور اُنھوں نے امان کی درخواست پیش کر دی۔ قرار داد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دیے، پھر ایک ایک کر کے اُتر آئے۔" [2]

جنگِ مایار کے بعد بعض دُرّانی ہوتی مردان میں جمع ہو گئے تھے جن کی وجہ سے یار محمد خاں پر سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کا وہاں سے قبضہ اُٹھ گیا تھا۔ بھلا یہ حضرات اپنے جیتے جی کس طرح یہ صورتِ حال برداشت کر سکتے تھے؟ چنانچہ فوراً مسلمانوں پر فوج کشی کر کے اپنے جذبۂ جہاد کو تسکین پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔ مثلاً:

"غرض مولانا ہوتی کے قریب پہنچے تو وہاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں۔ اس پر

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۶۰۴، ۶۰۵

[2] ایضاً، ص ۶۰۶

مولانا (محمد اسمٰعیل دہلوی) نے حکم دے دیا کہ ہر غازی اپنے چاروں طرف چار چار قدم کا فاصلہ چھوڑ کر چلے۔ پھر گڑھی کے جنوبی دروازے کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ مردان سے باہر مغربی سمت میں ایک باغ تھا، جس میں بڑے بڑے درخت تھے اور اُس کی زمین ذرا نشیبی تھی، اُس میں جا بیٹھے۔ گڑھی مردان کے برجوں سے گولیاں آنے لگیں، لیکن مولانا نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ تجویز فرمائی تھی کہ کسی غازی کو نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ ایک گھڑی کے بعد گولیاں مدھم پڑ گئیں اور چند مُلّا صاحبان حاضر ہو کر مولانا کی خدمت میں عرض پرداز ہوئے کہ حکم ہو تو کھانا لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ باقی غازیوں کو زہر آلود کھانا کھلا کر ختم کر دیں۔ خبردار ہو جائیے، جو توپیں دُرّانیوں سے غنیمت میں ملی ہیں، اُنھیں ابھی منگا لیتا ہوں۔ اُن کے آتے ہی گڑھی کو مسمار کر ڈالوں گا۔ ملاؤں نے معذرت کی اور کہا کہ یہ احمد خاں کے آدمیوں کا کام ہے جو جا چکے ہیں۔ اُنھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ لڑائی کے بغیر گڑھی حوالے کر دی تو خان، نمک حرامی کا طعنہ دے گا۔ اُدھر مولانا نے سید صاحب کے پاس آدمی بھیج کر شاہینیں منگا لیں۔ اِدھر جب بستی والوں کو معلوم ہوا کہ توپیں آ رہی ہیں تو بے تابانہ صلح کے خواستگار ہوئے۔ احمد خان کے بھائی رسول خاں نے پیغام بھیجا کہ میں فرمانبردار ہوں، البتہ دُرّانیوں کی آمد کے باعث بے بس ہو گیا تھا۔"[1]

پائندہ خاں رئیسِ آمب سے لڑائی کر کے اُس کا قلعہ چھینا اور مسلمانوں کا کشت و خون کیا۔ یہاں فوج کشی کی ابتدا کیوں اور کس طرف سے ہوئی، یہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی نی سُنیے:

"مخبروں کی زبانی معلوم ہوا کہ پائندہ خاں اپنے ملک میں جنگ کی تیاری

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۴۱۴

کر رہا ہے ، اس واسطے سید صاحبؒ کے لیے بھی لازم ہو گیا کہ ایک لشکرِ اسلام اس طرف روانہ کریں ...... اس مہم کا مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ کو امیر مقرر کر کے بجانبِ آب روانہ کر دیا ...... یہ لشکر دو حصے ہو کر، ایک حصہ زیرِ حکم سید احمد علی ہمشیرزادہ سید صاحبؒ کے عشرہ کو گیا اور ایک حصہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے ساتھ فروسر میں بھیجا اور خود سید صاحب بھی پنجتار سے روانہ ہو کر اسی نواح کے لوگوں کو لشکرِ اسلام کی تائید کے واسطے آمادہ کرتے تھے۔"[1]

جناب غلام رسول مہر نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی اس موقع کی جنگی سکیم کو یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

"آپ غور فرمائیں کہ مولانا کی جنگی سکیم کتنی عمدہ تھی ؛ اگر پائندہ خان عشرہ کی جانب بڑھتا تو مولانا گلنگڑی کے راستے امب پہنچ سکتے تھے۔ اگر وہ خود گلنگڑی کے علاقے فروسر پر پیش قدمی کرتا تو ستھانہ کی فوج عشرہ اور امب پر قابض ہو جاتی۔ اگر وہ امب میں بیٹھا رہتا تو مولانا جنوب اور شمال مغرب دونوں سے امب پر بڑھتے۔"[2]

لیکن پائندہ خاں نے ان لوگوں کی جنگی اسکیم کو ناکام بنا دیا ، جس پر مہر صاحب یوں نوحہ کناں ہیں:

"پائندہ خاں کو کنیر ڑی پر غازیوں کے قبضے کی اطلاع ملی تو اُسے معلوم ہو گیا کہ اب اِن کی دوہری زد سے بچنا مشکل ہے۔ گھبرا کر اُس نے صلح کا جال پھیلایا...... غرض پائندہ خاں کے فریبِ صلح کے باعث غازیوں کے ہر جیش کی ساری جنگی تدابیر معطل ہو گئیں۔"[3]

"پائندہ خاں اب تک عشرہ میں تھا اور اپنے آدمیوں کو للکار للکار کر لڑائی کا

---

[1] محمد جعفر تھانیسری : حیاتِ سید احمد شہیدؒ ، ص ۲۵۰، ۲۵۱

[2] غلام رسول مہر ، سید احمد شہیدؒ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۵۵۳

[3] ایضاً ، ص ۵۵۴

وصلہ دلا رہا تھا۔ سواروں اور پیادوں کو بھاگتے دیکھا تو خود بھی عشرہ کو چھوڑ کر امب کی جانب روانہ ہو گیا۔"[1]

"شیخ ولی محمد کوٹلہ سے پہاڑ کے اوپر اوپر امب کے قریب پہنچ گئے۔ پائندہ خان کا نغیں دیکھتے ہی امب کو چھوڑ کر چھتر بائی چلا گیا، جو چند میل شمال میں تھا۔ شیخ ولی محمد گولیوں کی آواز سن کر کنیر ڑی کی طرف آ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف غازیان کنیر ڑی کو شدید مخمصے سے نجات ملی بلکہ عشرہ اور کوٹلہ پر بھی قبضہ ہو گیا۔"[2]

چھتر بائی کی گڑھی پر جو معرکہ آرائی ہوئی وہ غلام رسول مہر نے اس طرح بیان کی ہے:

"امب سے چھتر بائی کے دو راستے تھے: ایک زیریں راستہ جو دریا کے کنارے کنارے جاتا تھا، دوسرا پہاڑی راستہ۔ رسالدار عبدالحمید خاں پہاڑی راستے سے گئے۔ مولانا نے زیریں راستہ اختیار کیا۔ گڑھی سے ایک گولی کے فاصلے پر دروازے کے بالمقابل ٹھہر گئے اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی کے تینوں جانب مورچے بنا لینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جابجا آٹھ مورچے بنا لیے گئے: تین شمال و مغربی کونے میں، تین جنوبی و مغربی کونے میں، دو جنوبی سمت میں جدھر گڑھی کا دروازہ تھا۔ محاصرہ اگرچہ بڑا سخت تھا لیکن گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ مولانا نے امب سے توپ منگا کر گولہ باری بھی کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر یہ سارے حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے کہ آپ امب پہنچ جائیں اور گڑھی کو مسخر کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔ سید صاحب نے امب پہنچ کر فیصلہ کیا کہ چھتر بائی پر حملے کے لیے پنجبار سے تریں منگا لینی چاہییں۔ چنانچہ آپ نے شیخ بلند بخت دیو بندی کو پچیس تیس

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵۷
[2] ایضاً، ص ۵۵۷

غازیوں کے ساتھ چھتر بائی سے بلا لیا اور ضروری ہدایتیں دے کر پنجتار بھیج دیا۔

...... پنجتار پہنچ کر دفن شدہ توپیں نکلوائیں۔ دکھاڑا سے توی اونٹ منگائے گئے، توپیں لاد کر امب لے گئے۔ سید صاحب کے حکم سے میرزا حسین بیگ، شیخ بہرائی اور شیخ مولا بخش نے انھیں چرخوں پر چڑھا کر گڑھی کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اسی اثنا میں رن گڑھ تیار کرانے کا بھی حکم ہو گیا۔“ [1]

”سید صاحب نے اس حادثے کے بعد حکم بھیجا کر غازی چھتر بائی کا محاصرہ چھوڑ کر کھبل بائی پہنچ جائیں اور وہاں قیام کریں۔ مولانا نے پہلے اڑھائی سو غازیوں کو مورچوں میں چھوڑا، باقی اصحاب کو کھبل بائی بھیج دیا، پھر خود باقی غازیوں کو لے کر اس طرف روانہ ہوئے کہ دشمن ہجوم نہ کرسکے۔ پایندہ خاں کے آدمی دریا پار سے بھی گولیاں چلا رہے تھے۔ گڑھی کی فوج بھی حوصلہ پا کر یورش پر آمادہ تھی۔“ [2]

ان حضرات کی اسلام دشمنی و مسلم کشی کے پے در پے واقعات سے تنگ آکر سلطان محمد خاں برادر یار محمد خاں حاکم پشاور نے ان سے فیصلہ کن جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ مایار مقام پر لڑائی ہوئی لیکن قسمت نے یاوری نہ کی اور سلطان محمد خاں نے شکست کھائی۔ شکست کے نقصان کا اندازہ محمد جعفر تھانیسری نے یوں پیش کیا ہے:

”درانیوں کی لاشوں سے میدان بھر گیا اور غازیوں کا بہت ہی تھوڑا نقصان ہوا۔ جب کئی ہزار درانی مارے گئے تو انھوں نے سخت ہزیمت اٹھا کر پسپائی شروع کی۔ اس وقت غازیوں نے توپوں پر جا کر قبضہ کر لیا اور انھیں توپوں سے بھاگتے ہوئے دشمن پر گولہ باری کر کے ان پر قیامت برپا کر دی۔ قریب تین ہزار درانی مقتول و مجروح ہوئے اور ان کے بڑے بڑے سردار

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۵۵۵

[2] ایضاً : ص ۵۶۱

اور تجاج اور پہیدان اس دن مارے گئے۔ غازیوں کے طرف میں آدمی شہید ہوئے اور اسی قدر مجروح ہوئے۔ میدان غازیوں کے ہاتھ رہا اور توپیں اور شاہین اور بندوقیں اور گھوڑے اور خیمے اور ظروف وغیرہ مال غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا۔ فتح کے بعد ظہر اور عصر کی نماز سید صاحب نے اس میدان میں ادا کی اور مغرب کی نماز سے پہلے سید صاحب مال غنیمت کو ساتھ لے کر مظفر منصور موضع میار میں پہنچے اور وہیں شب باش ہوئے۔" [1]

قارئین کرام! یہ تھا ان حضرات کے جہاد کا اصل رُخ، اب ان کی خلقی حالت پیش کرنے سے پہلے جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا نظریہ ان کی تحقیق کی روشنی میں پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے سید احمد صاحب کے رفقاء کو اُن کے کردار کی روشنی میں کیا کچھ پایا؛ چنانچہ موصوف رقمطراز ہیں:

"انھوں (سید احمد و محمد اسمٰعیل صاحبان) نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے، وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔" [2]

مودودی صاحب کی عقیدت کے ان مرکزوں کا دین وایمان کچھ اسی فصل کی گزشتہ سطور میں پیش کیا جا چکا ہے، کچھ چند صفحات کے بعد پیش کیا جائے گا، نیز اسی کتاب میں اکثر جگہ ان حضرات کے دین ہی کی توضیح موجود ہے۔ معاملات کی صفائی، ان کی مسلم کشی اور انگریز دوستی سے عیاں ہے۔ رہا اخلاق والا معاملہ تو اس کا بیان چند سطور میں پیش ہونے والا ہے۔ پہلے موصوف کا ایک بیان اور ملاحظہ فرما لیا جائے، لکھتے ہیں:

"ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا۔ انھوں نے ٹھیک اسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۶۸، ۲۶۹

[2] ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۵

وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل، وہی انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی نفی لعنت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاقِ صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا۔ غرض ہر پہلو میں اُنھوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا، جو صدیقؓ و فاروقؓ نے کی تھی۔" ؎

معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عالیجناب مودودی صاحب کی نظر میں کسی بہتر سے بہتر حکومت و امارت میں جو اوصاف ہونے چاہییں وہ اُنھوں نے لکھ دیے۔ اُن کا ایک خوبصورت سہرا بنایا، پھر اپنی عقیدت کے مندر میں تشریف لے گئے اور وہ ہار اپنے ہُبل (اسمٰعیل دہلوی) کے گلے میں لٹکا دیا۔ اس چنگیز خانی و ہلاکو خانی کو صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے عہد جیسا بتانے کی جرأت بھی ویسا ہی شخص کر سکتا ہے، جن کی بخشش کا سید احمد صاحب پہلے خدا سے وعدہ لے لیا تھا۔ آئیے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عاشق زار و سوانح نگار حضرت مرزا حیرت دہلوی سے پوچھتے ہیں کہ سید احمد صاحب کے ساتھی اور اُن کے مقرر کردہ حکام کیسے تھے، موصوف بتاتے ہیں:

"مجاہدین میں سب طرح کے آدمی تھے، بُرے بھی اور بھلے بھی۔ بلکہ یہ اندازہ کیا گیا کہ بُرے زیادہ اور بھلے کم تھے۔ کبھی علانیہ طور پر سید صاحب کے کسی ساتھی کو سزا نہیں دی گئی، حالانکہ اکثر ناجائز افعال اُن سے سرزد ہُوا کرتے تھے۔" ؎

ان حضرات کو چند سال تک جو ایک مختصر سے علاقے پر جہانبانی و جہانداری کا موقع ملا اور آئینِ سلطنت کیا تھا، شانِ حکمرانی کیا تھی؟ اس کا اندازہ مرزا حیرت دہلوی کے اِس حیرت انگیز بیان سے کیا جا سکتا ہے:

؎ ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۶، ۱۱۷

؎ حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲

"ایک ایک چھوٹے ضلع، قصبہ، گاؤں میں ایک ایک عامل سید صاحب کی طرف سے مقرر ہوا تھا۔ وہ بیچارہ جہاں داری کیا خاک کرسکتا، الٹے سیدھے شریعت کی آڑ میں نئے نئے احکام بیچارے غریب کسانوں پر جاری کرتا تھا اور وہ ان پر کرسکتے تھے۔ کھانا پینا، بیٹھنا اٹھنا، شادی بیاہ کرنا سب کچھ اُن پر حرام ہوگیا تھا۔ نہ کوئی منتظم تھا، نہ کوئی دادرس تھا۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ ہوجانا کچھ بات ہی نہ تھا..... ذرا کسی کی لبیں بڑھی ہوئی دیکھیں، اُس کے لب کتروا دیے۔ ٹخنوں سے نیچے تہ بند دیکھی، ٹخنہ اُڑوا دیا۔ تمام ملک پشاور پر آفت چھا رہی تھی۔ انتظام سلطنت اُن مسجد کے ملاؤں کے ہاتھ میں تھا، جن کا جلیس سوائے مسجد کے دیوار و درس کے کبھی کچھ نہ رہا تھا اور اب اُن کو منتظم امور سلطنت بنا دیا گیا تھا، اور پھر غضب یہ تھا کہ اُن پر کوئی حاکم مقرر نہ تھا کہ بیکس اُن کی اپیل اعلیٰ حکام کے آگے پیش کرے۔ اِن ہی بے دماغوں کے فیصلے ناطق سمجھے جاتے تھے اور تسلیم کرلیا جاتا تھا کہ جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے اُس میں کوئی بات بھی قابلِ تنسیخ اور ترمیم نہیں ہے۔ کیسا ہی پیچیدہ مقدمہ ہوتا تھا، اُس کی گھڑی بھر کی تحقیق نہ کی جاتی تھی، نہ اُس پر غور کیا جاتا تھا، بس مُلّاں جی کے سامنے گیا اور اُنھوں نے جھٹ سے فیصلہ دے دیا۔ کون جھک جھک کرے اور کون تحقیق کی تکلیف برداشت کرے؟ سید صاحب کی خدمت میں شکایتوں کی عرضیاں گزر رہی تھیں، مگر وہاں کچھ بھی پُرسش نہ ہوتی تھی۔"[1]

شاید عالیجناب ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر میں یہ صحابۂ کرام کی یاد تازہ کی جارہی تھی اور حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا انتظامِ سلطنت موصوف کی نظر میں ایسا ہی ہوگا۔ وہابی اہلحدیث اور دیوبندی حضرات تو اپنے اپنے روزِ اوّل سے ہی ان حضرات کو امام مانتے

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۳

دُونِ اللہ بنائے ہُوئے ہیں۔ وہ اگر ایسے بیانات داغتے رہے ہیں تو کیا جائے شکا
لیکن مودودی صاحب، جو محقق ہونے کے مدعی ہیں اور خود تحقیق کیے بغیر کسی بڑی سے
ہستی کے بھی فیصلے کو تسلیم کرنے کے عادی نہیں، جب راقم الحروف نے موصوف کی
"تجدید و احیائے دین" کتاب کے صفحات پر اِس قسم کی اٹھیل پرستی دیکھی تو حیرت وا
کی کوئی انتہا نہ رہی کہ برِّ عظیم پاک و ہند میں ایک ایسا غیر مرئی "ہبل" بھی ہے جس کی عقید
مبتلا ہو جانے کے بعد بڑے بڑے مدعیانِ تحقیق و تدقیق کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی یا توفیق
ملتی کہ وہ نظر اٹھا کر اتنا ہی دیکھ سکیں کہ جس کے حضور میں وہ جھکے ہوئے ہیں وہ عقیدت کا
محض ایک پتھر کی مورتی ہے یا کسی سامریِ وقت کے ہاتھوں کا گھڑا ہُوا سنہری بچھڑا!

مودودی صاحب جیسے مدعیِ عبقریت و نابغۂ عصر کہلانے والے کی بارگاہ میں اگر
جیسی ارضی مخلوق کو بھی اِذنِ لب کشائی حاصل ہے تو یہ ناچیز عرض کرنے کی جسارت کر
جنابِ والا! اگر طبعِ مبارک پر گراں نہ گزرے تو ذرا اپنے اِن بڑوں کے دین و دیانت اور
طہارت کی کہانی، خود اِنہی کی زبانی سُن لیجیے:

"سید صاحب نے صدہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شریعتِ محمدی
کے موافق عملدرآمد کریں، مگر اُن کی بے اعتدالیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔
وہ بعض اوقات نوجوان خواتین کو مجبور کرتے تھے کہ اُن سے نکاح کر لیں اور بعض
اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جا رہی ہیں، مجاہدین
میں سے کسی نے اُنھیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھا لیا۔"[1]

کیا فرماتے ہیں علمائے اہلحدیث و مفتیانِ دارالعلوم دیوبند و سہارن پور اور محققِ
اسلامی اِس بارے میں کہ راستہ چلتے ہُوئے کسی کی نوجوان لڑکی کو زبردستی پکڑ کر نکاح
سے جبکہ اُس لڑکی کی قطعاً رضامندی نہ ہو، اُس کے ولی کی اجازت نہ ہو، بلکہ ولی کو خبر
کیا ایسا جبری نکاح شرعاً جائز ہے یا زنائے محض؟ ایسے نکاح سے جو اولاد پیدا ہو گی،

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲

بھی حکم کیا ہے؟ اس طرح مسلمانوں کی نوجوان لڑکیوں کو جبراً اپنے گھروں میں ڈال لینے والے،
وکی بیسیوں کو طلاق دلوانے والے، صحابۂ کرام کی یاد تازہ کر رہے تھے یا بدکاری کا دنیا میں
ورلڈ ریکارڈ قائم کر رہے تھے؟ یہ صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور کا نمونہ پیش کیا
جا رہا تھا یا یہ پیسے سے کہ آج تک کے مسلمان کہلانے والے جملہ بدچلن اور بدقماش
لوگوں کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ کر بین الاقوامی چیمپئن شپ حاصل کرنے کی کوشش
جا رہی تھی؟ ؎

خار کو گل اور گل کو خار جو چاہے کرے
تُو نے جو چاہا کیا، اے یار جو چاہے کرے

اسی سلسلے میں تسکینِ خاطر و اطمینانِ قلب کی غرض سے ذرا یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمائی جائے:
"ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی کہ میرا نکاح ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور دے
رہے ہیں، نہیں، ہونا چاہیے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالۂ مجاہد
کرنے تھے اور اُن کو کچھ چارہ نہ تھا۔"[1]

اگر مودودی صاحب اور دیگر وہابی علماء کی طبعِ نازک پر گراں نہ گزرے تو اس طرزِ عمل پر
یا حیرت دہلوی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے:
"یہ ممکن نہ تھا کہ نوجوان عورت رانڈ ہو کے عدت کی مدت گزر جانے پر بے خاوند
بیٹھی رہے۔ اس کا جبراً نکاح کیا جاتا تھا، خواہ اُس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ پشاور
میں بڑے بڑے سرداروں میں نکاح ثانی کی رسم نہ تھی اور اُسے سخت حقارت
کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ مانا کہ نکاح ثانی قرآنی حکم ہے، مگر جس ناگوار طریقہ
سے وہ پبلک کے آگے پیش کیا گیا تھا، وہ ناقابلِ برداشت تھا۔"[2]

یہ بیانات کسی تعارف و تبصرہ کے محتاج نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دہابی

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲

[2] ایضاً: ص ۲۴۲

حضرات کی خدمت میں اُن کے برطانوی صدیقوں اور فاروقوں کا طرزِ عمل بھی اس سلسلے میں پیش کر دیا جائے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنے ممدوحین کے پروہتوں کو بچاتے ہوئے، لیپا پوتی سے کام لیتے ہوئے، اُن کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے:

"بدقسمتی سے ایک نیا گل کھلا۔ گل کیا کھلا، گویا غازیوں یا مجاہدوں کی زندگی کے شیرازے کو اس نے پراگندہ کر دیا۔ باہم یہاں کے کل عمال نے جن کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی، ایک فتویٰ مرتب کیا اور اسے پوشیدہ مولوی اسمٰعیل کی خدمت میں بھیج دیا۔ فتویٰ کا مضمون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے یا نہیں؟ مولانا شہید کیا واقف تھے کہ ملک پشاور میں یہ آگ پھیل رہی ہے اور اس وقت اس فتویٰ کی اشاعت سخت غضبناک ہوگی۔ آپ نے سادہ طور پر، اس پر اپنی مہر کر دی اور سید صاحب کی بھی اس پر مہر ہوگئی اور پھر وہ فتویٰ قاضی شہر پشاور، سید مظہر علی صاحب غازی کو بھیج دیا گیا۔ انھوں نے اس فتویٰ کی اشاعت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصہ میں ملک پشاور میں جتنی رانڈیں ہیں، سب کے نکاح ہو جانے ضرور ہیں، ورنہ اگر کسی گھر میں بے نکاح رانڈ رہ گئی، تو اس گھر کو آگ لگا دی جائے گی۔"[1]

سید احمد صاحب نے اپنے ساتھیوں کے پاسِ خاطر سے، صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور کی جناب ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر میں یاد تازہ کرنے کی غرض سے، کیسے کیسے کالے قانون رائج کیے۔ اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے مذکورہ فتویٰ ہی کون سا کم ہے لیکن مزید تسلی کی خاطر ان کے خانہ ساز امیر المومنین کا ایک اعلانِ عام پیش کرتے ہیں۔ کسی یورپین مورخ کا بیان ہے، جسے مرزا حیرت دہلوی نے اپنے لفظوں میں یوں نقل کیا ہے:

"آپ کے ساتھی غریب الوطن تھے اور اب انھیں جورووں کی بھی خواہش تھی تو آپ (سید صاحب) نے ایک فرمان جاری کیا کہ جتنی کنواری لڑکیاں ہیں وہ سب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۲، ۲۴۳

ہمارے پیغمبرؐ کی خدمت میں مجاہدین کے لیے حاضر کی جائیں گی، اگر ان کی شادی بارہ دن میں نہ کر دی گئی۔ قوم کی قوم اِس اعلان سے بھڑک اٹھی[1] سرحد کے مسلمانوں نے طوعاً و کرہاً اِن حضرات کے ہر ظلم کو برداشت کیا۔ مجبوراً اِن کے جور و ستم کی چکی میں پستے رہے لیکن آئے دن اُن کے ننگ و ناموس سے جو کھیلا جا رہا تھا یہ معاملہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پک رہا تھا اور کسی بھی مقام سے پھٹنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن پھٹنے کا موقع آیا تو زمین ہی کھل گئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا فتویٰ جاری ہو گیا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے۔ قاضی مظہر علی نے پورے ملک میں اِس فتوے کو مشتہر کر کے اعلان کر دیا کہ تین دن میں جملہ بیوگان کے نکاح ہو جانے ضروری ہیں ورنہ جس گھر میں کوئی بیوہ پائی گئی، اس گھر کو آگ لگا دی جائے گی، خود سید صاحب یوں گرجے کہ علاقے کی ساری کنواری لڑکیاں مجاہدین کے لیے ہمارے پاس پہنچا دینی چاہییں، بارہ روز کی مہلت ہے یہ ہے اِن حضرات کے دین و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی کہانی۔ معلوم نہیں مودودی صاحب اور دیگر جملہ وہابی علماء و مورخین اپنے اِس اینگلو انڈین بدچلن گروہ کے اخلاقیات کو کون سے پیمانے سے ناپ کر صحابہ کی یادگار بتایا کرتے ہیں؟ آخر قیامت ایک روز ضرور آ کر رہے گی۔ اگر حق و باطل کا فیصلہ کرنا یہاں منظور نہیں، بلکہ اِن حضرات کو یہاں اِس دھاندلی میں فائدہ نظر آتا ہے، رات کو دن اور دن کو رات بتانے میں ہی کوئی منفعت دکھائی دیتی ہے، تو اِن حضرات کی زبان اور قلم پر پہرہ کون بٹھا سکتا ہے؟ لیکن کیا بروزِ قیامت بھی یہ دھاندلی، یہ چکنے بیانات، یہ خوشنما اعلانات، یہ بچھانے والوں پر بہتانات کچھ کام آسکیں گے؟ یہ چرب زبانی و رنگِ تقریر اور یہ زورِ قلم و سلیقۂ تحریر کیا بوقتِ حساب کچھ کام آجائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

اِس طرزِ عمل نے، اِس بے غیرتی و بداندیشی نے جو رنگ دکھانا تھا وہی سامنے آیا۔ جو خیال و خواب میں بھی نہیں تھا وہ دن دیکھنا پڑا۔ اقتدار کی بدمستی میں فکرِ انجام سے بے خبر ہو کر جو سیاہ کاریاں کی جا رہی تھیں وہ رنگ لائیں۔ دنیا میں ہی روزِ حساب آیا۔ دگی و عصمت اور

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۲

کشف و کرامت کے سارے جھوٹے دعوے رفو چکر ہو گئے، خدا کی لاٹھی سے پہلے آوا صاحب کی پکڑ سے چھڑانے والا کون؟ ہوا کیا؟ ملاحظہ فرمائیے:

"اِس اعلان کا نتیجہ ہونا تھا تمام ملک مجاہدین کے خلاف شمشیر بدست ہو گیا۔ بہت دھوم دھام سے سازشیں ہونے لگیں اور ایک عام کہرام تمام ملک پشاور میں مچ گیا۔ بڑے بڑے خوانین جو اپنی رانڈ لڑکیوں کا نکاح کرنا سخت عیب خیال کرتے تھے بڑے برافروختہ ہوئے اور انھوں نے باہم یہ مشورہ کیا کہ تین دن کی مدت میں ان سب کو یہیں تہِ تیغ کر ڈالو۔ مجاہدین نے بھی آخر وقت میں جا کے، جب سب سامان ہو چکا تھا، اُن کے تیور پہچانے اور اب وہ مخالفت ہو کر سید صاحب کو کہنے لگے کہ یہاں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ سید صاحب کچھ ایسے بے پروا ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا، نہ مخبروں کی خبروں پر کچھ توجہ کی، جو دم بدم یہ رپورٹ گزار رہے تھے کہ آپ جلد فوج لے کر اِس طرف روانہ ہوں، ورنہ خاتمہ ہی ہوا چاہتا ہے۔ سید صاحب نے مطلق توجہ نہیں کی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم اعلیٰ مولوی سید مظفر علی صاحب، جو اِس آتش فشاں فتوے کے بانی مبانی اور اشاعت دہندہ تھے اور جنھیں سید صاحب نے بڑے اعتبار اور بھروسے سے مقرر کیا تھا، سلطان محمد حاکم پشاور کے دربار میں مع ساتھیوں کے بلائے گئے اور فوراً اُن کا سر قلم کیا گیا اور عام حکم دے دیا گیا کہ ایک ایک مجاہد قتل کیا جائے۔ ساری رات میں کل مجاہدوں کی، جو بطور منتظم مختلف حصص میں متعین تھے، گردنیں اڑا دی گئیں اور نہایت بے کسی کی حالت میں، ان میں سے اکثر سڑکوں پر بکروں کی طرح لٹا کر ذبح کیے گئے۔"[1]

لڑکیوں کو زبردستی چھیننا، زبردستی نکاح کا ڈھونگ رچا کر اپنی شیطنت کا اپنا تو یک طرفہ رہا۔ جن مسلمانوں کو واجب القتل، مستحل الدم قرار دیا گیا، جنھیں اصل کافر اور اہل کتاب

---

[1] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۴

...یا گیا وہیں کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر لوٹتے رہے، جنھیں کلاب النار اور ملعونین اشرار کہا
گیا، آخر اُن سے اور کسی سلوک کی توقع کس بنا پر رکھی جا سکتی تھی؟ کشتی کو بھنور میں پھنسا کر
...ھار بند کر بیٹھنے سے طوفان ٹل نہیں جاتا، ظلم و ستم کی آندھی جب چڑھتی ہے تو اُس کی
...نا کی سنسناہٹ ہی دلوں کو ہلا دیتی اور کئی ہرے بھرے اور تنومند درختوں کو بھی بیخ و بُن سے اکھاڑ
...یتی ہے لیکن چند ساعتیں گزرنے کے بعد کہیں اُس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یہ حضرات
...غول پر ظلم و ستم کی آندھی بن کر چھا تو گئے لیکن ساحرِ برطانیہ نے اِنھیں کس درجہ مسحور
...تھا، اِس کا اندازہ لگانے کے لیے یہی حقیقت کافی ہے، کہ انبیائے کرام سے بھی آگے
...ر جو قدم قدم پر الہاموں کے دعوے کر رہے تھے، وہ اپنے افعال و کردار پر مطلع ہو سکے
...و نا زیست نوشتۂ دیوار پڑھنے سے عاجز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عذابِ الٰہی اپنی آنکھوں
...دیکھ لیا تو طاقت و جمعیت ہونے کے باوجود، ہمت جواب دے گئی، اوسان خطا ہو گئے
...سے وسائل حرفِ غلط کی طرح بے معنی نظر آنے لگ گئے۔ اُس وقت اِن حضرات کی
...لت تھی، اُس کی منظر کشی یُوں کی گئی ہے:

"یہ خُونی خبر وحشتناک آگ کی طرح پنجتار میں سید صاحب کے گوشِ حقیقت
نیوش میں بھی پہنچی۔ آپ یہ خبر گوش گزار فرما کے خون کے آنسو روئے اور
ایسا صدمہ ہُوا کہ کُل ارادے پست ہو گئے اور ایسی مایوسی چھائی کہ انتقام کی
بھی ہمت نہ رہی۔ پیارے شہید کا دل سب سے زیادہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ
سکتۂ حیرانی کی بھری ہُوئی نظروں سے چاروں طرف تکنے لگے۔ اب کیا تھا؟
کمر ٹوٹ چکی تھی اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ کئی برس کے
خون پسینہ ایک کر کے پنجاب کے بڑے حصے پر سکّہ بٹھایا تھا اور وہ آناً فاناً میں
یُوں ہی خیرباد ہو گیا۔ کثیر التعداد مجاہدین کا مارا جانا بھی قہرناک تھا اور پشاور کا
ہاتھ سے چھن جانا تو سب سے ہی زیادہ خونی اثر پیدا کرنے والا تھا۔ اِن تمام
ناگفتہ بہ غمناک صورتوں نے مولانا شہید کو بٹھا دیا اور پھر اِس خمیر میں بھی یہ
اولوالعزمی نہ رہی کہ وہ اپنے دوستوں کا عوض لیتا۔ اب اُس نے اپنی شکستہ دلی

اور سخت مایوسی کی حالت میں اپنے کو بالکلیہ اپنے محترم پیر کے حوالے کر دیا کہ جو کچھ یہ چاہیے، جو کچھ یہ کرے، اس کا ساتھ دو۔ خود کوئی بات سوچنا اور مشورہ دینے کا کام نہیں ہے۔ سید صاحب، مولانا شہید سے بھی زیادہ شکستہ خاطر تھے۔ آپ نے یہی بہتر جانا کہ اس ملک پنجاب کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ہر چند لوگوں نے سمجھایا مگر آپ نے نہ مانا اور کہا، جہاں میرا خدا لے جائے گا، میں چلا جاؤں گا۔ جب آپ پنجاب سے ہمیشہ کے لیے ہجرت کی تیاری کر رہے تھے تو روانہ ہونے سے دو دن پہلے جمعہ کے دن اپنے کُل ساتھیوں کو بآوازِ بلند اپنے ارادہ سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی اذن دے دیا، جو شخص اپنے وطن جانا چاہتا ہے، بخوشی جائے اُس سے میں ناراض نہیں ہوں۔[۱]

گویا سید صاحب نے سکھوں سے جہاد کرنے اور پنجاب میں رہنے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا تھا۔

اب یہی حالات محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف لکھتے ہیں :

"جب سید صاحب کو جگہ جگہ سے مجاہدین تحصیل داران عشور کے قتل کی خبر پہنچی آپ بہت غمگین ہوئے اور فرمایا کہ اِس ملک والوں پر برسوں پند و نصیحت کی مگر اُس کا آج تک ان پر اثر نہ ہوا بلکہ بجائے اصلاحِ حال خود اُلٹا تمرّد اور سرکشی سے اُن مسلمان دین داروں کو، جو لب لباب اپنے اپنے ملک اور دیار کے تھے، بڑے ظلم، بے رحمی اور دغا سے قتل کر ڈالا۔ اب میں ان کا انتقام کو خدا پر چھوڑ۔ وہ منتقم حقیقی خود اُن سے دنیا و آخرت میں اِس کا بدلہ لے گا۔ اب میں اِس ملک میں نہ رہوں گا، بلکہ یہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسرے ملک میں چلا جاؤں گا۔ آپ نے اپنی روانگی سے پہلے، ملک سندھ کو جہاں آپ کی دو بیویاں مقیم تھیں، اِس ملک سے اپنی ہجرت کرنے کی اطلاع لکھ کر روانہ کر دی اور پھر سب غازیوں کو جمع کر کے بطور وعظ یہ فرمایا کہ اے مسلمانو!

---

[۱] حیرت دہلوی مرزا؛ حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۴۴۴، ۴۴۵

"اللہ تعالیٰ نے تم کو اس عبادت جہاد میں میرا شریک فرمایا اور گرم و سرد اور رنج و راحت اور فتح و شکست میں محض باری تعالیٰ کی مرضی کے لیے تم آج تک میرے شریک رہے اور سعی، نصرت اور شراکت کا حق پورا ادا کیا۔ اب میں اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ملک دور دراز میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ مجھے کہاں لے جائے گا ... جو شخص ایسی تکالیف جسمانی و نفسانی پر صبر نہ کر سکے اُسے اختیار ہے جہاں چاہے جائے۔ مگر حرب کے علاوہ اس وقت کوئی جگہ اس کی نظر نہیں آتی۔" [1]

جناب غلام رسول مہر نے اُس وقت کے حالات اور سید صاحب کے تاثرات یوں لکھے ہیں:

"پانچ چھ روز کے بعد اخوند زادہ قابل، ارباب بہرام خاں کے اہل و عیال کو ساتھ لے کر واپس آیا اور سارے حالات سید صاحب کی خدمت میں عرض کیے تو آپ کے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ فرمایا: کچھ اوپر چار برس ہم ان لوگوں کی اصلاح میں لگے رہے، وعظ و نصیحت کی، ان کے دین اور دنیا کی بھلائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن یہ لوگ اتنے سخت دل اور ہدایت سے بے بہرہ ہیں کہ کچھ اثر نہ ہوا۔ اب ہم کس کس سے بدلہ لیں؟ بہتر یہی ہے کہ ان کا معاملہ خدا کے سپرد کریں۔ وہ منتقم حقیقی جس طرح چاہے انتقام لے۔ سلطان محمد خاں پر حیرت ہے کہ اُس نے خود سب کچھ ہمیں بتایا اور عذر کیا کہ غلطی ہوئی، معاف کر دیجیے۔ بعد ازاں اُسی بہتان نامے کو دستاویز بنا کر صدہا مسلمانوں کا ناحق خون کرایا۔ اس سے تو اس کا بھائی دوست محمد خاں ہی اب تک اچھا رہا کہ نہ ہم سے بھلائی کی اور نہ برائی۔ اب ان لوگوں میں رہنا اچھا نہیں۔ یہاں سے ہجرت کر کے جدھر اللہ چاہے گا، چلے جائیں گے۔" [2]

---

[1] جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۰۸، ۲۰۹

[2] م رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۰۰۰

انسان اپنی یا کسی کی غلطی کو محسوس کرے تو اُس سے بچنا ممکن رہتا ہے لیکن جب غلطی
صحت پر اُسے اصرار ہو تو یہ اصلاح کے مسدود و مفقود ہو جانے کا مقام ہوتا ہے اور اسے جہل
کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمد جعفر تھانیسری اور خصوصاً مہر صاحب کی نظر میں سراسر قصور وار
ہیں تو مسلمانانِ سرحد اور خاص طور پر سلطان محمد خاں۔ چنانچہ جناب غلام رسول مہر تو اپنی مورخانہ
اور ادیبانہ شان کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ یعنی یہ جماعت کس جرم کی پاداش
میں قتل کی گئی؟ لیکن اگر موصوف سے کوئی سوال کرتا کہ ہزاروں مسلمانوں کو ان حضرات نے کس جرم
کی پاداش میں قتل کیا تھا اور انھیں جھوٹے الہاموں کا سہارا لے کر مسلمانوں کا امیرالمومنین بن
اور بیعت سے انکار کرنے پر انھیں واجب القتل ٹھہرانے کا حق کون سی شریعت نے دیا تھا؟ تو
حمایتی حضرات اِس جہان میں یا خدا کی بارگاہ میں کیا جواب دیں گے؟ اس بارے میں اپنی
کو برقرار رکھنے کی خاطر سید صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کو زدِ قلم بچاتے ہوئے
حیرت دہلوی نے یوں حقیقت بیان کی ہے:

"مولانا شہید نے تو اِس محنت اور جانکاہی سے ملک پنجاب کے اتنے بڑے حصہ کو مسلمانوں کے لیے صاف کر دیا تھا اور ناتجربہ کاروں نے چند بے اعتدالیوں سے اپنی جانیں بھی کھوئیں اور مفتوحہ ملک چھڑا دیا، ایسا کہ تسمہ تک لگا ہوا باقی نہ چھوڑا۔ وہ عظیم الشان بہادر جس نے رنجیت سنگھ جیسے شیرِ پنجاب کے خونخوار پنجوں سے اتنا بڑا ملک چھین لیا تھا، خود دماغ ملاّؤں نے اس آسانی سے اپنی جانوں کے ساتھ اُسے بھی کھو دیا۔"[1]

موصوف نے اِن حضرات کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اِن لفظوں میں بھی تبصرہ کیا ہے:

"حقیقت میں یہ صحیح ہے کہ ناتجربہ کاروں کی ہمراہی ایک مدبرِ اعلیٰ کی لاانتہا تدابیر کو بدنما لباس پہنا دیتی ہے۔ جو کچھ پیارے شہید نے کیا، اُس کے کاموں کا بہت سا حصہ ہر عیب و خطا سے پاک ہے، ہاں بعض بعض امور ملکی میں اُس کی

---

[1] حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۸

ت غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن پھر بھی اُن غلطیوں کا اثر اُسی کی ذات تک رہا
وجہ ہے اُس کے ساتھیوں پر پڑا۔ مگر حیف صد حیف، اُس کے ہمراہیوں نے
تو لذائذِ نفسانیہ اور اپنی خود غرضی سے لٹیا ہی ڈبو دی اور ایسا ستیاناس کر دیا کہ
انجام ملک پنجاب چھوڑتے ہی بن پڑا۔" ۱؎

مرزا حیرت دہلوی نے اہلحدیث ہونے کی بنا پر اپنے ممدوحین کی خارجیت اور اُن کے نئے
ب کا تو ذکر نہیں کیا لیکن جن سیاسی امور کا تذکرہ کیا ہے، اُن میں اِس جماعت کے غلط طریقوں کا
حقیقت پسندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کیونکہ یہی چیز تو تھی جو ان کی تباہی کا باعث بنی، جبکہ
م رسول مہر نے محض سخن سازی کے ذریعے حقیقت کو غتربود کرنے کی کوشش ہی کی ہے۔ قارئین
م سے التماس کروں گا کہ اِس کتاب میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور سید احمد صاحب کے
ے میں راقم الحروف کی گزارشات کو سامنے رکھیں، جو دلائل اُن کی تصانیف یا اُن کے بارے
دیگر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں، وُہ مدِّ نظر رہیں اور پھر حاکم پشاور، سلطان محمد خاں کے
بیان کو پڑھیں جو اُس نے سید احمد صاحب کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر کیا تھا:

"جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں۔ تم لوگوں کا عقیدہ بُرا اور نیت فاسدہ ہے۔
بظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہوس ہے۔ ہم نے خدا کے نام پر
کمر باندھ لی ہے کہ تمھیں قتل کریں، تاکہ زمین تمھارے وجود سے پاک ہو جائے۔" ۲؎

جنگ مایار میں سلطان محمد خاں نے شکست کھائی، مصالحت ہونے پر حاکم پشاور نے بوقت
ت سید صاحب کو ہندوستانی علماء کا ایک محضر بنا دیا۔ اُس میں کیا درج تھا؟ یہ جناب
م رسول مہر کی زبانی سنیے:

"اِس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے ایک فتویٰ یا محضر خریطہ سے نکال کر
سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس پر بہت سی مُہریں ثبت تھیں۔ محضر

۱؎ حیرت دہلوی، مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۴۶
۲؎ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۶۰۳

میں خوانین ستھ سے خطاب تھا۔ مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر، تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ اُن کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالف ہیں۔ ایک نیا دین اُنھوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو بُرا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اُنھیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ اُن کی باتوں میں نہ آنا۔ عجب نہیں تمہارا ملک چھڑوا دیں۔ جس طرح بھی ہو سکے، اُنھیں تباہ کرو۔ اگر اِس باب میں غفلت اور سستی برتو گے تو پچھتاؤ گے اور ندامت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔"[1]

اِس مضمر کی، جو مہر صاحب کے لفظوں میں نقل کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل باتیں قابلِ غور ہیں:

۱۔ علمائے ہند نے سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے دعویٰ جہاد کو فریب کیوں بتایا؟

۲۔ اُن علماء نے اِس جماعت کا مذہب ہندوستانی اور سرحدی مسلمانوں کے مذہب کے خلاف بتایا۔

۳۔ اِن جہاد کا دعویٰ کرنے والوں کے متعلق کہا کہ اِنھوں نے نیا دین رائج کیا ہے۔

۴۔ سید احمد صاحب اور اُن کے رفقاء کو انگریزوں کے ایجنٹ قرار دیا۔

اگر یہ الزامات محض بے بنیاد تھے تو اِس سے زیادہ سنگین الزام کسی مسلمان کہلانے والے پر اور کیا لگایا جا سکتا ہے؟ چاہیے تھا کہ جناب غلام رسول مہر جیسا بال کی کھال نکالنے والا مورخ دلائل کی روشنی میں اِن دعاوی کو بے بنیاد ثابت کر دکھاتا۔ لیکن موصوف نے اپنی ضخیم تصنیف میں بیجا حتیٰ کا کنبہ جوڑنے اور اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کی خوب کوشش کی لیکن اِن الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے کے نام ہی سے دل دہلنے لگتا ہوگا آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہوگا۔ خیر جانے دیجیے، یہ ہندوستانی علماء کے خیالات تھے۔ علمائے پشاور کے سامنے اِن حضرات کی گزشتہ تاریخ نہیں تھی۔ وہ اِن لوگوں کے سابقہ کردار

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۶۱۴

...لات زندگی سے بے خبر تھے۔ پشاوری علما نے ان حضرات کے بارے میں جو رائے قائم کی
...علم الیقین اور شہادات کی بنا پر قائم کی۔ علمائے پشاور کے تاثرات ان حضرات کے بارے میں کیا تھے؟ مہر صاحب کی زبانی سنیے:

"شاہ اسمٰعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں جو پشاور کے دس علماء کے نام بھیجے گئے۔ پہلا ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ / اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو، دوسرا ۱۰ شوال ۱۲۴۵ھ (۱۱ / اپریل ۱۸۳۰ء) کو۔ ان سے ظاہر ہے کہ ان علماء کی طرف سے سید صاحب اور آپ کے رفقاء پر کئی الزام لگائے گئے تھے۔ مثلاً:

۱۔ سید صاحب اور آپ کے رفقاء الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں۔ نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذتِ جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم و تعدی کے خوگر ہیں۔

۳۔ بلا وجہ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۴۔ سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے۔ مولانا اسمٰعیل اور بعض دوسرے لوگوں نے انھیں مہدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے انھیں ملک سے نکال دیا۔

۵۔ وہ مکہ معظمہ پہنچے وہاں سے براہِ مسقط و بلوچستان قندھار گئے۔

۶۔ خادے خاں کو ملا عبدالغفور (اخوند سوات) کے ذریعے سے صلح کے بہانے بلایا اور قتل کرا دیا۔

۷۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً جدید الاسلام ہندوستانیوں کے حوالے کرتے ہیں۔" [1]

...م یہ ہوتا ہے کہ مہر صاحب نے ان الزامات کو اپنے پسندیدہ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے تاکہ یہ خود ہی غلط نظر آنے لگ جائیں مثلاً ــــ "انگریزوں نے انھیں ملک سے نکال دیا ہے" مکہ معظمہ سے قندھار پہنچنا یا خادی خاں کو بلا کر قتل کرانا وغیرہ۔ موصوف نے ان الزامات کے

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۹، ۲۶۰

بارے میں اپنا فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے:

"ان الزامات کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ سراسر بے اصل ہیں
ممکن ہے یہ الزامات بھی اُسی محضر سے ماخوذ ہوں، جو سلطان محمد خان نے
پیش کیا" ۔ ؎1

اگر مہر صاحب ذرا صاف گوئی سے کام لیتے اور الزامات کو پڑھ کر لرزہ طاری نہ ہو جاتا
تو اس طرح بھی لکھ سکتے تھے کہ: "علمائے سرحد کے الزامات کی تردید کرنے کی ہمارے کسی بڑے
سے بڑے میں ہمت نہیں۔ اس لیے کہ الزامات حقیقت کے عین مطابق ہیں"۔ اگر موصوف حرف
آشنا لکھنے کی ہمت کر لیتے تو یہ ایک فقرہ اُن کی سولہ سالہ کاوش یعنی کتاب سید احمد شہید سے سو درجہ
بڑا کارنامہ ہوتا، لیکن مقدر نے یاوری نہ کی اور ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء میں اپنے ایک محقق سے چاہا
موجودہ وہابی علماء و مورخین علمائے سرحد کے الزامات پر حقائق کی روشنی میں غور و فکر کریں!
دیکھیں: ؎

اسپِ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

؎1 غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۰

جنابِ غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق سید احمد صاحب کی پیدائش

دابِ نبوت تکیہ رائے بریلی کے مشہور سادات خاندان میں ، ۶ صفر ۱۲۰۱ھ / ۲۹ نومبر ۸۶ء کو ہوئی۔ جب چار سال ، چار ماہ ، چار دن کے ہوئے تو پڑھنے کے لیے مکتب میں مائے گئے۔ ابتدائی تعلیمی حالت یہ تھی :

"کوششوں کے باوجود سید صاحب کی طبیعت تحصیلِ علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔
مخزنِ احمدی کا بیان ہے کہ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے لیکن اس مدت
میں قرآنِ پاک کی چند سورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ
کے بڑے بھائی سید ابراہیم اور سید اسحاق بار بار لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے
رہتے ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اس تاکید کو بالکل بے سود سمجھ چکے تھے۔
چنانچہ وہ فرماتے ہیں : اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو ، جو کچھ اس کے لیے مستحسن اور
اولیٰ ہوگا ، ظہور میں آجائے گا۔ ظاہراً تاکید مفید نظر نہیں آتی۔" [1]

لانا محمد جعفر تھانیسری نے آپ کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے :

"تین برس آپ مکتب میں رہے مگر سوائے قرآن کی چند سورتوں کے آپ کو کچھ
بھی یاد نہ ہوا۔" [2]

رزا حیرت دہلوی نے سید صاحب کی تحصیلِ علم کے بارے میں اپنی تحقیق یوں پیش کی ہے :

"یہ تعجب سے نظر کیا جاتا ہے کہ بزرگ سید بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ
سے پرلے درجے کا غبی مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا ، اسے تعلیم دینا
بے سود ہے ، کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں۔ میں ذہن کی بابت کوئی رائے
قایم نہیں کر سکتا۔ صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ سید کی بچپن میں کیا بلکہ
عنفوانِ جوانی میں بھی لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع نہ تھی۔" [3]

---

[1] غلام رسول مہر ، سید احمد شہید ، ص ۷۱ — [2] محمد جعفر تھانیسری ، حیاتِ سید احمد شہید ، ص ۶۲

[3] حیرت دہلوی مرزا ، حیاتِ طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۲۴

موصوف نے سید صاحب کے ذہن کے بارے میں اپنی کوئی رائے تو ظاہر نہیں کی لیکن سید صاحب کے علم سے کورے رہنے اور اُن کے ذہن کی کیفیت و تیزی ضرور بیان کر دی ہے۔ مثلاً وہ تصریح کرتے ہیں :

"یہ نہیں تھا کہ پیارا اور واجب الاحترام سید سبق کے یاد کرنے میں محنت نہ کرتا ہو اور شرارت سے ڈھیٹ بنا خاموش بیٹھا رہتا ہو۔ نہیں، وہ بخوبی محنت بھی کرتا تھا۔ میاں جی کے کہنے کے مطابق مکتب کے وقت کی بھی پابندی کرتا تھا۔ اس پر بھی اُسے یاد نہ ہوتا تھا۔ اُس کے ذہن اور یادداشت کا یہ اُتار چڑھاؤ دیکھ کے یہ خیال آتا تھا کہ جیسے چلتی گاڑی میں کوئی روڑا اٹکا دیتا ہے اور پھر وہ بیلوں کی طاقت سے بھی نہیں چلتی۔ سوائے اس کے کہ اس پر انتہا درجے کا زور لگایا جائے تو پہیہ دو چار انچ زمین سے رگڑ کھاتا ہوا بمشکل آگے بڑھے گا۔ یہی کیفیت بعینہٖ بزرگ سید کی تھی۔ جب وہ ایک ایک جملہ کر گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا۔ تب کہیں کسی قدر یاد ہوتا تھا اور دوسرے دن تماشا یہ تھا کہ وہ بھی چوپٹ۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو والدین اور میاں جی کی تنبیہ بڑھنے لگی اور گھرکی، جھڑکی، آنکھیں نکالنے سے گزر کے مارپیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ اِس سے بھی والدین کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ قدرتی طور پر اِس کے دماغ میں قفل لگ گیا ہے اور یہ کسی طرح کی تنبیہ سے بھی نہیں پڑھ سکتا تو ناچار ہو کے پڑھنے سے اُٹھا لیا اور زیادہ جبر کر کے معصوم جان کو گھلنے نہ دیا۔" [۱]

جناب غلام رسول مہر نے سید صاحب کی نوجوانی کے دور میں ذہنی اور تعلیمی حالت کے بارے میں جبکہ وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے پاس تھے، یوں وضاحت کی ہے :

"مولوی عبدالقیوم کا بیان ہے، اثنائے تحصیل علم میں سید صاحب کی یہ کیفیت

---

[۱] حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ مطبوعہ لاہور، ص ۳۰۹

ہوئی کہ جب کتاب کو دیکھتے تو حروف اُن کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی بیماری ہو گئی ہے۔ طبیبوں سے رجوع کیا گیا مگر یہ کیفیت زائل نہ ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز تک یہ بات پہنچی تو اُنھوں نے فرمایا: جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر جماؤ اور دیکھو کہ وہ بھی نظروں سے غائب ہوتی ہیں یا نہیں؟ کوئی باریک سے باریک چیز غائب نہ ہوئی، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ جب کسی نیازمند نے اس حکم کا سبب پوچھا تو فرمایا: اگر اور باریک چیزیں غائب نہیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ یہ مرض نہیں۔ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم ظاہری ان کی قسمت میں نہیں۔" [1]

ان تصریحات کی روشنی میں مرزا حیرت دہلوی کا بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب بچپن اور کیا جوانی میں بھی علم کی دولت سے محروم رہے کیونکہ اُن کے دماغ میں قفل لگا ہوا تھا۔ میں تیس سال کی عمر تک یہی تعلیمی کیفیت اور ذہنی حالت رہی۔ باقی عمر میں علم کے نزدیک تک جانے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چونکہ حالت نیم مجذوبانہ تھی اسی لیے ادعائے نبوت کے لیے کسی کی نگاہوں میں جچ گئے۔ انگریزوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئی ہوں گی کہ نواب امیر خاں کی ملازمت کے دوران ہی الہامات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اُدھر کسی انگریز حاکم کی طرف سے رازداری کی بات ہوتی، اُسے خدا کی طرف منسوب کر کے، الہام کے نام سے مشتہر کرنا شروع کر دیا جاتا تھا۔ ادھر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے صراطِ مستقیم کتاب لکھ کر موصوف کے اندر نبوت کے تمام اوصاف بدرجہ کمال بتا دیے بلکہ سید الانبیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مماثل ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا۔ جب سوانح نگاروں اور حاشیہ برداروں کی باری آئی تو انھوں نے سید صاحب کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات میں ایسا رنگ بھرنا شروع کر دیا کہ اگر انھیں کوئی "بعد از خدا بزرگ توئی" کے منصب پر سرفراز نہ بھی کرے تو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برابر ماننے بغیر تو چارہ نہ رہے۔ سید احمد صاحب ایسی

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید

شکمِ مادر میں تھے کہ اس وقت بھی اُن کا وجود نورِ مصطفوی جیسا نظر آیا۔ چنانچہ یہی کچھ منوانے کی خاطر غلام رسول مہر نے وقائع احمدی کی ایک گھڑ ت یوں مشتہر کی ہوئی ہے:

"سید صاحب جب والدہ کے پیٹ میں تھے تو اُس محترمہ نے ایک روز خواب دیکھا کہ میرے خون سے ایک کاغذ لکھا گیا ہے جو تمام عالم میں اڑتا پھرتا ہے۔ اس پر تشویش ہوئی۔ یہ خواب اُن کے داماد عبد السبحان نے سنا تو کہا کہ تشویش کی ضرورت نہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے پیٹ میں ہے، وہ دنیا میں بہت نامور ہوگا۔ ایامِ حمل تکمیل کے قریب پہنچے تو یکایک حمل کے ظاہری آثار مٹ گئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وضع کا زمانہ ابھی دور ہے۔ تھوڑے دن بعد سو کر اُٹھیں تو پھر پورے آثار نمودار ہو گئے۔ صفر کی چھٹی تاریخ کو سید صاحب پیدا ہوئے۔" [1]

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کا خواب ہیں تو سید صاحب کو یہ حضرات کیسے پیچھے رہ جانے دیتے۔ لہٰذا خواب تیار کر لیا۔ لیکن یہ حضرات اگر فنِ تعبیر سے مس رکھتے تو اس خواب کو جس طرح فخریہ مشتہر کر رہے ہیں اس سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتے، کیونکہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وارد ہونے والا کسبِ رزق کے بعض ناجائز ذرائع کا مروّج و موجد ہوگا، اس لیے کہ قرآن کریم میں جن چار اشیاء کی حرمت یکجا مذکور ہے، اُن میں سے ایک (وَالدَّمَ) یعنی خون ہے۔ علاوہ بریں آنے والا یُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ یعنی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی میں شہرت و ناموری حاصل کرے گا۔ یہ ہے اس خواب کی تعبیر، جس میں سے صرف شہرت و ناموری کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اب بیانِ مذکورہ کا دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ حقیقتِ محمدیہ چونکہ نور بلکہ جانِ نور ہے، اسی وجہ سے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شکمِ مادر میں تھے تو ظاہری آثار کم ہی محسوس ہوئے اور ایامِ حمل کی تکالیف و ثقل وغیرہ میں سے کچھ نہ تھا۔ اگر سید صاحب کے بارے میں کوئی ایسی گھڑت نہ کی جاتی تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی مرتبے سے ان کا بناوٹی رتبہ کم رہ جاتا۔ اسی لیے

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۴۰

ز وقت اِس صفت معجزے کا انتظام یُوں کیا گیا:

"ہر چند آپ (سید صاحب) کے اُستاد اور باپ بھائی آپ کی تحصیلِ علم کے واسطے کوشش کرتے تھے مگر آپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ آثارِ اُمیّت، نبی اُمّی کے مثل، جو بطور میراث آپ کی جبلّت میں امانت تھے روز بروز ظاہر ہونے لگے"۔[1]

م صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا، آپ کا معجزہ اور خصائص میں سے ہے۔ غیر انبیاء کا ان پڑھ قص اور محرومی ہے۔ سید صاحب کی محرومی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے ان کی اُمیّت کا ڈھونگ ایک بدترین جسارت ہے۔ اگر محبوبِ پروردگار سے اس طرح شلیت قائم کی جانے لگے تو دنیا وں سے جاہل اجڈ کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نظیر بنانے کی کوشش نہ کی جا سکے گی؟ ریدو عمر کو آپ جیسا بتانے کی قیامت برپا ہونے لگے گی؟ محمد جعفر تھانیسری نے اُمیّت کا خود نہیں گھڑا بلکہ مولانا محمد اسمٰعیل دہلوی نے ہی اس طائفہ کو یہ سبق پڑھایا ہے:

از بسکہ نفسِ عالی حضرت ایشاں بر کمال مشابہت جنابِ رسالتمآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در بدو فطرت مخلوق شدہ بناء علیہ لوحِ فطرت ایشاں از نقوش علوم رسمیہ و راہ دانشمندان کلام و تحریر و تقریر مصفّٰی ماندہ بود۔[2]

چونکہ آپ (سید صاحب) کی ذات والاصفات ابتدائے فطرت سے جنابِ رسالتمآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی، اس لیے آپ کی لوحِ فطرت، علوم رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندوں کی رہ و روش سے خالی تھی۔[3]

ید صاحب ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۶ء میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے حضرت شاہ صاحب نے موصوف کو ابتدائی مشاغل کی تعلیم و تربیت دینی شروع کی اور

---

[1] جعفر تھانیسری، مولانا: حیات سید احمد شہید، ص ۵۲

[2] اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، مطبع ضیائی ۱۲۸۵ھ، ص ۴

[3] راطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۸۸

تصورِ شیخ کی تعلیم فرمانے لگے تو سید صاحب کو آسمان پر بٹھانے کی غرض سے ان کے سر ایک عجیب واقعہ منڈھ دیا گیا۔ مثلاً محمد جعفر تھانیسری کیسی سیدھی سادی بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا کر یوں دکھاتے ہیں:

"اس کے بعد شغلِ برزخ کہ جس میں تصورِ شیخ کا مراقبہ کرتے ہیں، آپ کو تعلیم دینی چاہی، اس وقت سید صاحبؒ نے بہت ادب اور عاجزی سے مولاناؒ سے عرض کیا کہ اِس شغل میں اور بُت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اُس میں صورتِ سنگی یا قرطاسی ہوتی ہے اور اس میں صورتِ خیالی۔ جو تہہ دل میں جگہ پکڑتی ہے، تعظیم کی جاتی یا پوجی جاتی ہے۔ تب مولانا نے یہ شعر حافظ شیرازی کا پڑھا:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

تب سید صاحبؒ نے عرض کیا کہ اگر حکم سے نوشی کا جو گناہ کبیرہ ہے، دیجیے تو اس کی تعمیل کو بھی حاضر ہوں مگر یہ عمل تصورِ تصویرِ شیخ کا، خصوصاً غیبتِ شیخ میں اس تصویر سے توجہ اور استعانت چاہنا جو بعینہٖ بُت پرستی اور شرکِ صریح ہے، مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر اِس کے جواز کے واسطے کوئی سندِ قرآن و حدیث یا اجماعِ اُمت کی موجود ہو تو بھی مضائقہ نہیں ہے۔ اِس تقریر کے سُننے اور سمجھنے کے بعد مولانا صاحبؒ نے سید صاحبؒ کو اپنی بغل میں لے کر اور آپ کے رخسار اور پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا کہ اے فرزند دلبند! حضرت حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و انعام سے ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء کی راہ تجھ پر کشادہ کی ہے۔ اُس وقت سید صاحبؒ نے مولانا ممدوح سے عرض کی کہ ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء میں فرق کیا ہے؟"[1]

جناب غلام رسول مہر نے اس واقعے کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

---

[1] جعفر تھانیسری: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۶۰، ۶۱

"پھر شغل برزخ کا حکم ہوا، جس میں صورتِ شیخ کا تصور صوفیہ میں مروج تھا۔ تصور صورتِ شیخ کا حکم سُنا تو سید صاحبؒ نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت! اِس شغل اور بُت پرستی میں کیا فرق ہوا؟ مفصل ارشاد ہو۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے جواب میں خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا: ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

سید صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہر حال فرماں بردار ہوں، اِس لیے کہ کسبِ فیض کی غرض سے آیا ہوں، لیکن تصورِ شیخ تو صریح بت پرستی معلوم ہوتا ہے۔ اِس خدشے کو زائل کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل پیش فرمادیں، ورنہ اِس عاجز کو ایسے شغل سے معاف رکھیں۔ شاہ صاحب نے یہ سُنتے ہی سید صاحب کو سینے سے لگالیا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا، اے فرزندِ ارجمند! خدائے برتر نے اپنے فضل و رحمت سے تجھے ولایتِ انبیاء عطا فرمائی ہے۔" ؎

لوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے پروپیگنڈے کو مخزنِ احمدی اور وقائعِ احمدی میں محفوظ کیا گیا۔ ابی علماء و مورخین نے اُن بیانات کو وحیِ الٰہی سمجھ کر، راہِ طریقت سے ناآشنا ہونے کی اپر، لبعینہٖ نقل کرنا، ماننا اور منوانا شروع کردیا۔ اِن تحریروں سے واضح ہو رہا ہے کہ سید احمد احب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے جملہ معتقدین، بیعت، شغلِ برزخ، کسبِ فیض، ولایتِ لیاء اور ولایتِ انبیاء کے معانی و مفہوم سے مطلقاً ناواقف ہیں اور جن حضرات کو اِس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہیں وُہ اپنے بڑوں کی بے راہ روی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے یا ایں عارفانہ سے کام لیتے رہتے ہیں۔ بھلا کہاں تصور اور کہاں یہ قیل و قال، وہاں تو کسی لیُ اللہ کے ہاتھ پر بکنا ہے بکانا نہیں۔ یہ مکالمہ محض اِسی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ اِن بزرگ کا

ؒ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۱۹--۲۰۰

اور خلاصۂ روزگار ہستیوں سے سید صاحب کو فوق ثابت کیا جائے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ولایت، خاص قُربِ خداوندی کو کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو انبیائے کرام کو اعلانِ نبوت سے پہلے اور نبوت کے ساتھ حاصل ہے، اسے ولایتِ انبیاء کہتے ہیں اور دوسری جو غیر انبیاء کو حاصل ہوتی ہے، اُسے ولایتِ اولیاء کہا جاتا ہے۔ سید صاحب کے لیے ولایتِ انبیاء ثابت کرنا اور وہ بھی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی "چہ دلاور است دُزدے بکف چراغ دارد" والا معاملہ ہے۔ یہ محض اپنی بدنیتی کے لیے حضرت شاہ صاحب کی آڑ لی گئی ہے۔

سب سے دل چھلنے والی ادا کہ تصورِ شیخ کو سید صاحب نے صریح شرک اور بُت پرستی بتا کر گویا سارے خاندانِ عزیزی دہلوی کو، ان کے جملہ پیرانِ عظام کو، حتیٰ کہ حضرات مجدد الفِ ثانی قدس سرہٗ تک کو صریح مشرک و بُت پرست ٹھہرا دیا، لیکن کسی سوانح نگار نے یہ تصفیہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اِس گرمنت کے بر بسبب حضرت شیخ مجدد سرہندی سے لے کر شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم تک کو مشرک اور بُت پرست ٹھہرایا جاسکے یا سید احمد صاحب و مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے آج تک کے وہابیوں کو اکابر اہلسنت کا مخالف، ولی اللّٰہی خاندان کو مشرک و بُت پرست کہنے والے اور تصوّف کی ابجد سے بھی بے بہرہ مانا جائے؟ بہرحال جس شغلِ برزخ کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے القول الجمیل میں قُربِ خداوندی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا، اُسی کے حاشیہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس کو سب سے سیدھا راستہ بتایا، حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی فاروقی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) نے اپنے ایک مرید کو اس کی مشق ہو جانے پر تحریر فرمایا تھا کہ یہ دولت خوش نصیب لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اُسی کو اگر کوئی ازراہِ بے خبری شرک و بُت پرستی بتاتا ہے تو ایسے حضرات سے سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ: ؎

لطفِ مے تجھ سے کیا کہوں زاھد!
ہائے کم بخت! تُو نے پی ہی نہیں

غلام رسول مہر نے اس معاملے کو سلجھانے کی غرض سے کچھ سخن سازی سے کام لینے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن جس طرح ایک فلسفی جتنا عقلی دلائل سے دور کو سلجھانا چاہتا ہے اسی قدر الٰہیات کی ڈور اور الجھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ مہر صاحب کو درپیش آیا، وہ سلجھانے بیٹھے مگر اس پر اطلاق کرنے کی کوشش نہیں کی یا بن نہ سکا، اسی لیے ڈور کو مزید الجھاتے ہی گئے۔ شغل کے سلسلے میں انھوں نے وضاحت کی ہے کہ:

"ممکن ہے اس سے کسی صاحب کو وسوسہ پیدا ہو کہ شاہ عبدالعزیز جیسا یگانہ عالمِ دین اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ تصورِ صورتِ شیخ کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی سند موجود نہیں یا اس تصور کو عام صنم پرستی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس بارے میں تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیال یہ ہے کہ صوفیہ نے طالب کی توجہ جمانے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ ان میں سے ایک طریقہ تصورِ صورتِ شیخ کا بھی تھا، جس سے یہ بزرگ کام لیتے رہے۔ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک و مزکّی تھی کہ اسے قبول نہ کر سکی۔ شاہ صاحب چونکہ طبیب حاذق تھے، اس لیے سمجھ گئے کہ یہ دوا سید کے مزاج کے لیے سازگار نہ ہوگی، لہٰذا اسے چھوڑ دیا۔ جب یہ مقصود دوسرے طریقوں سے بر وجہِ احسن حاصل ہو سکتا تھا تو تصورِ شیخ پر اصرار کی ضرورت نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ جس عمل کے لیے کتاب و سنت میں کوئی مبنیٰ موجود نہ ہو، ہر مدعی اسلام کے نزدیک لازماً ناقابلِ قبول ہونا چاہیے، کیونکہ دین کا ماخذ کتاب و سنت ہیں، نہ کہ کسی طبقے کا عمل۔"[1]

قطعِ نظر اس کے کہ شغلِ برزخ کا ثبوت کتاب و سنت میں ہے یا نہیں، وہابی محققین کی تصریحات کے مطابق اس صنم پرستی کی زد میں سب سے زیادہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ آتے ہیں۔ انھوں نے تصورِ شیخ کو باقاعدہ طور پر اپنی تعلیمات کا ایک جزو بنایا اور اس میں مہارت

---

[1] غلام رسول مہر، سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۸۰

حاصل کرلینے والوں کو خوش نصیب بتاتے رہے۔ اس قتانے پر آتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے جد مشایخ جن سے آپ نے یہ شغل سیکھا، اپنے مریدوں کو سکھایا اور اپنی کتاب "القول الجمیل" میں اسے قربِ الٰہی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ٹھہرایا۔ اس کی زد میں آتے ہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو اسے قربِ خداوندی حاصل کرنے کا سب سے سیدھا اور آسان راستہ بتاتے تھے اور عمر بھر اس کے عامل و مبلغ رہے۔ مہر صاحب بتاتے ہیں کہ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور منزّہ تھی کہ شغلِ برزخ کو قبول نہ کر سکی۔ گویا حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم کی طبیعتیں ناپاک اور گندی تھیں کہ اس بت پرستی کو وہ حضرات قبول کرتے رہے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ حقیقت یہ ہے کہ وہابی حضرات خواہ مخواہ تصوف کے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھتے ہیں جبکہ وہابیت اور تصوف دو متضاد چیزیں ہیں۔ مہر صاحب نے اپنے بارے میں ذرا جرأت سے کام لے کر یوں اعتراف بھی کیا ہے:

"ان تمام اُمور یا شغلِ برزخ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ خود اس کوچہ سے نابلد ہوں۔"[1]

جملہ حالات و کوائف کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس سارے ڈرامے کی ابتدا مولوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۸ء) سے ہوئی۔ حقیقت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ویسے اس قسم کے سازشی معاملے کانوں سے ہی پہچانے جاتے ہیں ورنہ جعفر و صادق کو کس نے انگریزوں سے معاہدہ کرتے دیکھا تھا اور کون سا تحریری ثبوت اُن کی انگریز دوستی اور ملک و ملت فروشی کا دیا جا سکتا ہے۔ موصوف سے سر ڈیوڈ آکٹر لونی وغیرہ نے تعلقات پیدا کر کے آمادہ کیا ہوگا۔ انھوں نے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کو تیار کیا۔ موصوف نجد کے محمد بن عبدالوہاب اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی تحریکوں سے متاثر تھے یا متاثر ہو گئے۔ سید احمد صاحب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۹۱

دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے ان کی نیم مجذوبانہ حالت دیکھی تو اِس
ے کا اہم ترین پارٹ ادا کرنے کے لیے وہ بڑے موزوں نظر آئے ہوں گے۔ مولوی عبدالحی و
عیل صاحبان نے انہیں سر آنکھوں پر جگہ دے کر رغبت دلائی ہو گی کہ وہ ایک اصلاحی تنظیم بنانا
م چلانا چاہتے ہیں۔ موصوف کے رضامند ہونے پر تثلیث قایم ہو گئی۔

سید احمد صاحب چونکہ غیر معروف تھے لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت
پہ فیضیاب ہونے لگے ہوں گے کہ اس چکر میں پھنس گئے۔ یار لوگوں نے حضرت شاہ صاحب
بضان کا نام کر کے اپنی مقصد برآری کے لیے سید صاحب کو آسمان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ ان
ہر معمولی واقعے کو کرامت اور معجزہ بنا کر دکھایا جاتا۔ ان کی پالکی کے پیچھے پیچھے دوڑنا اپنی سعادت
ے، موصوف کے آگے خود دم نہ مارتے۔ جب علماء کو یہ کچھ کرتے دیکھا گیا تو بہت سے لوگ
ت کے جال میں پھنسنے لگے اور خاصی شہرت حاصل ہو گئی۔

سید احمد صاحب کو آسمان پر بٹھانے اور اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر
ت فراہم کرنے کی غرض سے اُن کے ملفوظات کا بہانہ کر کے مولوی عبدالحی و مولوی محمد اسمٰعیل
ن نے صراطِ مستقیم کتاب گھڑی اور اُس میں بڑی رازداری کے ساتھ اپنے پیر کو انبیائے کرام
صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ دعویٰ صرف امامت کا تھا لیکن صفات نبوت کی ثابت
ر رہی تھیں۔ مثلاً ایک عبارت ملاحظہ ہو:

صدیق من وجہ مقلدِ انبیاء می باشند و	صدیق من وجہ انبیاء کا پیرو اور من وجہ
من وجہ محقق در شرائع۔ پس اگر	شریعت کا محقق ہوتا ہے۔ پس اگر
صدیق زکی القلب ست رضا و	صدیق زکی القلب ہو گا تو وہ مخصوص
کراہیت حضرتِ حق در افعال و	اقوال اور افعال میں خدائے تعالیٰ
اقوالِ مخصوصہ و صحت و بطلان در	کی خوشنودی اور ناراضگی کو
عقایدِ خاصہ و محمودیت و مذمومیت در	اور مخصوص عقائد کے صحیح اور غلط ہونے
اخلاق و ملکات شخصیہ بنورِ جبلی خود دریافت	اور خاص لوگوں کے عادات اور استعداد کے
می نماید۔[۱]	کے بھلا برا ہونے۔ کو اپنی طبیعت

[۱] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۳۸

کے نور سے معلوم کر لیتا ہے۔ [1]

ذرا آگے چل کر اسی امر کو تفصیل سے بیان کیا اور یوں دن دہاڑے قیامت ڈھائی ہوئی ہے،

پس احکام این امور مذکوره اورا بدو
وجه معلوم می شود، یکے بشہادتِ
قلبِ خود خصوصاً و دیگر بسبب اندراجِ
او در کلیاتِ شرع عموماً۔ و علم که بوجه
اول حاصل شده تحقیقی ست و ثانی
تقلیدی۔ و اگر زکی العقل ست نورِ
جبلّی او بسوئے کلیات اورا رہنمونی
می فرماید۔ پس علوم کلیه شرعیه و حکم
و احکامِ ملت اورا شاگرد انبیاء ہم می
توان گفت و ہم استاد انبیاء ہم۔
و نیز طریق اخذ آنہم شعبه ایست
از شعب وحی که آن را در عرفِ
شرع بنفث فی الروع تعبیر
می فرمایند و بعضے اہلِ کمال
آن را بوحی باطنی می نامند۔ [2]

پس ان امور مذکورہ کے احکام اُن کو
دو وجہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک
تو دل کی شہادت سے جو خاص کر
ان امور سے متعلق ہے، دوم عام
طور پر کلیاتِ شرع میں اُن کے
مندرج ہونے کے سبب سے۔
اور جو علم کہ پہلے طریق سے اُس کو
حاصل ہوا ہے وہ تحقیقی ہے اور جو
علم کہ دوسرے طریق سے جو حاصل
ہوا ہے وہ تقلیدی ہے۔ اور وہ
صدیق زکی العقل ہے تو اُس کے
طبعی نور کی ان کلیات حقہ کی طرف
رہنمائی کی جاتی ہے۔۔۔۔ پس کلیاتِ
شریعت اور احکامِ دین میں اُس کو
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا شاگرد
بھی کہہ سکتے ہیں اور اُن کا ہم استاد
بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور نیز اس کے
اخذ کا طریق بھی وحی کی شاخوں میں
سے ایک شاخ ہے جس کو

---

[1] صراطِ مستقیم اردو، ص ۸۸

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۴۹

شریعت کی اصطلاح میں نفث فی
الروع کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور
بعض اہل کمال اس کو وحی باطنی
کہتے ہیں۔ [1]

مذکورہ دونوں عبارتوں میں موصوف نے تصریح کر دی کہ ایسے افراد کو نبی کا مقلد اور انبیاء [2]
کی تقلید سے آزاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ آگے اپنے نور جبلی سے کتاب و سنت کے بغیر خود بھی
[اللہ]ی تعالیٰ کی رضامندی و ناراضگی اور عقاید و افعال و اقوال کا اچھا یا برا ہونا معلوم ہو جاتا ہے
[او]ر بعض علوم ان حضرات کو انبیائے کرام کی وساطت کے بغیر ہی اپنے قلب کی شہادت سے
[حا]صل ہو جاتے ہیں اسی لیے جہاں انھیں انبیائے کرام کا شاگرد کہا جا سکتا ہے وہاں انبیاء
[کا ہم] استاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ براہِ راست شریعت حاصل کرنے کے اس شعبے کو نفث فی الروع
[او]ر وحی باطنی کہا جاتا ہے۔ موصوف کی یہ تصریحات عقاید اہلسنت و جماعت کے سراسر خلاف!
[او]لیاء کو نبی بتاتا اور روافض کا مذہب قبول کرتا ہے۔ موصوف کی اصطلاح میں اخذ
[علو]م شرعیہ کے اس طریقے کو حکمت کہتے اور اس مرتبے کو امامت و وصایت سے تعبیر کرتے ہیں۔
[آگے] چل کر آگے لکھتے ہیں:

ہمیں معنی را بامامت و وصایت تعبیر
می کنند و علم ایشاں را کہ بعینہٖ علم
انبیاء ست لیکن وحی ظاہری
متعلق نشدہ بہ حکمت می نامند۔ [3]

اس معنی کو امامت اور وصایت کے
ساتھ تعبیر کیا کرتے ہیں اور ان کے
علم کو جو بعینہٖ پیغمبروں کا علم ہے لیکن
ظاہری وحی سے حاصل نہیں ہوئے لہٰذا
حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ [4]

---

[1] صراط مستقیم، اردو: ص ۹۸
[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، صراط مستقیم، ص ۴۰
[3] صراط مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۹۱

کیا فرماتے ہیں دیوبندی، اہلحدیث اور جماعت اسلامی کے مفتی صاحبان محقق حضرات اور حقانیت کے علم بردار بننے والے! اگر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی محبت آپ حضرات کے دلو میں گوسالۂ سامری کی طرح سما نہیں گئی ہے اور آپ حضرات نے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر دہلوی موصوف کے دین کو ترجیح نہیں دے رکھی ہے تو کیا مذکورہ بیانات اعلانات کے خلافِ اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ ہے؟ کیا یہ غیر انبیاء کو مقامِ نبوت پر فائز کرنا نہیں ہے؟ کیا روافض کے علاوہ کوئی گمراہ سے گمراہ فرقہ بھی ان تصریحات کی تائید کرے گا؟ یہ آپ کی دینداری کے امتحان کا موقع ہے کہ آپ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں یا اپنے نبوت بانٹنے والے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی ہی آپ کی نظر میں سب کچھ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ تو اس بارے میں یہ ہے:

معرفتِ احکامِ شرعیہ بدون توسیط نبی ممکن نیست۔ ؎۱	احکامِ شرعیہ کا معلوم ہونا، نبی کی وساطت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اہلسنت وجماعت کے مایۂ ناز محقق علامہ عبدالغنی نابلسی علیہ الرحمہ یوں فرماتے ہیں:

هذا القول كفر لا محالة بالاجماع من وجوه منها دعوى تلقي الاحكام الشرعية من الله تعالى بلا واسطة نبي وذالك دعوى نبوة۔ ملخصاً۔ ؎۲	یہ قول باجماعِ اُمت کئی طرح کفر ہے۔ اُن میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں نبی کی وساطت کے بغیر اللہ تعالیٰ سے شرعی احکام معلوم کرلینے کا ادعا ہے اور یہ نبوت کا دعویٰ کرنا ہے۔

دہلوی موصوف نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اپنے ممدوحین کو اُنھوں نے وحی باطنی سے سرفراز کر کے پیغمبروں کی طرح معصوم بھی بنا دیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے خود یوں وضاحت کی ہوئی ہے

؎۱ عبدالعزیز محدث دہلوی، مجدد: تفسیر عزیزی، جلد اوّل، ص ۴۴۲

؎۲ عبدالغنی نابلسی، امام: حدیقہ ندیہ، ص ۲۱۱

لابد او را بمحافظتے مثل محافظتِ انبیاءؑ کہ مسمیٰ بہ عصمت است فائز می کنند[1]	پس وہ ضرور انبیاء کی اُس محافظت جیسی نگہبانی کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے جس کو عصمت کہا جاتا ہے۔[2]

[...]ن وحی باطنی اور انبیائے کرام جیسی عصمت کو پُر اسرار طریقے سے اپنے پیر سید احمد صاحب [...] پہنچانے کی خاطر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے ایسے حضرات کی موجودگی کا یُوں صراحت سے [...]ن دا کیا تھا :

بدانی کہ اثبات وحی باطن و حکمت و وجاہت و عصمت مرغیر انبیاء را مخالف سنت و از جنس اختراعِ بدعت است ..... و بدانی کہ ارباب ایں کمال از عالم منقطع شدہ اند[3]	یہ نہ سمجھنا کہ باطنی وحی اور حکمت اور وجاہت اور عصمت کو غیر انبیاء کے واسطے ثابت کرنا خلاف سنت اور اختراعِ بدعت کی جنس سے ہے ..... اور یہ مت سمجھنا کہ اس کمال والے لوگ جہان سے منقطع ہو چکے ہیں[4]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنے پیر جی کے لیے وحی و عصمت وغیرہ نبوت کے تمام [...]مات تو جمع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسی کراماتیں گھڑ کر سُنانی شروع کر دی تھیں کہ [...]ذات کو بھی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھیں۔ ان حالات میں ایک خدشہ ضرور تنگ کرتا تھا کہ [...]ں تک سارا معاملہ زبانی جمع خرچ تک محدود تھا اور حقیقت کے میدان میں اُس کا کوئی شائبہ [...]ی نظر نہیں آ سکتا تھا۔ دریں حالات یہ تصور پریشان ضرور کرتا ہوگا کہ اگر کسی نے آج کل میں ایسی [...]امت کا مطالبہ کر دیا جس کی صحت کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جا سکے یا امیرِ سلطنت بننے [...]کے بعد جب نبوت کا دعویٰ کیا جائے گا تو اُس وقت معجزہ طلب کرنے والے کو طاقت استعمال [...]نے کے علاوہ اور کیا جواب دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ قبل از وقت اُس کی پیش بندی یوں

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی، صراطِ مستقیم فارسی، ص ۴۱   [2] صراطِ مستقیم اردو، ص ۹۳

[3] محمد اسمٰعیل، مولوی، صراطِ مستقیم ، ص ۴۲   [4] صراطِ مستقیم اردو، ص ۹۴، ۹۵

غیظ و غضب کے عالم میں فرمائی جاتی ہے:

"اور جس شخص سے معجزہ و کرامت نہ ہو اس کو پیغمبر اور ولی نہ سمجھنا وغیرہ یہ ہزاروں
رسمیں اور عادتیں سب یہود اور نصاریٰ اور مجوس اور منافقوں کی اور محمد والے
اگلے مشرکوں کی ہیں اور سوا اس کے اور ہزاروں رسمیں ہندوؤں کی ہیں کہ لوگوں
نے اپنے یہاں رائج کر لیں کہ پیغمبر خدا ایسی باتوں کے مٹانے، ایسی بری رسموں
کے دفع کرنے کے لیے آئے اور قرآن نازل ہوا۔ پھر جو شخص ایسی رسمیں اور
عادتیں اختیار کرے اور مسلمانوں میں جاری کرے تو وہ شخص اس حدیث کے
بموجب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغضوب ہے، راندا گیا، خدا کے غضب میں گرفتار
اور خدا کے دشمنوں میں شمار ہوا۔"[1]

اپنے امام کی اس ستم ظریفی پر وہابی حضرات داد تو خوب دیتے ہوں گے کہ جس شخص سے
کرامت ظاہر نہ ہو اسے ولی اور جو معجزہ نہ دکھائے اسے نبی ماننے سے لوگ انکار کریں تو
منجملہ ان باتوں کے ہے جن سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بقول دہلوی صاحب منع فرما
تھا۔ کیا وہابی حضرات ہمیں سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہ ارشادِ گرامی دکھانے
زحمت گوارا کر لیں گے جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ میرے بعد جب کوئی نبی آئے اور وہ تمہیں معج
دکھائے تو اس کی نبوت کا انکار نہ کرنا۔ اگر روئے زمین کا کوئی وہابی، کوئی مولوی اسمٰعیل دہلو
کا عقیدت مند ہمیں ایسی ایک ہی حدیث دکھا دے تو ہم اس کے بیحد ممنون ہوں گے فَإِ
لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۔

مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کی خاطر سیکڑوں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ ا
کی واضح مثال دہلوی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت بھی ہے، جس میں ادّعائے نبوت ۔
فراڈ کو چھپانے کی خاطر بیسیوں جھوٹ بولنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو ایسی عادت
سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)۔ معراج ہمارے آقا و مولیٰ سیدنا محمد رسول اللہ صلی

---

[1] سلطان خان، مولوی، تذکیر الاخوان اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳، ۲۴

لہٗ علیہ وسلم کے عظیم معجزات سے ہے ۔ معراج شریف میں جہاں تک آپ کی رسائی ہوئی وہاں کسی دوسرے نبی تو کیا کلیم و خلیل علیہما السلام جیسے جلیل القدر اور اللہ تعالیٰ کے لاڈلے پیغمبروں کو بھی نہ ہوئی ۔ لیکن وہابیت ہی کیا ہوئی جو حبیبِ خدا سے اپنے پیر جی کو بڑھا کر نہ دکھاتے نبی کریم لی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی حب اپنے پیر جی کے متعلق مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے لکھا ہے :

نسبت پیر خود تا اینکہ روزے حضرت
جل وعلا دستِ راست ایشاں را
بدستِ قدرت خاص خود گرفتہ و چیزے
را از امورِ قدسیہ کہ بس رفیع و بدیع
بود پیشِ روئے حضرت ایشاں کردہ
فرمود کہ ترا ایں چنیں دادہ ام و چیز ہائے
دیگر خواہم داد ۔ ۱؎

ایک دن حضرت حق جل و علا نے
آپ کا داہنا ہاتھ خاص اپنے
دستِ قدرت میں پکڑ لیا اور کوئی چیز
امورِ قدسیہ سے کہ نہایت رفیع اور
بدیع تھی ، آپ کے سامنے کر کے
فرمایا کہ ہم نے تجھے ایسی چیز عنایت
کی ہے اور اور چیزیں بھی عطا کریں گے ۲؎

لوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی اسی گھڑنت کو موصوف کے اوّلین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی میں بھی خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے ۔ اُن کی یہ کتاب کراچی سے حیاتِ سید احمد شہید کے نام سے شائع ہوئی ہے ، جس کا مقدمہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے ۔ مذکورہ بیان اُس کتاب مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۱۰ پر ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے ۔ یہاں میں علمائے دین کہلانے والے اُن حضرات کی توجہ اس عبارت کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو مولوی اسمٰعیل دہلوی کی محبت و عقیدت میں شرعی حدود کو توڑ کر بہت آگے جا چکے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہٗ سے مصافحہ کرنا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر لین دین کا معاملہ خلاصۂ نوعِ انسانی یعنی حضرات انبیائے کرام علیہم السلام میں سے بھی کسی کو حاصل

۱؎ محمد اسمٰعیل دہلوی ، مولوی : صراطِ مستقیم ، ص ۱۶۵

۲؎ صراطِ مستقیم اردو : ص ۳۰۰

ہوا تھا؛ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے؛ بصورتِ دیگر انبیائے کرام علیہم السلام
اور سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سید احمد صاحب کا درجہ کونسی دیانت داری کے تحت
بڑھا چڑھا کر دکھایا جا رہا ہے؛ کیا روزِ محشر کسی فرضی قصّے کہانی کا نام ہے؛ کیا باری تعالیٰ جلّ شانہٗ
کی بارگاہ میں مرنے کے بعد ایک روز حاضری اور باز پُرس نہ ہوگی؟

پند ہا دادیم و حاصل شد فراغ
مَا عَلَيْنَا يَا أَخِيْ إِلَّا الْبَلَاغ

قرآنِ کریم میں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ جب
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کی وہ رفعت حاصل ہوئی جو کائنات میں کسی
کسی فرد کو حاصل ہوئی نہ حاصل ہو سکتی ہے تو دہلوی صاحب کو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ انفرادیت ایک آنکھ نہ بھائی اور اپنے نیم مجذوب پیر، سیّد احمد صاحب کا
جلّ شانہٗ سے مصافحہ اور لین دین جاکر وایا۔ اُدھر حبیبِ محبوب پروردگار کو دَنٰی کی گودی
میں لے کر فَاَوْحٰى کے نگر اٹھائے جا رہے تھے تو فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى کا عدیم النظیر
منصب مرحمت ہوا۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے سوچا کہ ساری کائنات میں سے یہ منصب
اگرچہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا لیکن پیرجی کے لیے یہ مقام ثابت نہ کیا تو افراد کی چوتھیر
اور ڈوارن ہیسٹنگ سے ملی ہے وہ اور کس کام آئے گی؛ لہٰذا صاف لکھ دیا کہ:

مکالمہ و مسامرہ بدست می آید۔[1]
ہم کلامی اور سرگوشی کے مستند پا
ہاتھ آتے ہیں۔[2]

دوسرے مقام پر حقیقی ہمکلامی کی موصوف نے یوں تصریح کی ہوئی ہے اور وہ بھی ایک آدھ بار
میں بلکہ بار بار:

گاہے کلام حقیقی ہم میشود۔[3]
اور کبھی کلام حقیقی بھی ہو جایا کرتا ہے۔[4]

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۲ — [2] صراطِ مستقیم، اردو، ص ۴۹
[3] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۰۲ — [4] صراطِ مستقیم اردو، ص ۲۲۴

تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ باتیں کسی غیر نبی کے لیے ثابت کرنا کفر ہیں جس پر امت محمدیہ کا
اجماع ہے۔ چنانچہ ملت اسلامیہ کے اس اجماعی عقیدے کو محدث کبیر حضرت قاضی عیاض مالکی
رحمۃ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے:

فذالك كفر باجماع المسلمين	یہ باجماع مسلمین کفر ہے اور اسی
وكذالك من ادعى مجالسة	طرح جو اللہ تعالیٰ سے ہم نشینی، اس
الله تعالى والعروج اليه	تک صعود و عروج اور اس سے
ومكالمته ۔ ملخصًا [۱]	باتیں کرنے کا مدعی ہو (یہ باتیں بھی
	اسی طرح کفر ہیں)

اگر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اس مقام پر اتنی سی وضاحت فرمانے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ
نبی کا یہ معاملہ تو لین دین اور صعود و کلام حقیقی کے واقعات پروردگار عالم کی بارگاہ سے متعلق
ہیں بلکہ یہ حالات تو اُن کے مجازی خداوند نعمت یعنی لارڈ وارن ہیسٹنگز کی سرکار میں پیش
آیا کرتے تھے، تو اُن کی اس کرم نوازی سے پاک و ہند کے مسلمان اس دَور کی ایک المناک
پُر اسرار الجھن میں پھنسنے سے محفوظ رہ جاتے۔ لیکن بُرا ہو اس حرص و ہوا کا جو کیسے کیسے
داناؤں کے افراد کو نہ صرف گمراہ کر دیتی ہے بلکہ گمراہ گری کی ایسی مشین بنا دیتی ہے جس میں
دن بدن کتنے ہی گمراہ ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

تمام وہابیہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام کو غیب کا علم قطعاً نہیں
تھا۔ دیوبندی حضرات تو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترجمانی اِن لفظوں میں
کرتے ہیں کہ واللہ لا ادری ما یفعل بی ولا بکم (الحدیث) اور شیخ عبدالحق روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو
دیوار کے پیچھے کا بھی علم نہیں [۲]۔ اس عقیدہ کو ان حضرات کے امام علی الاطلاق، یعنی مولوی محمد اسمٰعیل
دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں تکیہ کلام سمیت یوں بیان کیا ہے:

---

[۱] قاضی عیاض مالکی، محدث: کتاب الشفاء، ص ۳۶۰
[۲] خلیل احمد انبیٹھی، مولوی: براہین قاطعہ، مطبوعہ دیوبند، ص ۵۵

"کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔"[1]

لیکن اس ستم ظریفی کی داد کون دے کہ جو دروازے موصوف نے اولیائے عظام بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام تک کے لیے بند کر دیے تھے، جن کا کسی کے لیے کھولنا عقیدۂ توحید سے بغاوت اور کفر و شرک تھا، وہی دروازے موصوف نے بڑی فیاضی اور دلیری سے پیر جی کے لیے اس طرح کھول کر دکھا دیے کہ گویا تمام خزائن الٰہیہ کے وزیر خزانہ بلکہ مجاز و مختار ہی مولوی محمد شہید دہلوی تھے۔ چنانچہ آنجناب نے اس بارے میں لکھا ہے:

"برائے انکشاف حالاتِ سمٰوات و ملاقات ارواح و ملائکہ و سیر جنت و نار و اطلاع بر حقائق آں مقام و دریافت امکنہ آنجا و انکشاف امرے از لوح محفوظ ذکر یا حی یا قیوم است۔"[2]	آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور ملاقاتِ ارواح اور ملائکہ اور بہشت و دوزخ کی سیر اور اس مقام کے حقائق پر اطلاع اور اس جگہ کے مکانوں کے دریافت اور لوح محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یا حیّ یا قیّوم کا ذکر کیا جاتا ہے۔[3]

دوسرے مقام پر موصوف نے اپنی اس فیاضی کے دریا یوں بہائے ہیں:

برائے کشفِ ارواح و ملائکہ و مقامات	کشفِ ارواح و ملائکہ اور انکے مقامات

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۴۴

[2] محمد اسمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۲

[3] ایضاً، ص ۲۰۱

آنجا و سیر اکند زمین و آسمان و
جنت و نار و اطلاع بر لوحِ محفوظ شغل
دورہ کند و باستعانت ہمان شغل ہر
مقامے کہ از زمین و آسمان و بہشت
و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسر آن مقام
احوال آنجا دریافت کند و با اہل آن
مقام ملاقات سازد۔ [1]

اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی
سیر اور لوحِ محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے
دورے کا شغل کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس
زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے
جس مقام کی طرف متوجہ ہو، اسی شغل
کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اُس
جگہ کے حالات دریافت کرکے وہاں
کے رہنے والوں سے ملاقات کرے [2]

معلوم نہیں وہابی حضرات اپنے اس دین و ایمان پہ کتنے نازاں ہوں گے کہ ایک جانب
المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک میں بعطائے الٰہی ایسی کوئی طاقت تسلیم کرنے کے لیے
نہیں، جس کے ذریعے وہ حضرات چھپی ہوئی چیزوں (غیب) کو معلوم کرسکیں، لیکن دوسری
امام الوہابیہ صاحب نے اپنے متبعین کو شغلِ دورہ کا ایسا پیٹنٹ نسخہ بتا دیا جس کے ذریعے
ے، تمام چھپی ہوئی چیزوں کا خود بخود انکشاف ہوتا چلا جائے۔ اس کے ذریعے جس وہابی کا
چاہے جنت اور دوزخ میں گشت کر آئے، زمین و آسمان میں جس جگہ چاہے جا دھمکے،
ے لوحِ محفوظ سے اپنا یا غیروں کا ریکارڈ نوٹ کر کے لے آئے۔ آخر یہ کیا شعبدہ بازی
یہ کیسی کرشمہ کاری ہے؟

کیا انصاف اور دین و دیانت اسی کا نام ہے کہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو
دست سے بے خبر بتایا جائے اور اپنے مُلّاؤں پر چودہ طبق روشن دکھائے جائیں۔ اگر عقیدہ یہی
ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کو ایسی طاقت نہیں ملی تو وہابی مُلّاؤں کو پوری
کے مشاہدے کی طاقت کہاں سے مل جاتی ہے؟ کیا آپ حضرات کے نزدیک

---

[1] سمٰعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۸

[2] مستقیم اردو: ص ۲۴۰

دورے کا شغل حصولِ کمال میں کوئی نبوت سے بھی بلند و بالا مقام ہے؟ آخر یہ اپنے مُلاؤں کو نبیٔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کونسی دیانت داری کے تحت بڑھایا گیا ہے! بصورتِ دیگر اگر واقعی مُلاؤں کا مقام یہی ہے تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم تو آپ حضرات کی تصریحات کے مطابق اِن مُلاؤں کے مقابلے پر نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتا ہے۔ کیا یہی ہے آپ کا رسول پر ایمان لانا؟ کیا اُمتی کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس درجہ شان گھٹانے والے اُمتی ہی کہلاتے اور جنت میں جانے کے واقعی حقدار ہو جاتے ہیں

افسوس! سید احمد صاحب کو نبی منوانے کی خاطر کیسے کیسے پُراسرار طریقوں سے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یعنی کُند ذہن ہونا، لکھنے پڑھنے سے رغبت نہ رکھنا، کما کر کھانے سے عاری ہونا، حقوق العباد سے بے اعتنائی برتنا، علومِ شرعیہ سے کورے رہ کر جینا، تصوف کی ابجد سے بھی ناواقف رہنا، یہ تمام امور ایسے ہیں جو اُن کی ذات میں جمع ہو کر بزرگی کا ساز و سامان قرار پا جاتے ہیں۔ اگرچہ دوسروں کے حق میں اِن کا عیب ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے، لیکن سید احمد صاحب کی ذات میں اِن باتوں کا پایا جانا معلوم نہیں کس طرح ایسی ولایت کی سند ہے جو منصبِ نبوت کو بھی خیرباد کہہ رہی ہے۔ آخر یہ شعبدہ بازی کیا ہے کہ، ؎

تمہاری زلف میں آئی تو حُسن کہلائی
وہی تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

جب آپ اپنا نظریہ یا کوئی مسئلہ بیان کریں تو اُس کے دلائل کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے لیکن خوابوں کا پورا باب ایسا ہے جس کا ثبوت کوئی نہیں ہوتا، ماسوائے اِس کے کہ سچے خواب کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ غلط کار لوگوں نے جب بھی اپنی بزرگی کا جال بچھانا چاہا تو ہمیشہ فرضی خوابوں اور جھوٹے الہاموں کا سہارا ہی حاصل کیا، کیونکہ اِن کا قرآن و حدیث سے ثبوت پیش نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ قرآن کریم میں دکھا دیجیے کہ واقعی آپ نے خواب دیکھا ہے! نیز یہ کوئی نہیں کہے گا کہ واقعی آپ کو یہ الہام ہوا ہے اس کا حدیث سے ثبوت پیش کیجئے۔ اسی لیے لصوصِ دین کی ساری بزرگی کا دار و مدار جھوٹے خوابوں اور فرضی الہاموں ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اب ہم سید احمد صاحب کی مخصوص بزرگی کے بارے

ہ ایسے ہی خواب پیش کرنے کی جسارت کرکے انصاف پسند حضرات کو دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔
ت کے اوّلین سوانح نگار مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

جب تہائی رات باقی رہ گئی تو اس وقت دو آدمیوں نے آکر آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے خواب ہی میں دیکھا کہ آپ کے داہنے طرف رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور آپ سے فرما رہے ہیں کہ اے احمد! جلد اٹھ اور غسل کر۔ سید صاحب ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر نہایت شرم کے ساتھ دوڑتے ہوئے حوضِ مسجد کی طرف چلے گئے۔ اس کے باوجود کہ موسم سرما کی وجہ سے حوض کا پانی اس وقت یخ ہو رہا تھا مگر اس سرد پانی سے آپ غسل کرنے لگے اور اثنائے غسل میں حضرتؐ کو اور حضرت ابوبکرؓ کو اسی جگہ پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ آپ بہت جلد غسل سے فارغ ہو کر اُن حضرات کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ اے فرزند! آج شبِ قدر ہے، تو یادِ الٰہی میں مشغول ہو جا اور دعا و مناجات کرتا رہ۔ اس ارشاد اور تلقین کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔[1]

ہ رات سید احمد صاحب نے کیا دیکھا؟ یہ بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ کیجیے:

صاحبِ مخزن لکھتے ہیں کہ سید صاحب بارہا فرمایا کرتے تھے کہ اُس رات میں بفضلِ الٰہی واردات عجیب اور واردات غریب میرے دیکھنے میں آئے کہ تمامی درخت اور پتھر وغیرہ اشیاءِ دنیا کی سجدے میں سر رکھے ہوئے تحمید و تہلیل و تسبیح میں مصروف تھے۔ مگر ظرفِ ز[یر] کر ان ظاہری آنکھوں سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی، مگر چشمِ قلب سے سجدے میں پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اُس وقت میں بھی سجدے میں سر رکھ کر شکرِ الٰہی کا بجا لایا اور دُعا د

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۹۳

مناجات مناسب وقت کرنا شروع کیا۔ اس وقت فنائیت اور استغراق کامل مجھے حاصل ہُوا اور اسی حالت میں صبح تک سجدے میں پڑا رہا۔[1]

قارئین کرام! ذرا یہ تصریح مدِ نظر رہے کہ سید احمد صاحب کی باری آئی تو وہابی علماء معتقدین بڑی خوشی سے چشمِ قلب کا وجود بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور سید احمد صاحب کے لیے چشمِ قلب ایسی بینا تسلیم کی ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام دنیا کی اشیاء اور جملہ اشجار و احجار و نباتات بچشم معاینہ فرماتی رہی کہ یہ تمام چیزیں سجدے میں پڑی ہُوئی ہیں اور موصوف کے لیے بڑی حسرت کے ساتھ ایسے کان بھی تسلیم کر لیے گئے جو دنیا کی تمام چیزوں کی تحمید و تہلیل و تسبیح کر سُنتے رہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ اُن کی آوازیں بھی نہیں نکل رہی۔ گھر کی بات آئی تو مشرق و مغرب و شمال و جنوب تک دُوری نزدیکی کا سوال اُٹھ گیا۔ دیکھنا اور سُننا سب امرِ واقعہ ہو کر کمالات بن گئے۔

اس ستم ظریفی کی کوئی حد بھی ہے کہ جو قلم سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے لیے ایسے علوم و اختیارات بڑی فیاضی کے ساتھ تقسیم کرتے نظر آتے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ اُن کی تشہیر کرتے ہیں لیکن جب غیروں کا تذکرہ آئے یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بارے میں لکھنا پڑے تو یہی قلم یکسر خشک ہو جاتے ہیں۔ اُن سے فیاضی کی جگہ اس طرح بخیلی ٹپکنے لگتی ہے کہ دین و دیانت وہیں دار سے خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ عقل و خرد اپنا سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس بخیلی کا جائزہ لینے کی خاطر سارے وہابی بیڑے کے ناخدا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

"ہر چیز کی خبر برابر ہر وقت رکھنی، دُور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھُلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہہ میں، یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔"[2]

یہ موصوف نے اپنا عقیدہ اور قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے جو سید احمد صاحب پر قطعاً لاگو ہوتا نظر نہیں آرہا۔ اب اس کلیہ کی روشنی میں تصویر کا دُوسرا رُخ یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کا

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۹۳

[2] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۴۵

لیے، وُہ لکھتے ہیں :

"غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہیے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے، کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وُہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔" [1]

قارئینِ کرام! ابھی آپ نے صراطِ مستقیم کتاب سے مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی وہ عبارتیں پڑھی ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے پیر جی کے بتائے ہُوئے شغل دورہ کا ذکر کیا اور اُس کا یا تھا کہ اِس شغل کی مدد سے جب چاہے کوئی بھی وہابی زمین و آسمان کی جس جگہ کے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ جنت و دوزخ کی سیر میسر آسکتی ہے، فرشتوں اور روحوں سے کی جا سکتی ہے، لوحِ محفوظ سے جس امر کو دریافت کرنا مطلوب ہو اُس کا بچشمِ خود مطالعہ کر سکتا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی اور کیسا عقیدہ ہے کہ علم کے جو دروازے انبیائے کرام اولیائے عظام کے لیے قطعاً بند کیے ہُوئے تھے اور اُنھیں خدا کے لیے خاص بتایا ہے، دروازے ہر وہابی کے لیے چوپٹ کھولے ہُوئے ہیں۔ آخر دین و مذہب کو بازیچۂ اطفال کے سوا اور کیا ہے؛ اِس ستم ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے علم کا یہ دروازہ قطعاً بند بتایا گیا ہے۔ وہاں بھی چشمِ قلب کا کوئی تصور تک نہیں پیر جی کے لیے مسلّم ہے۔ چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے صاف صاف لکھ دیا:

"چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بارہا ایسا اتفاق ہُوا کہ بعضی بات دریافت کرنے کی خواہش ہُوئی اور وہ بات معلوم نہ ہُوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہُوا تو ایک آن میں بتا دی۔ چنانچہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں منافقوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت کی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑا رنج ہوا کئی دن تک بہت تحقیق کیا پر کچھ حقیقت معلوم نہ ہُوئی اور بہت فکر و غم میں رہے"

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۲، ۲۳

پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو بتا دیا کہ منافق جھوٹے ہیں اور عائشہؓ پاک ہیں۔[1] بلا
قطع نظر اس کے کہ امام الوہابیہ نے منافقین مدینہ کی ہمنوائی کرتے ہوئے واقعے کو قطعاً غلط
دیا ہے، ہم یہاں اپنے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ص
تعالیٰ علیہ وسلم بھی ان نام کے موحدوں کی نظر میں کسی بات کو معلوم نہیں کر سکتے تھے، بجز وحی
کیونکہ نہ ان کے پاس سید احمد صاحب کی طرح چشم قلب تھی اور نہ انھیں وہابی کشتی کے
کی طرح مراقبے کا شغل آتا تھا، جس کی مدد سے عرش و فرش اور جنت و دوزخ تک کی خبریں م
کر لیا کرتے یا لوح محفوظ سے پڑھ کر معلوم کر لیا کرتے۔ معلوم نہیں اس کے باوجود نبی آخر الز
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو زبانی طور پر کس طرح ساری کائنات کا سردار اور بعد از خدا بزرگ ت
مختصر' کا مصداق ٹھہراتے ہیں جبکہ وہابیوں کا ایک ملاجی بھی ان کے نزدیک علم و اختیار
سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بڑھا ہوا ہے اور سید احمد صاحب کی شان کا تو کہنا
کیا! وہابی حضرات کی تصریحات کے مطابق تو علم و اختیار کی رو سے سید صاحب ہی بعد
خدا بزرگ نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ اسی ستم ظریفی کی مزید حد کرتے ہوئے موصوف نے یہ
لکھا ہے:

> "کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلانے کے دل میں کیا ہے یا فلانے کی شادی کب
> ہوگی یا فلانے درخت کے کتنے پتے ہیں یا آسمان میں کتنے تارے ہیں، تو اس کے
> جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ و رسول ہی جانے۔ کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے
> رسول کو کیا خبر؟"[2]

ادھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کسی ایک درخت کے پتوں کی تعداد بتانے سے او
آسمان کے تاروں کا شمار جاننے سے بے خبر بتایا جا رہا ہے کہ معاملہ غیروں کا ہے لیکن ادھ
سید احمد صاحب کو روئے زمین کی تمام اشیاء، دنیا کے سارے اشجار و احجار سے خبردا

---

[1] محمد اسمعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۵۵

[2] محمد اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۰۰

ں تسبیح وتہلیل وغیرہ کا سامع بتایا گیا ہے کیونکہ یہ معاملہ اپنوں کا ہے۔ کیا وہابی حضرات اپنے
لا اطلاق کے بتاتے ہوئے اس نظریہ پر کبھی نظر ثانی کی زحمت گوارا کریں گے کہ ایک درخت
یاسنے کو غیب دانی شمار کر کے دہلوی صاحب اُن کی گنتی سے سرورِ کون ومکاں صلی اللہ تعالیٰ
و بے خبر ٹھہراتے اور اُن کے لیے اتنا سا علم ثابت کرنا بھی توحید کی جان پر چھری بتاتے ہیں
دا احمد صاحب کو دنیا وما فیہا سے خبردار ٹھہرانا کیوں شرک نہ ٹھہرا؛ اس طرح وہابی حضرات
ں سید احمد صاحب کی عظمت اور وقعت کم رہی یا زیادہ؛

ہو سکتا ہے کہ بعض وہابی مناظر یہ کہنے لگیں کہ دہلوی صاحب اُس علم کو شرک ٹھہرا رہے ہیں
حاصل رہے جبکہ سید صاحب کا معاملہ صرف ایک رات کی بات ہے۔ تو ایسے حضرات کے
ت کا مطلب یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے کسی کو اپنا شریک نہیں بناتا ہاں ایک
لیے بنا لیا کرتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

ارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرما لیا کہ سید احمد صاحب کو کیسی رازداری اور غیر محسوس طریقے
بارگاہِ انبیاء بلکہ نبی الانبیاء سیدنا وشفیعنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے
علوم واختیارات والا دکھایا جا رہا ہے۔ اس کرتوت سے نہ ان حضرات کے عقیدۂ توحید
تا ہے اور نہ اُمتی ہونے میں۔ بہر حال ذکر تھا سید صاحب کا کہ وہ رات بھر کائنات کی
ہر کو اُن کی باطنی حالت میں چشمِ قلب سے دیکھتے رہے اور جس خاموش زبان میں بھی
شیاء تسبیح وتہلیل بیان کر رہی تھیں اُسے سید صاحب رات بھر سماعت فرماتے رہے۔
نوراسے کا اگلا پارٹ بھی ملاحظہ ہو:

جب بعد ادائے اشراق بخدمت مولانا صاحب (شاہ عبد العزیز محدث دہلوی
ۃ اللہ علیہ) کے حاضر ہو کر سلام علیک کہا تو بہت مسرور اور محظوظ ہو کر آپ نے
یا کہ باری تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ آج کی شب اپنی مراد کو پہنچ گئے۔
ن اُس روز کے بعد سے آناً فاناً آثارِ ترقیات وعلو درجات ومعاملات
جب وواردات غریب آپ پر ظاہر ہونے لگیں۔"[1]

---

[1] تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، ص ۶۴

جائے تعجب ہے کہ جو دروازے انبیاء کرام علیہم السلام تک کے لیے وہابی حضرات کے آ
علی الاطلاق نے بند بتائے ہیں تو یہی دروازے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
دشمنوں نے کس طرح کھلا ہوا تسلیم کر لیا؟ آخر یہ عقدہ کوئی تو حل کرتا کہ حضرت شاہ صاحب علیہ ا
کو کیسے معلوم ہوا کہ سید احمد صاحب آج اپنی مراد کو پہنچ گئے ہیں؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ
حضرات نے اپنی ہی اصطلاح کے مطابق علیم بذات الصدور بھی مان لیا اور اس
با وجود صرف شرک کی زد سے بچے رہے بلکہ توحید کے ٹھیکیدار بھی بن گئے۔ اب اسی المناک
کا ایک ایسا خواب بھی ملاحظہ فرمائیے جو مسلمانوں کے قلب و جگر کو چھلنی کر دیتا ہے۔ لکھا ہے

"اس معاملۂ عجیبہ کے بعد صاحب مخزن نے بحوالہ صراط مستقیم لکھا ہے کہ ایک
خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چھوہارے اپنے دست مبارک سے
سید صاحب کے منہ میں ایک دوسرے کے بعد رکھ کر بہت پیار اور محبت سے
کھلائے اور جب آپ بیدار ہوئے تو ان چھوہاروں کی شیرینی آپ کے ظاہر و
باطن سے ہویدا تھی۔ اس کے بعد ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدہ
فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو سید صاحب نے خواب میں دیکھا۔ اسی رات
کو حضرت علیؓ نے اپنے دست مبارک سے آپ کو نہلایا اور حضرت فاطمہؓ نے ایک
لباس اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنایا۔ ان واقعات کے بعد کمالات طریقۂ نبوت
کے غایت آب و تاب کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہونے لگے۔"[1]

احقر کم از کم یہ نہیں سمجھ سکا کہ کسی چالیس سالہ جیتے جاگتے آدمی کو نہلانے کا مطلب کیا؟
مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کا قلم اس خواب کو گھڑ کر سپرد قلم کرنے سے پہلے خشک ہو گیا
خاتون جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سید احمد صاحب کو اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنانے
ذکر سے کہ کوئی وہابی شرم و حیا کو اس درجہ گھول کر پی گئے ہوں کہ انھیں ان لفظوں کے
گانی تسلیم کر لینے میں کسی قسم کا تامل ہو۔ تامل کرنے والے سے، خواہ وہ پڑھنے سے ...

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۹۲

ہاں ہو، کہا جاسکتا ہے کہ حضورِ والا! کل رات جب میں غسل کر کے فارغ ہوا تو آنجناب
رۂ محترمہ یا حضورِ والا کی بیگم صاحبہ یا حضرت جی کی صاحبزادی صاحبہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے
ہ پہنائے تھے۔ اس کے بعد دیکھنا کہ علامہ صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔ مارے غصے کے
سے باہر ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیسے کیسے سانپ کی طرح بل کھائیں گے۔ آخر غصہ کیوں نہ
کہ اُن کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ لیکن یہی بات جب امام حسن و امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما
رۂ محترمہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجۂ مطہرہ اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ
سلم کی لاڈلی صاحبزادی جگر جگر کے ٹکڑے کے لیے کہی جائے تو کیا یہ کھلی گالی نہیں ہے؟

میں اِس عارفانہ تجاہل کے صدقے
ہر اک دل کو چھیدا مرا دل سمجھ کے

جب سید احمد صاحب بیعت کا کاروبار شروع کرتے ہیں تو براہِ راست اپنے پروردگار
سے اس کی مرضی پوچھتے ہیں اور اُدھر سے جواب بھی مرحمت فرمایا جاتا ہے۔ اولین سوانح نگار
الفاظ میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے اور مفہوم و معانی کے سمندر میں تقویۃ الایمان سامنے
رکھ کر لگایا جائے۔ وہ بڑے فخر و غرور کے ساتھ اپنے کفیل و شفیع المذنبین سید احمد صاحب کا
بیان کرتے ہیں:

"پس اِس معاملۂ اخذِ بیعت میں تیری کیا مرضی ہے؟ جناب باری سے حکم
ہوا کہ جو کوئی تیرے یا تجھ پر بیعت کرے گا، خواہ وہ لاکھوں ہوں، ہر ایک کی
کفایت کروں گا۔"[1]

یہ ہے تو سید احمد صاحب کی اُس شفیع المذنبینی کا تذکرہ تھا جو وہابی حضرات کے نزدیک
مسلّم ہے اگرچہ اُن کے نزدیک سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ منصب حاصل
چونکہ یہاں بغیر استدعا کیے تمام مریدانِ سید صاحب کی مغفرت کا وعدہ ہو گیا۔ اسی
میں دوسرے مقام پر یوں لکھا ہے:

---

[1] جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۶۵

"قصبہ مجادن میں قیام کے دوران وہاں ایک عجیب واردات ظہور میں آئی۔ ایک روز حضرت سید صاحب بعد نماز فجر کے مراقب بیٹھے رہے ۔۔۔۔ حمد و ثنا کے بعد آپ سجدے میں گر پڑے اور سجدے سے سر اٹھا کر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ آج ہاتف غیب نے مجھے بشارت دی ہے کہ اس وقت تجھ کو اور تیرے کل ہمراہیوں کو میں نے بخش دیا اور اس ندا کے بعد ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا۔ اُس ہاتھ نے اِس مسجد کو جنت الماویٰ میں لے جا کر داخل کر دیا۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ اس مسجد میں جس قدر آدمی موجود ہیں ان سب کے نام ایک کاغذ پر لکھ لو اور ان کو اصحابِ بدر کی طرح بارگاہِ ایزدی کے مقبول و منظور تصور کرو۔" [1]

سیفلا جب مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی لگاتار کوشش کی جائے کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو اپنی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھی کام نہیں آئیں گے۔ آپ اللہ کے یہاں اُن کی ذمہ داری اُٹھانے، بخشش کروانے سے بھی جواب دے بیٹھے تھے لیکن سید احمد صاحب کے سامنے جھکنے سے بغیر کسی عرض معروض ہی کے مغفرت کی بشارت مل جاتی ہے تو اُدھر جانے کے بجائے سیکڑوں نہ اِدھر آئیں گے کہ دنیا ہی میں بخشش سے نواز دیے جائیں۔ کیا تالیفِ قلوب کے اس جال اور شعبدہ بازی کے کمال کا کوئی جواب ہے؟ مسجد تو جنت الماویٰ میں داخل ہو گئی لیکن بیٹھے بٹھائے سید صاحب کے ہمراہی اصحابِ بدر کی طرح بارگاہِ ایزدی کے مقبول و منظور کس طرح ہو گئے جبکہ یہ خصوصیت پوری اُمتِ محمدیہ میں سے دیگر صحابۂ کرام تک کو حاصل نہ ہو سکی!

آخر یہ سید احمد صاحب کو بعد از خدا بزرگ منوانے کا منصوبہ تھا یا اور کچھ؟ مزید لکھا ہے:

"اس بستی (فتحپور) میں جو نمازِ عصر کے بعد آپ مراقب بیٹھے تو نمازِ مغرب کے قریب سر اُٹھا کر فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج اُس نے سب حضرت نے تمام اولیاء مقبولین سلف سے مجھ کو ممتاز کر کے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی تیرے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۲۶

ہاتھ پر بیعت کرے گا اُس کو تمام مکروہاتِ دنیا و آخرت سے محفوظ رکھ کر اپنی رضامندی اور انعام سے سرفراز کروں گا۔ اس بشارت میں آپ کے خلیفوں اور خلیفوں کے خلیفوں کی بیعت بھی شامل ہے۔ اُس وقت میں نے عرض کیا کہ اے کریم و رحیم! میرے آباء و اجداد کو بھی میری بیعت سے مشرف کر، تاکہ وہ بھی اِس وعدۂ مغفرت میں شامل ہو جائیں۔ کئی روز اِس آخری دُعا کی قبولیت میں توقف رہا۔ اِس عرصہ میں سید صاحبؒ وطن میں واپس پہنچ گئے۔ وطن میں پہنچ کر اِس دعا کی قبولیت کے واسطے آپ بہت گڑگڑائے۔ آخر اُس کریم و رحیم نے اپنے فضلِ عمیم سے اِس دعا کو قبول فرمایا اور حکم دیا کہ سید محمد (مولف مخزنِ احمدی) کو اپنے آباء و اجداد کی طرف سے وکیل کر کے اُن کی طرف سے اِن سے بیعت لے لے۔[1]

اس عبارت میں بھی سید احمد صاحب کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اُونچا دکھانے ...بڑی کارفرما نظر آرہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے والدینِ کریمین کو زندہ ...کے اپنی اُمت میں شامل فرمایا تھا تو سید صاحب نے سارے آباء و اجداد کو اپنی بیعت ...شرف کر کے وعدۂ مغفرت میں شامل کروا لیا۔ بات کی ہوا تو باندھ دی لیکن سرورِ کون و مکاں ...للہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو اپنے والدینِ کریمین کو دوبارہ زندہ کر کے مشرف باسلام کیا تھا۔ ...امر مدِنظر آیا یہاں زبانی جمع خرچ سے کام چل نہیں سکتا تھا، لہٰذا مؤلفِ مخزنِ احمدی کو ...قرار دینے کی راہ نکال لی۔ رہے سید صاحب کے مرید تو وہ سلسلہ در سلسلہ اور نسلوں کی ...ن گنتی جا رہی تھیں، ٹھوک کے حساب سے مغفرت لُٹ رہی تھی جبکہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ ...لام کا اُمتی بننے سے پرچون کے حسابوں بھی وعدۂ مغفرت کا وہابی حضرات قحط بتاتے رہتے

امام الوہابیہ نے خود لکھا ہے:

"اِس آیت سے معلوم ہُوا کہ تمام آسمان و زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانیے اور اُس کو پکاریے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔"[2]

---

[1] ...جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۲۶

[2] ...د اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۱

انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا ماننا تو نفع نقصان سے خالی تھا لیکن سید احمد صاحب کے ساتھ لگنا کتنا فائدہ مند کہ ذرا وعدۂ مغفرت و اصحاب بدر کا درجہ حاصل کیا۔ کیا یہ مسلمانوں کو مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کی طرف سے اپنے برطانوی امیر المومنین کی جانب پھیرنے کا طاغوتی منصوبہ نہیں تھا؟ دہلوی صاحب نے مزید لکھا ہے:

"اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے گو یہی جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکرا۔"[1]

اگر بندگانِ خدا کسی کی حمایت نہیں کر سکتے تو سید احمد صاحب جو اپنے ساتھیوں کی حمایت ہر قدم پر کرتے اور انھیں جنت و مغفرت کی بشارتیں سناتے رہے انھیں کیوں در دغا شمار نہ کیا؟ اگر بزرگوں کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل نہیں ہوتی تو سید احمد صاحب کے پیچھے اتنا بڑا لاؤ لشکر کیا سیر و تفریح کرنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے پیچھے وہابیانِ پاک و ہند کس خوشی میں لگے ہوئے ہیں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے:

"اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر اپنے بتوں کو اُس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے۔ اسی سے کافر ہو گئے۔ سو اب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے سو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اُس کے مقابل کی طاقت اُس کو ثابت نہ کرے۔"[2]

قطع نظر اس کے کہ بتوں کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا وکیل سمجھنے کے باعث مشرکین مکہ کافر ہوئے تھے یا اس کی اور بھی بے شمار وجوہات تھیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ انبیائے کرام اور

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۲۲

[2] ایضاً، ص ۶۲، ۶۳

ریاستِ عظام کو تصرف ثابت کرنا اور وکیل ماننا شرک سہی لیکن امام الوہابیہ کی اس خانہ ساز شریعت کے احکام کا سیّد احمد صاحب پر کیوں اطلاق نہیں ہوتا؟ سید صاحب کے لیے تصرف بہ قدم پر ثابت کیا جا رہا ہے، انہیں وکیل اور حمایتی مانا جا رہا ہے لیکن کوئی وہابی یہ نہیں کہتا کہ ہم شرک کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ انبیاء و اولیاء کے خلاف محاذ بنا کر سید احمد صاحب جیسے شخص کو ارباب من دون اللہ بنا رہے ہیں۔ ذرا مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی یہ الیبیق تصریح بھی ملاحظہ ہو:

"اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو حکم کیا کہ لوگوں کو سنا دیویں کہ میں تمہارے نفع و نقصان کا کچھ مالک نہیں اور تم جو مجھ پر ایمان لائے اور میری اُمت میں داخل ہوئے سو اس پر مغرور ہو کر حد سے مت بڑھنا کہ ہمارا پایہ بڑا مضبوط ہے اور ہمارا وکیل زبردست اور ہمارا شفیع بڑا محبوب ہے۔ ہم جو چاہیں سو کریں۔ وہ ہم کو اللہ سے بچا لے گا کیونکہ یہ بات محض غلط ہے، اس واسطے کہ میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسروں کو کیا بچا سکوں گا۔"[1]

چلیے یونہی سہی! گویا پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو خود ہی ڈر رہے ہیں اور اُنھیں بچاؤ کے لیے کوئی جگہ نہ مل سکی لہٰذا دوسرے کا بچاؤ ان حالات میں وہ کر بھی کیا سکیں گے؟ لیکن خیر سے آپ کے سیّد احمد صاحب تو نہ صرف دنیا میں ہی مغفرت سے نوازے گئے بلکہ اُن کے ساتھیوں کو بخش دیا گیا تھا بلکہ جو ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء سے بیعت ہو جائے وہ بھی بخشا گیا تھا۔ ان حالات میں صاف نظر آ رہا ہے کہ سیّد احمد صاحب پر اللہ تعالیٰ کی جتنی نظرِ کرم ہے اتنی تو اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی نہیں۔ ان حالات میں وہابی حضرات کیا ہمیں یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ اُنھوں نے محبوبیت میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سیّد احمد صاحب کو بڑھا کر اپنے بڑھاوے کی امیر المومنین کو مقامِ ربوبیت پر بٹھایا تھا یا سیّد احمد صاحب سے علوم و اختیارات میں سرورِ کون و مکاں صلی

---

[1] محمد اسمٰعیل، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۴۳

تعالیٰ علیہ وسلم کو کم بتا کر حبیبِ پروردگار، شافعِ روزِ شمار کے خلاف پُراسرار محاذ بنایا ہوا ہے؛ کیونکہ جن کاموں کی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے زبانِ رسالت سے نفی کروائی ہے اُن سارے کاموں کو سرانجام دیتے ہوئے سید احمد صاحب کو دکھایا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیا دین ہے؟ یہ کیا تماشہ ہے؟

خیر یہ تو باتیں تھیں سید احمد صاحب کی بین الاقوامی ولایت کی، جس کے باعث وہ کارساز، مشکل کشا، شفیع المذنبین اور کیا کچھ نظر نہیں آتے تھے۔ اب سید صاحب کے کسبِ فیض و حصولِ منصب کے بارے میں جہالت آمیز و مضحکہ خیز بیان مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

"اس کے بعد ایک روز ارواحِ مقدس، جناب غوث الثقلین سید عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ و حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ متوجہ حال سید صاحب ہوئیں اور قریب ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان دونوں روحوں کے درمیان رہا۔ ہر ایک روح ان دونوں روحوں میں سے سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایامِ تنازعہ کے دونوں روحوں کی بالاشتراک جذب کرنے پر صلح ہو گئی۔ اب دونوں ارواحِ مقدسہ نے بالاشتراک آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک پہر تک نفسِ نفیس پر توجہ قوی اور تاثیر زور آور فرمائی کہ اس ایک پہر میں نسبت ان دونوں خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔" [۱]

اسی قسم کا ایک مضحکہ خیز بیان اور پیش کیا جاتا ہے، جس سے ان حضرات کی سلوک و تصوف سے واقفیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے اور صاحبِ فہم و فراست پر ان کی دروغ گوئی اور کذب بیانی پورے طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیجیے وہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

"اس کے بعد ایک روز سید صاحب حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مرقد مبارک پر مراقبہ میں بیٹھے تھے اور اس وقت روحِ پُرفتوح

---

۱ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، ص ۶۵

خواجہ صاحب مرحوم سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اُس مقدس رُوح نے آپ کے اوپر توجہ فرمائی۔ اُسی وقت نسبت خاندانِ چشتیہ کی بھی حاصل ہوگئی اور اس کے بعد نسبت مجددیہ، شاذلیہ وغیرہ غرض کل مشہور خاندانوں کی نسبت خود بخود آپ کو حاصل ہوگئی۔

بعد تکمیل ان دونوں سلوکوں کے ایک روز عالمِ مراقبہ میں آپ کی ملاقات روحِ پُرفتوح بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ سے ہوئی۔ اُس وقت سید صاحب نے دیکھا کہ ایک چترِ نورِ مقدس کا خواجہ صاحب ممدوح کے سر پر سایہ کر رہا ہے۔ پھر اُسی وقت یہ بھی آپ کو دکھائی دیا کہ آپ کے سر پر وہ چترِ نورِ مقدس کے سایہ کر رہے ہیں۔ چونکہ سید صاحب اپنے کو کمترین مریدانِ خواجہ سے شمار کرتے تھے۔ یہ معاملہ معکوس دیکھ کر آپ کو بہت شرم آئی اور فوراً مراقبہ سے باہر آکر لرزاں و ترساں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت خوف اور شرمندگی سے اس کو مولانا صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت مولانا صاحب نے نہایت فرحاں و خنداں اس کے جواب میں فرمایا اے فرزند! جائے تعجب نہیں ہے، ولایت نبوت کے ایسے ہی آثار ہوتے ہیں۔ اے عزیز! ابھی تو اس کی ابتداء ہے اور مشتے از خروار اور ایک قطرہ از بحرِ ناپیدا کنار تم پر ظاہر ہوا ہے۔ آئندہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہزارہا اسی قسم کی باتیں تم پر ظاہر ہوا کریں گی۔"[1]

ولایت نبوت تو اُسے کہتے ہیں جو نبی کو اعلانِ نبوت سے قبل حاصل ہوا کرتی ہے لیکن سید صاحب کے لیے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی اس کا اعلان کروانا ظاہر کر رہا ہے کہ اندرونِ خانہ اعلانِ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی جس کی خاطر وحی و عصمت کے ڈھولے پیٹے جا رہے تھے اور وقت آنے پر سید صاحب کی مُہرِ اسْمُهٗ اَحْمَد مقرر ہوئی تھی۔

تمام باتوں سے قطع نظر ان مذکورہ بالا دونوں بیانات کو پھر ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے واقعے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۹۵

میں حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق غوث الثقلین کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی جنوں اور انسانوں کی فریاد کو پہنچنے والے۔ کیا یہ تقویۃ الایمانی دھرم میں حیثیت شرک و کفر تو نہیں؟ یا تقویۃ الایمان کے ایٹمی شگوفے صرف مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی غرض سے گھڑے گئے تھے؟ یہ بزرگوں میں جھگڑا دکھانا، بیٹھے بٹھائے نسبتوں کا حاصل ہو جانا، رتبے میں سلطان الہند خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے اونچے بننا، کیا اس میں حقیقت کا کسی عاقل کو ادنیٰ سا شائبہ بھی نظر آتا ہے؟ اب وصایا وزیری کے حوالے سے یہ واقعہ بھی ملاحظہ ہو:

"ایک روز اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے سید صاحب کے خیال مبارک میں گزرا کہ نامعلوم اس جہان کے قطب الاقطاب جہان کون بزرگ ہیں؟ یہ خیال کر کے جناب باری تعالیٰ میں دعا کی کہ اس بزرگ کا مجھ پر حال کھول دیں اور ان کی زیارت سے مجھ کو مشرف کر۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اسی دم اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے ہوا کو حکم دیا کہ آپ کو معہ بستر آناً فاناً اس بزرگ قطب الاقطاب کے مسکن پر پہنچا دے۔ چنانچہ آپ بہت سے ممالک اور پہاڑوں اور جنگلوں کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک دم میں ملک شام میں پہنچ گئے۔ آپ نے اس بزرگ سے کہا کہ مجھ کو تمہاری ملاقات سے حصولِ رضامندی باری تعالیٰ کے بادجود اور کچھ مقصود نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ بزرگ کچھ متوجہ نہ ہوئے ..... اس گھڑی چالیس اشخاص غیبی توکل کی حیثیت سے، دنیا کی نظروں سے پوشیدہ اور آپ کے سامنے عیاں، آپ کی خدمت میں تعینات ہو گئے اور یہ اشخاص غیبی اس شخص کے ساتھ تعینات رہتے ہیں جس کو مرتبہ قطب الاقطاب کا عنایت ہوتا ہے۔ غرض اس انعامِ تازہ کے بعد جس طرح رب العزت آپ کو وہاں لے گیا تھا اسی طرح واپس لے آیا..... جب اس واقعہ کے چند سال بعد سید صاحب ملک خراسان کو تشریف لے گئے تو ان پہاڑوں اور میدانوں کو دیکھ کر آپ فرمایا کرتے تھے کہ انھیں پہاڑوں اور میدانوں کے اوپر سے اس ملک شام میں میرا سفر ہوا تھا۔"[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیات سید احمد شہید، ص ۹۳

رش نصیب حضرات نے تصرف سے تھوڑا بہت حصہ بھی پایا ہو وہ بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ واقعہ
بھ گھڑنت اور فضاؤں میں محل تعمیر کرنے والوں کا تیار کردہ نقلی ڈھکوسلا ہے۔ عبارت کا ہر فقرہ اس
و بازی کی زبانِ حال سے گواہی دے رہا ہے جیسے سید صاحب کو زبانی جمع خرچ سے
ب الالقاب تو بنا لیا، لہذا کیسے ممکن ہے کہ اپنے پیر و مرشد سے اونچے ہونے کا اعلان نہ کرتے۔ اس
میں پہلے یہ بیان ملاحظہ ہو:

"مولانا (مرتضیٰ خاں صاحب) لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مجھ سے اپنا ایک روز کا حال اس طرح بیان کیا کہ میں ایک دن مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اُس وقت آپ کے پاس مولوی رشید الدین صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بہت دیر انتظارِ تخلیہ، دالان میں ٹہلتا رہا کہ جب یہ صاحب تشریف لے جائیں تو میں مولانا سے کچھ عرض کروں۔ اس ٹہلنے کی حالت میں مجھ کو یہ الہام ہوا کہ اگر تو بندوں کی طرف التجا کرے گا تو ہم تیری دستگیری نہ کریں گے۔" [1]

پھر یوں معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو وہاں کسی انگریز نے دیکھ لیا ہوگا۔ اُسے یقیناً یہ بات
ناگوار گزری ہوگی اور صاف کہہ دیا ہوگا کہ اگر تم نے شاہ صاحب سے رابطہ رکھا تو ہمارا تمہارا
: نہیں ہوگا اور ہماری نظرِ کرم تمہاری جانب سے ہٹ جائے گی۔ بہرحال اس واقعے کو
غلام احمد قادیانی کی طرح الہام کا رنگ دے کر بزرگی کی سند بنا دیا گیا۔ اب اس واقعے
ن پر یار لوگوں کی حاشیہ آرائی بھی دیدنی ہے۔ لکھتے ہیں:

"یہ قصہ لکھنے کے بعد مولوی مرتضیٰ خاں صاحب اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے یہ لکھتے ہیں کہ اس الہام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن ایام میں سید صاحب کا درجہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھا ہوا تھا۔ جامع لکھتا ہے کہ یہ بات تو میں نے بہت لوگوں سے سنی ہے کہ جب سید صاحب حج کو تشریف لے گئے تو اس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کو سید صاحب کی علوِ مرتبت کا حال

---

[1] جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۱۲۱

غیب سے معلوم ہوا۔ اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب کی واپسی کے بعد میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کرکے، وہ شرف جس کا وعدہ ہے، ضرور حاصل کروں گا۔ مگر افسوس کہ مولانا کی امید بر نہ آئی کیونکہ سید صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے پہلے مولانا صاحب کا وصال ہو گیا تھا۔" ؎

جس ذہن نے یہ واقعات گھڑے اور جس قلم نے کاغذ کے سینے پر انھیں جڑا، اُس کی ستم ظریفی کا اندازہ بھلا کون کرسکتا ہے، جس نے اس شعبدہ بازی کو ایسا خوشنما رنگ دے دیا کہ پڑھے لکھے لوگوں کو بھی اس کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا۔ وہ جال کی خوشنمائی تو دیکھتے ہیں لیکن جال کی حقیقت کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ ایسے پُراسرار چکر کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ:

چوں قلم در دست غدارے بود
لاجرم منصور بر دارے بود

ابھی سید احمد صاحب کی ایسی ولایت جو منصب نبوت کو بھی شرما رہی ہے، اُس کا ایک پہلو قارئین کرام اور ملاحظہ فرمالیں کہ اگر سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فراق میں استن حنانہ رو رہا تھا تو سید احمد صاحب کو وہابی حضرات کس طرح کم رہ جانے دیتے! اس کمی کو ملاحظہ یوں پورا کیا ہے:

"جس فجر کو آپ روانہ دہلی ہونے والے تھے، اُس رات کو آپ کے منڈے مکان کی رُوح بہیئت انسانی ظاہر ہوئی اور آپ کی جدائی میں بہت رنج و ملال ظاہر کرکے ایک دوسری مخلوق الٰہی سے، جو وہاں حاضر تھی، مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ کل ہمارا آقا ہم نامدار ہم کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یہ کہہ کر ایسا زار و قطار رونا شروع کیا، اس گریہ و زاری کا اثر سید صاحب پر بھی ہو گیا اور آپ بھی رونے لگے اور چونکہ اُس وقت سید صاحب کو خود کچھ حضوری الٰہی ہو رہی تھی،

؎ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۱۲۱

آپ نے اللہ رب العزت سے عرض کیا کہ یہ سب تیرا فضل و کرم ہے، اس روح کی
یہ الفت تیرے ہی نام کے سبب سے ہے ورنہ میرے جیسے ہزار ہا آدمی اپنے
اپنے مکانات کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کبھی کوئی مکان اُس کے واسطے رنج و ملال
نہیں کرتا۔ سوائے رب! تُو ہی اپنے فضل سے اس مکان کو تسکین دے۔ اُسی وقت جناب
الٰہی سے حکم ہوا کہ اس مکان کو بھی ہم جنت میں داخل کریں گے۔ یہ خطاب اُس روحِ مکان نے خود بھی
اور میں نے بھی بہ تعمیلِ حکمِ الٰہی اُس کو یہ بات سنا دی۔ تب اس مکان نے خوش و خرم ہو کر تسلی پائی۔

بجانب سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سید احمد صاحب کو مدِ مقابل دکھانا اور
براہِ راست اللہ جل شانہٗ سے بالمشافہ کلام کرنے کا دعویٰ کرنا جبکہ یہ خصوصیت موسیٰ علیہ السلام
نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ دُوسرے انبیائے کرام کو بھی حاصل نہ ہوئی لیکن
وگوں نے ستم ظریفی سے سید صاحب کو زبان زوری سے اُسی منصب پر فائز کر دیا۔ اِسی قسم کا
حیرت انگیز واقعہ اور ملاحظہ فرمایا جائے۔ لکھا ہے:

"یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا اور وہ یہ کہ سمندر کی روحانیت ایک
ہیبت ناک صورت بن کر حضرت کے سامنے آئی اور بہت غرور اور تکبر سے بولی
کہ تُو اپنی جان سے سیر ہو کر، ایسی جسارت کر کے، میرے اندر ہلاک ہونے کو
کیوں آیا ہے؟ تُو نہیں جانتا کہ میں سمندر ہوں، جس نے ایک لمحہ میں فرعون
کو ہلاک کر ڈالا تھا اور میں وہ ہوں کہ ہزاروں جہاز اور کشتیاں ہر سال میرے
سامنے تباہ ہوتی ہیں اور میں وہ بحرِ محیط ہوں کہ ساری زمین کو مع ساکنانِ زمین
کے گھیرے ہوئے ہوں۔ اگر میں چاہوں تو ایک لمحہ میں سارے ساکنانِ زمین
کو غرقِ آب کر دوں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ تُو اپنی جان سے بیزار ہو گیا ہے،
مگر اپنے ساتھ اتنی خلقت کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟
سید صاحب نے جب یہ کلمات نخوت آمیز سمندر سے سنے تو اُسی

محمد جعفر تھانیسری، مولوی، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۲۰

وقت آپ کو یہ الہام ہوا کہ تو سمندر سے کہہ دے کہ تو کیسی غرور اور تکبر کی بات
کرتا ہے، میں اور تو دونوں غلامانِ غلام اس جبار و قہار کے ہیں، تو اللہ سے ڈر
اور میرے نزدیک ہو، اس قدر شیخی نہ بگھار، تیرا کیا اختیار ہے کہ تو کسی کو غرق کرے؟[1]

اہلِ علم و دانش پر بخوبی آشکار ہے کہ یہ واقعہ محض گھڑنت اور اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے جس
نے عقل و فہم سے کام لینے کا موقع ہی نہ دیا۔ مقربینِ بارگاہِ الٰہی کے حضور سرکشوں کے سوا کون
چون و دم مارے؟ سمندر یا اس جیسی کسی چیز کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں سے اس طرح
کی گفتگو کرے؟ لیکن جعلی ولایت کے لیے اصلی کرامتیں کہاں سے آئیں؟ اسی طرح فرضی کہانیوں
کہانیوں کو کرامت کا رنگ دے کر بھان متی کا کنبہ جوڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک فرضی قصہ
تیمارداری کے سلسلے میں ملاحظہ فرمائیے:

"اس رات کو اثنائے راہ میں سید صاحب نے رسولِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو
خواب میں دیکھا کہ حضرت بمعیت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت خاتونِ
جنت اور حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کے آپ کی عیادت کے واسطے تشریف
لائے اور ہر ایک بزرگ نے حضرت سید صاحب کے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھ کر
تسلی و تشفی کی اور آپ کو بہت سی بشارتیں دیں۔"[2]

جب پانچوں حضرات کی تشریف آوری کا ذکر کر کے لکھ دیا کہ ہر ایک بزرگ نے سید صاحب
کے سینے پر ہاتھ رکھا تو مطلب یہی ہوا کہ حضرت خاتونِ جنت، جگر گوشۂ رسول، زہرہ بتول
رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی سید صاحب کے سینے پر اپنا دستِ مبارک رکھا ہوگا۔ وہابی صاحبو!
کیا قیامت نہیں آئے گی؟ باز پرس نہ ہوگی؟ یہ کس کی والدہ، کس کی زوجۂ مطہرہ، کس کی
لختِ جگر کے بارے میں یہ بیہودہ الفاظ سپردِ قلم کیے ہیں؟ کیا اپنے ملاؤں کی سامری کے بچھڑے
کی طرح پرستش کرنا اور بزرگوں کے ننگ و ناموس سے کھیلنا ہی آپ حضرات کے دین کا رکنِ اعظم

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۴۰

[2] ایضاً، ص ۱۵۷

یدی کی سند ہو کر رہ گیا ہے، آخر یہ کیا قیامت ہے!

حالے شرم تم کو مگر نہیں آتی

سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو وصال کے روزے رکھنے سے
روکتے ہوئے فرمایا تھا، بیت عند ربی یطعمنی ویسقینی۔ یعنی میں اپنے رب کے
حضور رات گزارتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ بلکہ شمعِ رسالت نے اپنے اُن بے مثل پروانوں
سے فرما دیا تھا کہ، ایکم مثلی یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے، صحابۂ کرام تو اپنے دل و دماغ
کے کسی گوشے میں اس سرکار سے مثلیت کا تصور بھی نہیں لا سکتے تھے لیکن وہابیوں نے اپنے سید صاحب
کو بینچ کھینچ کر فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بالمقابل کھڑا کر ہی دیا، کیونکہ جب ناچنے ہی کو
اٹھے تو گھونگھٹ کیا، چنانچہ لکھا ہے:

"آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا، وہ سب تہجد کی نماز کی برکت سے
ہوا۔ اور تیرنے کی بھی آپ کو ایسی مشق تھی کہ آپ غوطہ مار کر تہہِ دریا میں دو رکعت
نفل پڑھ لیتے تھے اور باوجود تن و توش و شجاعت کے آپ کھانا بہت کم کھاتے
تھے بلکہ ایک روز آپ نے فرمایا کہ بھائیو! یہ مت سمجھو کہ میری حیات کا باعث کھانا پینا ہے
بلکہ ایسا ہرگز نہیں ہے میری حیات کا سبب فقط یادِ الٰہی ہے۔ اگر یادِ الٰہی سے ذرا بھی
غافل ہو جاؤں تو میرا دم نکل جائے۔"[1]

جب سید صاحب غوطہ مار کر تہہِ دریا میں دو نفل پڑھ لیا کرتے تھے تو معرکۂ بالاکوٹ کے
دلدل میں چھلانگیں لگاتے وقت تو زمین پر دوبارہ قدم لگنے سے پہلے فضاؤں میں ہی
وساطت نفل تو ضرور پڑھ لیا کرتے ہوں گے، معلوم نہیں ان خدا کے بندوں نے دین و
ایمان کے ساتھ ہی عقل و دانش سے بھی کیوں دشمنی گانٹھ لی، چند روزہ زندگی کے آرام
و راحت کی خاطر ایسے پُر اسرار ڈھونگ، اس پر بھی متبعین حضرات آج تک خوشی کے مارے
پھولے نہیں سماتے اور ان کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہی
چلے جاتے ہیں۔ وہابی حضرات کی غایت کوشش یہی نظر آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیاتِ سید احمد شہید، ص ۱۱۷

علیہ وسلم کو جو فضائل و کمالات اور خصوصیات حاصل ہیں وہ سید احمد صاحب میں ضرور دکھائی
تاکہ آسانی سے مسلمانوں کا رُخ اُدھر سے اِدھر پھیرا جا سکے۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
خدمت میں جنات حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا کرتے تھے جس پر قرآن کریم کی سورۂ جن
شاہد ہے۔ اب سید احمد صاحب کے بارے میں وہابی علماء و مورخین کے خیالات ملاحظہ
"معتبر راویوں کا بیان ہے کہ اس سفر (روانگی از جدہ) میں بہت سے چھوٹے
اور شاہ جنات کو مثل اپنے جدِ امجد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ نے
ہدایت کی اور لاکھوں جن آپ کی بیعت سے فیضیاب ہوئے۔"[1]

اولیائے کرام کے دشمن جب اپنے پیر و مرشد کو ولی کامل بنانے پر آئے تو کسی قسم کی کمی نہ
رہنے دیتے۔ اب سید احمد صاحب سے فیضیاب ہونے والے جنات کا عالم الغیب ہونا اور
سارے وہابیوں کا اُن پر صدقِ دل سے ایمان رکھنا اور ایسے سید صاحب کے کمالات میں گنا
ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

"اور یہ بھی آپ (سید احمد صاحب) فرمایا کرتے تھے کہ اس جماعت قدسیہ
(رجال الغیب و ارواح و جنات) کا دوسرا حال یہ ہے کہ ہمارے مقام کے
وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے تھوڑے فاصلے پر اُترتی ہے اور جب ارادۂ الٰہی
ہمارے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اُس طرف کو چلنے لگ
جاتی ہے، تب اُن کی روانگی کو دیکھ کر ہمیں بھی خود بخود اُس طرف کو چل پڑتا ہوں
اور یہی وجہ تھی کہ آپ بعض جگہ مہینوں تک ٹھہرے رہتے تھے اور پھر یک بیک
چل دیتے تھے۔"[2]

یہ بھید تو وہابی حضرات ہی کو معلوم ہوگا کہ سید صاحب کی جماعت قدسیہ کو ارادۂ الٰہی
کس طرح معلوم ہو جاتا تھا؟ انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے علمِ غیب کا انکار کرنے والے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۱۹۰

[2] ایضاً، ص ۱۷۳

بب دانی پر ایمان معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت لے آئے ؟ اور اس سے اُن حضرات کی
یب کے علمبردار ہونے پر کوئی حرف تو نہیں آیا ؟ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قائل اپنے
ب کو دکھانے کی خاطر یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا تھا، چنانچہ اپنے اسی قلبی راز کا اظہار
پ وہابی قلم کاروں نے کیا ہوا بھی ہے۔ ایک مقام پر لکھا ہے :

سید صاحب کی تعلیمات بھی مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سیدھی سادی
ہیں، جن سے عالم و جاہل دونوں برابر مستفید ہوتے تھے ؛؛ ۱

س سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سید صاحب مبلغ اسلام نہیں تھے بلکہ اُنھوں نے
ہب وضع کیا اور اُسی کی نشر و اشاعت مقصود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب
لیمات بھی وہابی حضرات کے نزدیک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی
طرح سیدھی سادی تھیں۔ مسلمانوں کے فقہی لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور
ہب ہیں اور بلحاظ طریقت بھی چار مشہور سلسلے نقشبندی، قادری، چشتی اور
ہیں۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اہلسنت و جماعت سے علیحدہ اپنی جماعت تشکیل
س کا نام محمدی گروہ رکھا۔ سید صاحب نے چاروں مشہور سلاسل سے الگ
ریقہ وضع کیا، جس میں فرضی کرامتوں کے افسانے تو ضرور تھے لیکن تصوف سے دُور
ا نہیں تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے مسلمانوں کے چاروں فقہی مذاہب اور طریقت
ں سلاسل کے بارے میں یہ تاثرات پھیلائے تھے :

چاروں فقہا کے مذاہب میں کون سا مذہب آپ کو پسند ہے ؟ آپ نے
ہہ دیا کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی مجھ کو پسند نہیں ہے اور فرمایا کہ ان میں کوئی مذہب
طور اور طریقے پر نہیں ہے، سب سے افراط و تفریط ہو گئی ہے ؛؛

آپ نے عرض کیا کہ ان مشہور طریق اولیاء اللہ میں کون سا طریقہ حضور کے
پر ہے ؟ جناب امیر نے فرمایا کہ ان میں بھی کوئی طریقہ میرے طور پر نہیں ہے۔

ا نیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۱۷۷

ہر ہر طریقے میں کچھ کچھ چیزیں میری مرضی کے خلاف لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں اور اس
وجہ سے سب کے سب ہمارے طور اور طریقے سے دور جا پڑے ہیں۔[۱]

لیجیے صاحب! مجتہدین عظام کے فقہی مذاہب افراط و تفریط کا شکار، اکابر اولیا
کے چاروں سلاسل بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طور طریقے سے دور گئے، ان میں لوگوں
ایجادات شامل ہو گئیں، مسلمانوں کی جگہ تو محمدی گروہ (وہابی) مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہو گ
فقہی مذاہب کی جگہ خارجیت کو شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا اور طرق اکابر طریقۂ محمدیہ کے سا
حرفِ غلط ہو گئے کیونکہ برٹش گورنمنٹ نے منصب و مقام ہی ایسا پاک صاف اور بلند و
مرحمت فرما دیا تھا کہ اس کے مقابلے پر دوسری کسی بڑی سے بڑی ہستی کا وزن ہی کچھ نہ ر
بہتر ہو گا کہ سید احمد صاحب کا اس بارے میں اپنا نظریہ اور معمول بھی ملاحظہ فرما لیا جائے
لکھا ہے:

آپ کا دستور تھا کہ آوازِ بلند طریقۂ چشتیہ اور قادریہ و نقشبندیہ و مجددیہ میں
اوّل بیعت لے کر پھر طریقۂ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے ... اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ ہر چہار مشہور طرق طریقت میں آپ کا اوّل بیعت لینا اور توجہ
دینا محض بطورِ حکمت خلائق کو رجوع کرنے کے لیے تھی ورنہ آپ کی اصل تعلیم
اور دلی توجہ طرف طریقۂ محمدیہ کے تھی، جس کی سب سے آخر میں آپ بیعت
لیتے تھے۔[۲]

اگر وہابی حضرات کی بارگاہوں میں ہمیں بھی اذنِ لب کشائی ہے تو ہم صرف اتنا ہی ع
کرنا چاہتے ہیں کہ حضرات! آپ کے امیر المومنین کا رائج فرمودہ طریقۂ معروف بنام
محمدیہ آج کہاں ہے؟ کیا اس وسیع دنیا کے کسی گوشے میں اس کا کہیں نام و نشان م
ہے؟ قرآنی اور ایمانی فیصلہ تو یہی ہے کہ جاء الحق وزھق الباطل ان البا

---

۱ محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۱۵۳، ۱۵۴

۲ ایضاً: ص ۸۴

ان زھوقا۔ جب حق آتا ہے تو باطل مٹ جاتا ہے کیونکہ باطل مٹنے کے لیے ہے۔ اگر طریقۂ محمدیہ حق تھا اور مسلمانوں کے چاروں طریقے باطل تھے تو طریقۂ محمدیہ کو باقی رہنا تھا اور مسلمانوں کے چاروں طرق کو مٹ جانا چاہیے تھا۔ لیکن معاملہ برعکس سامنے آیا کہ مسلمانوں کے چاروں طریقے آب و تاب سے موجود ہیں لیکن طریقہ محمدیہ کا روئے زمین سے حرف غلط کی طرح نام و نشان مٹ چکا ہے۔ وہابی حضرات ذرا تھوڑی دیر کے لیے غصے کو تھوک دیں، دلوں پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دماغ سے سوچیں کہ طریقۂ محمدیہ کا مٹنا ان کے نزدیک حق کا مٹنا ہے یا باطل کا؟ یہ حضرات جو فیصلہ کرسکتے ہیں لیکن آسنا یاد رہے کہ یہی فیصلہ قبر میں بھی اُن کے ساتھ کیا جائے گا، حشر و نشر میں ساتھ رہے گا اور اُن کے نامۂ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ اگر ہم سے پوچھنا چاہیں تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ نے اس کا قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

مٹ گئے مٹتے ہیں، مٹ جائیں گے اعدا تیرے
نہ مٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا تیرا

وہابی علماء و مورخین نے بتایا کہ سید احمد صاحب کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسی سیدھی سادی، سید صاحب کے ساتھی اصحاب بدر کی طرح مقبول بارگاہ خداوندی، یہ حضرات اس پُراسرار برطانوی گاڑی کو چلانے میں پہیوں کا کام دے رہے تھے، انھیں پروردگاروں کی جانب سے کیا منصب ملا تھا؟ اس بارے میں لکھا ہے:

"آپ کے بڑے ساتھیوں میں مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔ یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے آپ کے خلفائے راشدین سے تھے۔ مولوی عبدالحی صاحب کا مزاج بوجہ بردباری اور وقار حضرت ابوبکرؓ سے اور حضرت مولانا شہید کی طبیعت بوجہ اشداء علی الکفار و فجار حضرت عمرؓ سے زیادہ تر مشابہ تھی۔"[۱]

---

[۱] اسمٰعیل دہلوی، مولوی، صراط مستقیم، ص ۴

یہ حضرات تو سیّد احمد صاحب کے خلفائے راشدین تھے اور حضرت ابوبکر صدیق و حض[رت]
عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشابہ لیکن خود سیّد صاحب اپنی تمام تر علمی بے مائیگی یعنی ناخوا[ندگی]
کے باوجود، جیسا کہ خود اُن کے سوانح نگاروں نے بتایا ہے، کس کے مشابہ تھے؟ اِس کا سوا[ل]
محمد اسمٰعیل دہلوی نے یوں جواب دیا ہے:

"ازبسکہ نفس عالی حضرت ایشاں بر	چونکہ آپ کی ذات والاصفات ابتدا
کمال مشابہت جناب رسالتمآب	فطرت سے جناب رسالت مآب
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در	علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی
بدو فطرت مخلوق شدہ بناءً علیہ	کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی،
لوحِ فطرت ایشاں از نقوشِ	اس لیے آپ کی لوحِ فطرت علوم
علوم رسیدہ و راہِ دانشمندانِ کلام و	رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندوں
تحریر و تقریر مصفّیٰ ماندہ بود" [1]	کی راہ و روش سے خالی تھی۔ [2]

اِس ستم ظریفی کا جواب تو مل رہا ہوگا کہ سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُ[مّی]
ہونا تو معجزہ ہے لیکن عوام کا علم سے کورا رہنا کمال نہیں بلکہ نقص ہے۔ اِس نقص [کو]
اُس کمال کے برابر درجہ دینا اور دونوں کو مشابہ ٹھہرانا وہ جرأتِ باغیانہ ہے جس کا ایک
اُمتی کہلانے والا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ آخر یہ ساری کارگزاری سیّد احمد صاحب کو منصبِ نب[وت]
پر بٹھانے کے لیے نہیں تھی تو اور کس غرض سے تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ دعو[ائے]
نبوت کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی، جس کی خاطر ابھی امامت اور مہدیت کے دعوے
تک ہی پہنچے تھے جیسا کہ مشہور دیوبندی عالم مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی سنہ ۱۳[...]
۱۹۴۴ء) کا بیان منقول ہے:

مولانا سندھی نے ایک دفعہ بڑے دُکھ سے فرمایا، حضرت سیّد احمد شہید

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴
[2] صراطِ مستقیم اردو، ص ۱۶

کتنے بڑے بزرگ تھے لیکن دیکھو! وہ بھی اسی رَو میں بہہ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ افغان نمائندوں پر مشتمل ایک جمہوری نمائندہ حکومت بناتے، وہ خود امام اور مہدی بن گئے اور اس طرح سارا معاملہ غتر بود ہو گیا۔" [۱]

مولوی عبیداللہ سندھی دُوسرے مقام پر سید صاحب کی مہدیت کے بارے میں فرماتے ہیں

"سید صاحب جیسی خوبیوں کا آدمی ملنا مشکل ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے امام و مہدی بننے سے اتنی اچھی تحریک کس طرح تباہ ہوئی۔" [۲]

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق استاد جناب محمد سرور صاحب نے سید احمد صاحب کی امامت و مہدیت کے دعاوی اور ان کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اپنے تاثرات کو ان لفظوں میں قلمبند کیا ہے:

"مولانا کے نزدیک سید احمد شہید کی جماعت نے سرحد میں جو شکل اختیار کی وہ منشائے حقیقی کے خلاف تھی۔ ان کی حکومت موقتہ (یعنی عارضی اور PROVISIONAL) تھی۔ اصل مرکز دہلی تھا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ سید صاحب نے امامت اور مہدیت کے دعوے کر دیے۔ اس سے خواہ مخواہ سرحد کے امراء و خوانین میں بدمزگی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف امامت اور مہدیت کے بعد جماعتی فیصلوں کی اہمیت نہ رہی۔ اس سے عوام پٹھان بھی بگڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سید صاحب شہید ہو گئے۔ طبعاً مہدی اور امام کی شہادت سے اُن کے متبعین کے دل ٹوٹ گئے اور اُن سے منتسب تحریک، اہلحدیث رفع یدین تک محدود ہو کر رہ گئی۔" [۳]

سید احمد صاحب کی مہدیت تو بالاکوٹ میں دفن ہو گئی یا بقول اُن کے متبعین غائب ہو گئی لیکن یہی جھوٹا دعویٰ مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے راستہ صاف کر گیا۔ اس سے معلوم

۱؎ محمد سرور، افادات و ملفوظات سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اوّل ۱۹۷۲ء، ص ۱۹۶

۲؎ ایضاً، ص ۳۴۹

ہوتا ہے کہ مرزا غلام احمد واسطے جملہ مراحل سید احمد صاحب ہی نے طے کرنے ہوں گے لیکن بخت نے یاوری نہ کی اور موت نے مہلت نہ دی جس کے باعث لعنت کا اشتہار نما طوق مرزا قادیانی کو زیب گلو کرنا پڑا۔ سندھی صاحب نے خود فرمایا تھا:

"اس قسم کے روایاتی ماحول اور امام مہدی کے انتظار کی فضا میں مرزا غلام احمد نے مہدی کے آنے اور نزولِ مسیح کے عقیدے پر بحث کی۔ اب بجائے اس کے کہ سرسید کی طرح ان روایات کو موضوع قرار دیتے، جیسی کہ وہ ہیں، وہ خود مہدی اور مسیح بن گئے اور اس طرح ایک لغویت کی جگہ دوسری لغویت پیدا ہو گئی۔"[1]

جو لغویت بالاکوٹ میں دفن ہو جانے کے باوجود برٹش گورنمنٹ نے پھر قادیان سے پیدا کر دکھائی تھی، اس خشتِ اول کے بارے میں سید احمد صاحب کے ایک عاشقِ زار یعنی پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب نجدی اور ہندی وہابیت کا نقطۂ اختلاف بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرۂ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اسی کے بعد سید احمد صاحب نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔"[2]

سید احمد صاحب کی اس تحریکِ مہدیت کے بارے میں اسی نام نہاد جماعتِ مجاہدین کے ایک سرگرم کارکن اور مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا ہے۔ قارئینِ کرام ذرا انصاف کی رُو سے حالات کی تہہ میں جھانکنے اور حقیقت تک پہنچنے کی سعی فرمائیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"اوائل میں ایک دفعہ میں نے سید احمد صاحب کو شہید بتلایا تو آپ

---

[1] محمد سرور: افادات و ملفوظاتِ سندھی، ص ۲۵۱

[2] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵

(مولوی فضل الٰہی صاحب) سخت ناراض ہوئے اور مجھے دھکا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور فرمایا کہ وہ زندہ اور غائب ہیں عنقریب ظاہر ہوں گے۔ نیز آپ نے اُس جماعت کا شایع کردہ رسالہ بنام خلاصہ مجھے دکھایا، جس میں یہ حدیث تھی:

اذا مضت الف ومأتان واربعون سنة بعث الله المهدی فیبایع علی یدہ خلق کثیر ثم یغیبه الله تعالیٰ فیرتدون الیٰ دین اٰباءھم الا من اتبع کتاب الله وسنة نبیه۔ مگر یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں بھی نہیں بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے، یہ روایت اُس میں بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے اور ایک روایت یوں بھی بیان کی ہے فیقاتل حکفرۃ لاهود۔ اور اس قسم کے بے سروپا حکایات وقصے سوانح احمدی (جو کراچی سے حیات سید احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے) میں بھی درج ہیں اگر تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحب مرکز چرقند سے اپنے وطن میں واپس تشریف لاتے تو میرے رُوبرو کئی بار آپ نے سید صاحب کو شہید بتایا اور میری مار مفت میں ٹھہری۔ اچھا خیر استادوں کی مار بھی دراصل پیار اور عمر بھر کا سہارا ہے۔[1]

مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی صاحب کے پیش کردہ مذکورہ حوالے اور اُس میں درج شدہ دونوں جعلی وضعی روایات سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب نے اپنے مہدی ہونے کا بڑی شد و مد سے دعویٰ کر رکھا تھا۔ جو اُن کی تحریک کو ناکامی کے گڑھے میں پھینکنے کا باعث بنی۔ اس کے ساتھ ہی جس قسم کی کرامتوں اور الہاموں کی تشہیر کی گئی جن کا حقیقت سے قطعاً کوئی رابطہ ثابت نہیں ہوتا نیز وحی و عصمت کے جو دعاوی کیے گئے اُن سے صاف ظاہر یہی ہوتا ہے کہ موصوف کی منزلِ مقصود وہی تھی جہاں مرزا غلام احمد قادیانی

---

[1] عنایت اللہ اثری، مولوی، مکاشیب الصحابیہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۹ء، ص ۸۵، ۸۶

ے پہنچ کر دم لیا تھا، یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب کی قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ اس جہانِ فانی سے
لمِ جاودانی کی طرف بصد حسرت و یاس یہ کہتے ہوئے سدھار گئے ہوں گے۔ سہ

قسمت تو دیکھیے کہاں پہ ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

قارئینِ کرام نے سید احمد صاحب کے کشف و کرامت سے متعلق کتنے ہی واقعات پڑھے،
ہ کی وحی و عصمت کے بارے میں بیانات ملاحظہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہابی حضرات پر ہمارے
قرات شاق گزریں اور ان کی طبعِ نازک ہمارے بے لاگ اور خیر خواہانہ تبصرے کی متحمل نہ ہو سکے تو
مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے سوانح نگار اور میدانِ وہابیت کے شہسوار جناب مرزا حیرت دہلوی
کے تاثرات پیش کر دیتے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے:

"چند سوانح نویسوں نے افسوس ہے کہ سید صاحب کی وہ باتیں بیان کی ہیں جن سے
ان کی اصلی شان بھی گھٹ گئی۔ ان کے سوانح کا دیکھنے والا کبھی کسی انسان صفت
پر خیال نہیں جا سکتا۔ کہیں تو اس پارسا نیک مرد کو نعوذ باللہ نبی بنا دیا ہے کہیں
اس کی تمام حرکات و سکنات کو مافوق الفطرت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کہیں ان
میں وہ قوت بخشی گئی ہے جو ایک دیو میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کہیں ان کے بول سے
ایک عظیم الشان کھیت کو جلایا گیا ہے۔ کہیں ان کے لیے آسمانوں سے حلوے
کا طباق اتروایا گیا ہے۔ کہیں میلہ ہنود میں لے جا کے انھیں بیہوش کیا گیا ہے۔
اگر خود سوانح نویس خیال کر لیتے اور دینِ اسلام کے واجب الاحترام بانی کے
انھیں سوانح عمری یاد ہوتے تو وہ کبھی ایسی مضحکہ خیز اور طفلانہ باتیں اس
بزرگ سید پر عاید کر کے اس کی اصلی ذاتی لیاقت اور اصلی جوہر کو نہ مٹا دیتے۔"

موصوف نے اس ستم ظریفی کے پیشِ نظر سید صاحب کے سوانح نگاروں اور ان کے تحریر کردہ
ات و واقعات پر یقین رکھنے والوں کے ضمیروں کو دوسری مرتبہ یوں جھنجوڑا ہے:

مرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۰۲ء، ص ۳۵۱، ۳۵۲

"میں کہتا ہوں کہ سید احمد صاحب کے سوانح عمری میں صرف اُن مذکورۃ الصدر باتوں کا تذکرہ ہو جن سے نبی آخر الزماں کی ذات مقدس بہت مستعبد تھی ۔ تو پڑھنے والا سید احمد صاحب کو کیا سمجھے ؟ کیا خیال کرے ؟ آیا انھیں قطب سمجھے، غوث جانے یا نبی کہے ؟"[۱]

گے موصوف مرزا نے مذکورہ واقعات کے بارے میں اپنی واضح رائے یوں ظاہر فرمائی ہے

"اُن کے سوانح نویسوں اور بعض سادہ لوح ساتھیوں نے ناحق بزرگ سید کی ذات پر یہ گھڑی ہوئی باتیں عائد کیں اور بے فائدہ اپنی تراشی ہوئی گپیں اُس کے سر چپکیں ۔"[۲]

ں تک سید احمد صاحب کی بزرگی کے واقعات کے بارے میں بیانات کا گھڑی ہوئی باتیں ہونے کا تعلق ہے تو مرزا حیرت دہلوی کی اِس رائے سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں لیکن سوانح نویسوں اور سادہ لوح ساتھیوں کے سر تھوپنا کسی مرحلے پر بھی حقیقت قرار نہیں سکتا کیونکہ اوّل سے آخر تک یہ ساری کارگزاری خود سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سر انجام دی۔ سید صاحب کے مکتوبات اور صراطِ مستقیم کتاب اِس بات پر شاہد ہیں، جیسے کتنے ہی بیانات اور اقتباسات پیچھے مذکور ہوئے اور بعض عبارتیں آگے ملاحظہ فرمائی سکتی ہیں۔ سوانح نگاروں نے تو لکیر کے فقیر بن کر مکھی پہ مکھی ماری ہے اور برٹش گورنمنٹ کی ردہ سازش کو کامیابی سے ہمکنار کروانے میں اِن حضرات کا اِتنا ہاتھ بٹایا ہے کہ سازش کو ۓ اور ظاہر نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ اُس کی سرپرستی کا بارِ گراں مرزا غلام احمد قادیانی نے ما لیا۔ اُمید ہے کہ وہابی حضرات ہماری حق گوئی سے ناراض ہوتے وقت مرزا حیرت دہلوی ہے حضرات کا خیال ضرور رکھا کریں گے ؎

یوں نظر دوڑے نہ برچھی تان کر
اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

---

[۱] مرزا حیرت دہلوی : حیاتِ طیبہ ، ص ۲۵۲

[۲] ایضاً ، ص ۲۵۳

مسئلہ غیوبیت

سید احمد صاحب اور اُن کے دستِ راست یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی جب بالاکوٹ میں کھیت رہے۔ وحی و عصمت کے تمام دعوے جھوٹے ثابت ہوگئے۔ پیشگوئیاں فراڈ ثابت ہو کر رہیں تو موصوف کے خلفاء نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ ہمارے امیر المؤمنین مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ سلامت ہیں اور اُنھیں اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے غائب رہنے کا حکم ملا ہے۔ کبھی مناسب وقت پر دوبارہ تشریف فرما ہو کر اپنے سیکے ہوئے وعدوں، سُنائے ہوئے الہاموں کو سچا ثابت کر کے دکھائیں گے۔ غرضیکہ اسی طرح جھوٹ بولتے اور دُنیا کو بہکاتے ہوئے قریباً ڈیڑھ صدی گزرنے والی ہے لیکن وہابی حضرات ہیں کہ اپنے اکابر کی سرنگونی کا سیدھی طرح اعتراف کرنے کی جانب آتے ہی نہیں۔ بہر حال غیوبیت کے بارے میں محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

"میدان صاف کرنے کے بعد سید صاحب مثلِ شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے تھے کہ یک بیک آپ نظروں سے غائب ہوگئے۔ مولوی جعفر علی نقوی جو آپ کا باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا لکھتا ہے کہ "جناب حضرت امیر المؤمنین مع ہمہ جماعت از نظرِ من غائب شدند"۔ یہ واقعہ بگر سوم ۲۴ ذیقعد ۱۲۴۶ھ کو واقع ہوا۔ اُس وقت آپ کے غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے لشکرِ اسلام میں ہل چل سی مچ گئی۔"[1]

اِس واقعہ کے ساٹھ سال بعد تک لوگوں کی رائے غیوبیت کے بارے میں کیا رہی، اِس سلسلے میں بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے یوں وہابی حضرات کی آرا کا تذکرہ کر دیا ہے:

"ایسی بھی بہت سی روایتیں ہیں کہ اس واقعۂ بالاکوٹ کے بعد متعدد لوگوں نے سید صاحب اور اُن کے رفیقوں کو دیکھا۔ اِس میں شک نہیں کہ آپ کی شہادت اور غیوبیت میں روزِ اوّل سے اختلاف ہے، مگر اب ساٹھ برس سے بھی زاید زمانہ گزر جانے کے بعد خیالِ غیوبیت خود بخود لوگوں کے

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۲۸۸

...ولوں سے مخفی ہوتا جاتا ہے۔ سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ، جن سے معرکۂ
بالاکوٹ سے سید صاحب نے اپنی غیبوبیت کی پیشگوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اقرباء اور
اہلِ قافلہ آپ کی غیبوبیت کے قائل تھے"۔ [1]

...وف کا یہ بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ جعفر علی نقوی غیبوبیت کے ڈھنڈورچی تھے
سید صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لڑے تھے، وہی از نظرِ من غائب شد ند
...نے والے کا بیان یہاں برعکس ہے۔ علاوہ بریں اس عبارت میں سید صاحب کے دو ساتھیوں کا
...ب ہونا بھی لکھا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے:

"مولوی جعفر علی نقوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعد میں لوگوں کی زبانی اس امر کی بھی تصدیق ہوئی ہے کہ سید احمد صاحب کی ٹانگ پر ایک گولی کا زخم بھی لگا تھا۔ اس زخم کے لگنے کے بعد آپ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے رو بقبلہ دعا مانگ رہے تھے کہ اسی پتھر سے غائب ہو گئے۔

یہ بھی اسی مولف کا بیان ہے کہ موضع شملئی میں پہنچ کر ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سید صاحب موضع مٹی کوٹ میں (جو گوجروں کا گاؤں میدانِ جنگ بالاکوٹ سے ملا ہوا تھا) گوجروں کے گھر میں زندہ موجود ہیں اور اس پتھر پر سے جہاں آپ دعا مانگ رہے تھے، گوجر لوگ آپ کو اٹھا کر اپنے گاؤں میں لے گئے تھے اور

بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مولوی نظام الدین چشتی کاندھلوی جو بخارا اور کشمیر اور کاشغر کے سفیر ہو کر گئے تھے اور مولوی عبداللہ صاحب دونوں شخص میدانِ جنگ سے سید صاحب کے ساتھ ہی غائب ہو کر آپ کے رفیقِ غیبوبیت ہو گئے۔

مولوی جعفر علی نقوی اپنی شہادت کو غلبہ دیتے ہیں"۔ [2]

اسی غیبوبیت کے طلسم کی کہانی مشہور وہابی مورخ اور سید صاحب کے سوانح نگار،

---

[1] ...د جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۲۹۰

[2] ایضاً: ۲۸۹

غلام رسول مہر (المتوفی ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء) کی زبانی سُنیے کہ وہ وہابی علماء و مورخین کے فراڈ کا ر...
کس طرح روتے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے:

"سید صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے اُن کی غیبوبیت کا مسئلہ کھڑا دیا اور مدت تک اِس عقیدے کی اشاعت پُورے اہتمام سے جاری رکھی۔ عوام کے ایسے معتقدات بحث ونظر کے محتاج نہیں ہوتے۔ اُن کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ کسی واقعے کے قبول و پذیرائی میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتے، جب تک اُسے باعتبارِ وقوع مروجہ اصول و ہنجار سے صریحاً منحرف نہ پائیں۔ لیکن حیرت ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خلفاء نے بھی اسے قبول کیا۔ نہ محض قبول کیا بلکہ اِسے مدت تک سعی و جہد کا مرکز بنائے رکھا۔"[1]

سید صاحب کے تربیت یافتہ اور اُن کے خاص متوسلین کی غیبوبت کے بارے میں جھو...
شہادتیں، عوام الناس کو چھلنے اور پیٹ پرستی کی خاطر جھوٹے بیانات جناب غلام رسول مہر...
زبانی سُن لیجیے:

"سرحد کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ اُنھوں نے واقعۂ بالاکوٹ کے بعد سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے مثلاً جھنگول کے اخوند محمد ارم، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، مولوی خیرالدین شیر کوٹی اور مولوی محمد قاسم پانی پتی چند افراد کے ہمراہ اِسی بنا پر جھنگول میں ٹھہر گئے کہ اُنھیں سید صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔"[2]

اب سید صاحب کے اُن خلفاء کا نظریہ ملاحظہ فرمایئے جو صادق پوری تھے اور جنھوں نے سید صاحب کی اِس نام نہاد تحریکِ جہاد کو پیٹ پرستی کا جھوٹے پروپیگنڈے کے بل بوتے پ... کاروبار بنایا تھا۔ جناب غلام رسول مہر نے آپ کے خلفاء کی کتاب رسائلِ تسعہ کے صفحہ ۹۲

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۸۱۰
[2] ایضاً: ۸۱۱

۔۔۔ کے حوالے سے مولوی ولایت علی خلیفۂ سید احمد صاحب کا بیان بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ ۔۔۔ صاحب نے بڑے تعجب کے ساتھ لکھا ہے:

"حد درجہ تعجب اس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقۂ خاص میں سے اہلِ صادق پور نے عقیدۂ غیوبت کو پورے کاروبارِ جہاد کا مدار و محور بنایا۔ مولانا ولایت علی مرحوم نے دعوت کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ بالاکوٹ میں شکست اس لیے ہوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا میل جمنے نہ پائے۔ شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو چلہ گزاری اور دعا و زاری کے لیے پہاڑوں پر بلایا۔ سچ ہے خلوت بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت یونس مچھلی کے پیٹ میں رہے، حضرت موسیٰ کوہِ طور پر، حضرت عیسیٰ کو آسمانوں پر اٹھایا۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی روز غارِ ثور میں چھپایا۔ سید صاحب کی شہادت کی خبر شیطان نے جھوٹی مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ (سید صاحب) بھی تو اُن لوگوں (انبیائے کرام) کے پیرو ہیں۔ اُن کی سنتوں سے کیونکر محروم رہیں۔۔۔۔ اور ہمارے حضرت (سید صاحب) کی خلوت کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں اُن کے عرصہ بعید گزرے گا۔ یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوڑی سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے مشرف ہو جاتے ہیں اور انشاء اللہ عرصۂ قریب میں مثل خورشید درخشاں کے ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوارِ ہدایت سے منور فرمائیں گے۔"[1]

۔۔۔ غلام رسول مہر کی زبانی اس کذب و افترا کی کہانی کے بارے میں مزید سنیے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سید صاحب کی جماعت کو امداد دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں انبالہ میں چلا تھا، جسے انگریزوں کی اصطلاح میں وہابیوں کا بڑا مقدمہ کہا جاتا ہے۔ اس میں مولانا یحییٰ علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی جعفر

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۵۱۳

تھانیسری اور بعض دُوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اِس مقدمے میں کئی اصحاب نے گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے، انھیں باقاعدہ تلقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے، وہ امام وقت ہیں، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اُن کے ظہور سے پہلے مقامِ ظہور (یعنی سرحد) پر پہنچ جائے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحب تواریخ عجیبہ بھی سید صاحب کو زندہ مانتے تھے اور اُن کا دعویٰ تھا کہ دو مرتبہ زیارت جسمانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور حضرت کے زندہ ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب سے دس باتیں سُنی تھیں، نو پوری ہو چکی ہیں، ایک باقی ہے یعنی غیبت کے بعد ظہور۔[1]

مولوی محمد جعفر تھانیسری، غلام رسول مہر اور علیوبیت کے دُوسرے قائلین، جن کے بیانات پیش کیے گئے ہیں، اِن میں سے کوئی بھی نامور عالمِ دین نہیں، ہاں بعض حضرات کو اُن کے علم میں اُونچے پائے کا تاریخ دان شمار کیا جاتا ہے اب ہم وہابی علماء کے بیانات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیرآبادی اور اُن کے اُستاد مولوی فضل الٰہی صاحب کے بیانات گزر چکے۔ مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم مولوی عاشق الٰہی میرٹھی لکھتے ہیں:

تب لاشیں سنبھالی گئیں تو سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا پتہ نہ لگا۔ لوگ تلاش میں نکلے اور اِدھر اُدھر جستجو کرنے لگے۔ چند چند آدمی مختلف دیہات اور پہاڑوں میں جاکر ڈھونڈا کرتے تھے اور کسی کو نہ ملتے تھے۔ گاؤں میں برابر پتہ چلتا جاتا تھا کہ یہاں تھے، وہاں تھے۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ مجھے سخت بخار تھا۔ اسی حالت میں مَیں نے تینوں شخصوں کو جاتے دیکھا، جن میں ایک سید صاحب تھے۔ مَیں نے غُل مچایا کہ حضرت آپ ہم کو کہاں چھوڑ گئے اور کیوں ہم سے

---

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۴۱۳

علیحدہ ہوگئے؟ سب لوگ آپ کے رُو براہ ہیں۔ میرے غُل مچانے پر حضرت سید صاحب نے منہ پھیر کر مجھے دیکھا، کچھ جواب نہ دیا اور چلے گئے۔ میں بہ سبب سخت بیماری کے اُٹھ نہ سکا، غل مچایا کیا۔

دُوسرے شخص نے بیان کیا کہ ہم اُنھیں دنوں سید صاحب کو ایک پہاڑ میں تلاش کر رہے تھے۔ دفعتاً کچھ فاصلے پر گڑا بڑاٹ سُنا۔ میں وہاں گیا تو دیکھوں کیا، سید صاحب اور اُن کے دو ہمراہی بیٹھے ہیں۔ میں نے سلام و مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت کیوں غائب ہوگئے؟ سب لوگ بغیر آپ کے پریشان ہیں۔ مجبور ہو کر ہم نے فلاں شخص کو اپنا خلیفہ بنا لیا ہے اور اُن سے بیعت کی ہے۔ آپ نے اِس پر تحسین کی اور فرمایا؛ ہم کو اب غائب رہنے کا حکم ہوا ہے، اِس لیے ہم نہیں آ سکتے۔ اِتنا فرما کر قافلہ والوں کی خیریت اور حالات پوچھے اور پھر روانہ ہوگئے۔ میں نے بھی ہمراہ ہونے کے لیے عرض کیا تو منع فرمایا اور پھر کوشش کر کے جو میں نے پیچھے چلنا چاہا تو میرے ہاتھ پاؤں وزنی ہوگئے۔ میں تو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ حیران اور مایوس تھا کہ یا اللہ! کیسے چلوں؟ اور حضرت سید صاحب مع ہمراہیوں کے نظر سے غائب ہوگئے۔

تیسرے ایک اور شخص نے بیان کیا کہ سید صاحب کو ڈھونڈتے ہم ایک گاؤں میں ایک جگہ اُترے، وہاں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ قبر جو کُھدی ہوئی تازہ پڑی ہے، اِس کو سید صاحب ابھی ڈھوا کر گئے ہیں، کیوں کہ اُونچی تھی۔ سو اِدھر اُدھر دیکھا تو کہیں پتہ نہ لگا۔

منشی محمد ابراہیم صاحب نے کہا کہ سید صاحب تیرھویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے تھے اور اب ۱۳۱۰ھ میں ممکن ہے کہ حیات ہوں۔ اُنھوں نے جب لفظ ممکن کہا تو حضرت امام ربّانی (یعنی مولوی رشید احمد گنگوہی) نے ارشاد فرمایا؛ بلکہ اغلب، اور فرمایا کہ سید صاحب انبہٹہ میں بھی تشریف لائے۔[1]

---

[1] عاشق الٰہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، حصہ دوم، ص ۲۷۰، ۲۷۱

پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ اور سید احمد صاحب کے عاشقِ زار جناب ڈاکٹر قیام الدین ا
مسئلہ غیبوبت پر عجیب فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات پیش کر کے صورتِ حال کو غتر بود کرنے
حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن اتنے عظیم فراڈ کے باعث وہابیانِ ہند کے ماتھے پر جو کلنگ
ٹیکہ لگا ہوا ہے اُسے صحیح ثابت کرنے کے راستے مسدود پا کر اظہارِ برأت کی توفیق بھی نہیں پا
چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

سب سے آخر میں اُن (سید صاحب) کو ایک گھمسان دست بدست معرکہ میں
لڑتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئے کسی نے اُن کو گرتے ہوئے اپنی
آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہابیوں کے ایک طبقے میں یہ خیال چکر لگاتا رہا
کہ سید احمد شہید نہیں غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے
منطق اور عقل کی روشنی میں سید احمد قطعاً اسی جنگ میں شہید ہو گئے مگر بالاکوٹ
کے باقی ماندہ لوگوں اور اُن کے بہت سے رفقاء و متبعین کے لیے یہ ناگہانی
شدید ضرب ناقابلِ برداشت تھی۔ انھوں نے ایک مقصدِ عالی کے حصول کے لیے
اپنی تمام مادی املاک قربان کر دی تھی اور سید احمدؒ کے ساتھ ناقابلِ قیاس دکھ
جھیلے تھے، لیکن اب قسمت کی ہوش ربا ناگہانی سرگشتگی سے سب بیٹھ گیا تھا۔
غیبوبت کے نظریے کا پس منظر یہی ہے۔ دراصل یہ ایک ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اُن
کے مادی حرکات و سکنات کے منظر سے اُن کے محبوب سردار و رہنما کے یک بیک
اُٹھ جانے اور مر جانے پر یقین کرنا اُن کے لیے دشوار تھا۔ یہ نظریہ اُن کے اِس
راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سید احمد جسمانی طور پر فنا ہو گئے ہوں
تو ہو گئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔[۱]

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب کو کم از کم اب تو یقین ہو چکا ہو گا کہ سید احمد صاحب کا مشن ا
مکمل طور پر فنا ہو چکا اور اُس کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔ رہا یہ کہ نظریۂ غیبوبت کون سے را

---

[۱] محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۰

ہ کا سایہ ہے، اس حقیقت کے چہرے پر وہابی علماء و مورخین نے جتنے بھی تہہ بر تہہ پردے
ہوئے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اسی عنوان کے تحت آئندہ سطور میں ہم نے اُن تمام پردوں کو
قیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کا دوسرا فلسفہ ملاحظہ ہو:

"ہٹلر اور سبھاش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ ان کی موتیں
بھی پردۂ راز میں مخفی تھیں۔ اوّل الذکر کی موت کے متعلق حکومت ہند کی مسلسل
تحقیقات کے باوجود ان دونوں لیڈروں کے ہم وطنوں کے ایک طبقے میں اُن
کی زندگی کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لیے ایسی
محکم وفاداری وجاں نثاری ہوسکتی ہے تو ایسے شخص کے لیے جو صرف سیاسی لیڈر
نہیں بلکہ حسنات وخیرات کا کامل نمونہ تھا، اُس کے متبعین میں جو گرمجوشی اور سرشاری
محبت وعقیدت پیدا ہوئی ہوگی، قیاس کی جاسکتی ہے۔"[1]

صاحب کے حکم سے قیاس تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن سید صاحب کی پیشگوئیاں کدھر جائیں گی؟
کے بعد جو سید صاحب کے خلفاء اور متبعین اُن سے ملاقات وگفتگو کرنے کے دعوے
ہے کیا ایسے بیانات کو محبت وعقیدت ہی پر قیاس کیا جائے یا ایسی باتوں کا دروغگوئی
لسازی سے بھی کوئی رشتہ ناطہ ہے؟ شیعہ حضرات کا اپنے امام مہدی کو غائب ماننا اور وہابی
ت کا سید احمد صاحب کو مہدی بتانا اور غائب ماننا، کیا دونوں جماعتوں کا یہ نظریہ درست ہے؟
ک جماعت کا بوجہ محبت وعقیدت ہے تو کیا دوسری جماعت کا بوجہ بغض وعداوت ہے؟
دونوں جگہ ایک ہی جذبہ کارفرما ہے تو دونوں کا حکم مختلف کیوں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے:

"صادق پور کے ارکان خاندان خصوصاً ولایت علی پر انگریز اور ہندوستانی مصنفین
نے سید احمد کے ظہور ثانی عقیدہ کی اشاعت پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ اُن پر اس
عقیدے کی اشاعت میں دانستہ بے ایمانی کا الزام عاید کیا گیا ہے کہ ولایت علی
بلکہ اس مقصد سے یہ قدم اٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو پھر اُبھارا

---

[1] مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، مطبوعہ کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۰، ۱۱۱

جا سکے اور اس جدوجہد میں اپنی سرشاری بحال رکھی جا سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ عقیدہ ایک وقتی ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اس پر سختی سے نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کی خدمت جو ولایت علی اور اُن کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی ٹھوس تھیں کہ اتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔[۱]

پہلے وہابی حضرات کے اس عقیدے پر ہم بھی سختی سے نظر نہیں کرتے اور یہی باور کر لیتے ہیں کہ اس عقیدے کا فائدہ کمزور اور موہوم تھا، لیکن وہابی حضرات ٹھنڈے دل و دماغ سے یہ بتانے کی زحمت بھی گوارا فرمالیں گے کہ رسائل تسعہ میں جو مولوی ولایت علی صاحب کا بنام دعوت شامل ہے، اس رسالے میں مولوی ولایت علی صاحب نے سید صاحب کی غیبوبت اور ظہور ثانی وغیرہ کے متعلق جو دو حدیثیں اپنے دماغ سے گھڑ کر شامل رسالہ کی ہیں آخر اس جعلسازی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اگر یہ وضاحت بھی فرمادی جائے کہ حدیثیں گھڑنے والے کو شریعتِ مطہرہ کس نظر سے دیکھتی ہے، تو معاملے کی تہہ تک ہر کسی کے لیے انتہائی آسان ہو جائے۔ کیا وہابی علماء ہماری درخواست پر اتنی بھی زحمت اُٹھالیں گے؟

مولوی دین میں کہہ بھاگ خدا لگتی کچھ
مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

آئیے ہم بتاتے ہیں کہ سید احمد صاحب کے خلفاء اور متبعین کو اُن کی غیبوبت و ظہورِ ثانی کا عقیدہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ اس سلسلے میں ہم اپنی جانب سے کچھ کہیں۔ اس سے پہلے سید احمد صاحب کے چند ذاتی بیانات پیش کرنے مناسب ہیں تاکہ فیصلہ قارئین کر سکیں۔ چنانچہ سید صاحب نے عازمِ سرحد ہوتے وقت ایک پیشگوئی فرمائی تھی۔ محمد جعفر تھانیسری نے اُسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

---

[۱] محمد مسلم عظیم آبادی: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۱۱۱

سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بوقتِ روانگی خراسان آپ
اپنی ہمشیر یعنی والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے
فرمایا کہ اے میری بہن میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک
ہند کا شرک اور ایران کا رفض اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے
محو ہو کر ہر مُردہ سنت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا
اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق
پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا، تو تم اُس کے قول پر
ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو
میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔ آپ کے سفرِ جہاد سے پہلے (غالباً سفرِ حج
میں) آپ کو یہ الہام ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر
پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندوستان کے رشک افزائے چمن
ہو جائے گا، چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر ایک مرید واقف تھا۔[1]

...وہابی حضرات اور قارئین حضرات سے گزارش ہے کہ خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو سامنے
...کر، قِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ کے بگل بجا دینے والے منظر کو سامنے رکھ کر غور
...ئیں کہ سید صاحب نے ہند کا شرک، ایران کا رفض، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق
...نی زندگی میں مٹا دیا تھا؟ کیا ہر مُردہ سنت ان کے ہاتھوں زندہ ہو گئی تھی؟ کیا واقعی انہوں نے
...پنے نشر کردہ الہام کے مطابق پشاور سے ستلج تک پنجاب کو فتح کر لیا تھا؟ اگر ان میں سے جیسا کہ
...اہر ہے، سید صاحب کوئی ایک کام بھی نہ کر سکے تو خود فیصلہ فرمائیے کہ موصوف کے یہ جملہ
...وحی اور الہامات ربانی تھے یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ جملہ الہامات محض شیطانی
...ھے؟ کیا برٹش گورنمنٹ کی ہدایات پر کمال رازداری سے الہام کا لیبل تو نہیں لگایا جاتا تھا؟
...اور نظر بالا سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی فرما لینا کہ سید صاحب کا پشاور سے ستلج

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۱۷۱، ۱۷۲

ملک پنجاب کو فتح کرنے کا مقصد اِس علاقے کو بھی اُسی قسم کا رشک افزائے چمن بنانا تھا؟ جیسا ہندوستان برٹش گورنمنٹ کی غلامی سے بن چکا تھا۔ اس بیان کی روشنی میں ذرا یہ بھی اور سمجھا کی سعی فرمائی جائے کہ سید صاحب اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے یا اُن کی س... تک وہ انگریزی راج کی حدود کو وسیع کرنا تھا؟ اس امر کا فیصلہ کرتے وقت اگر محمد جعفر تھانیسری کے درج ذیل بیان کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا بڑی حد تک آسان ہو جائے گا۔ موصوف نے اِن الہامات کی تاویل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"بملاحظہ مکتوبات احمدی جن میں سید صاحبؒ کا اصل مافی الضمیر بڑی صراحت کے ساتھ بیسیوں مختلف واقعات پر ظاہر کیا گیا ہے اور اکثر موثقوں کی تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ وعدۂ فتحِ پنجاب کے الہام کا آپ کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اِس کو سراسر صادق اور ہونے والی بات سمجھ کر بارہا فرمایا کرتے تھے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اِس الہام میں وسوسۂ شیطانی اور شائبۂ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اِس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ آئے گی۔

لیکن واقعہ بالاکوٹ خواہ شہادت ہو خواہ غیبوبیت، بظاہر اِس یقینی الہام کے سراسر خلاف ہوا۔ اب اس کا جواب یہی ہے کہ از روئے اصولِ شریعتِ محمدی کے الہام ایک ظنی چیز ہے اور اِس کی تاویلوں وغیرہ میں سو طرح کی غلطیوں کا گمان ہوتا ہے۔ یہ تو ضرور ہوا کہ اِس وقوعہ کے پندرہ برس بعد سلطنتِ پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آ گئی کہ جس کو ہم مسلمان اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔"[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیاتِ سید احمد شہید، ص ۲۹۱

قارئین کرام نے تھانیسری صاحب کی تاویل تو ملاحظہ فرمائی اب فیصلہ کرنا باقی ہے کہ سید صاحب
یصلہ اس تحریک جہاد سے برٹش گورنمنٹ کی حدود کو وسیع کرنا ہی تھا یا کچھ اور، نیز اُن کے
ہامات رحمانی تھے یا شیطانی ؟ یہ فیصلہ ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑ کر اس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ
ر تھانیسری صاحب نے بتایا ہے کہ فتح پنجاب کے الہام کا تذکرہ سید صاحب نے اپنے
ت میں بیسیوں سے زاید مقامات پر تصریحاً کیا ہے۔ ہم اتنے تو نہیں ہاں چند مقامات کی
ن دہی کر دیتے ہیں تاکہ کوئی صاحب اسے تھانیسری صاحب کا افتراء بتا کر غلام رسول مہر
ب کی طرح گلو خلاصی کرانے کی کوشش نہ کرتے پھریں۔ چنانچہ سید صاحب نے یار محمد خان
م یاغستان کے نام خط لکھتے ہوئے تصریح فرمائی جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے :

"یہ فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اس مبشر کی اس بشارت
میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی وسوسہ اور نفسانی خواہش
کا شائبہ اس الہام ربانی میں نہیں ہے۔" [۱]

فقیر محمد خان قصوری کے نام خط لکھتے ہوئے سکھوں کے استیصال کرنے یعنی پنجاب پر
بض ہونے کے الہام کا ذکر جن لفظوں میں کیا، اُن کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

"اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردۂ غیب سے کفار یعنی لانبے بال والے
سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں
شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ روحانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو
اُن پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔" [۲]

رئیس قلات خان خانان خلباقی کے نام جو مکتوب بھیجا گیا، اُس میں سید احمد صاحب نے
پنجاب کے الہام کا جن لفظوں میں تذکرہ کیا اُن کا ترجمہ بغرض سہولت پیش خدمت ہے :

"اس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اس فقیر کو بارہا پردۂ غیب سے وارد ہونے والی

---

۱ سعادت مرزا، مکتوبات سید احمد شہید، ص ۴۱

۲ ایضاً : ص ۴۴، ۴۴

روحانی باتوں اور ربّانی الہام کے ذریعے جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے وغیرہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچّی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے۔" [1]

مکتوب بنام شاہِ بخارا میں سیّد صاحب نے اسی بات کو یُوں دُہرایا ہے:

"قیامِ جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے رفع و قمع کرنے کے لیے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعے غیبی امامت سے اس فقیر کو مشرف فرمایا اور ہم کو فتح و نصرت کے متعلق ایسی بشارتوں کا مخبر اور اُس پروردگارِ عالم کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے مؤثر کارروائی کے لیے اور سیّد المرسلین کی سنّت کے احیاء اور سرکش کافروں کی بیخ کنی اور بنیاد کو اُکھاڑ پھینکنے کے لیے مامور فرمایا ہے اور اپنے سچّے وعدہ کے بموجب مظفر و منصور کے لقب سے ملقّب فرمایا ہے۔" [2]

اپنے درجۂ امامت سے ہر خاص و عام و ہابی اور تمام شاہ و مجاہدین کے ہر فرد کو مطلع کرنے کی غرض سے سیّد صاحب نے ایک سرکلر یا اشتہارِ عام مشتہر کروایا، جس میں یہ تصریح فرمائی گئی:

"اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اُس مالکِ حقیقی اور بادشاہ تحقیقی نے اِس گوشہ نشین فقیر عاجز اور خاکسار کو پہلے توغیبی اشاروں اور اپنے الہامات کے ذریعے، جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔ دُوسرے یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص و عام کی تالیفِ قلوب کے لیے مرتبہ امامت سے مجھ کو مشرف فرمایا۔ چنانچہ بتاریخ ۱۲ جمادی الثانی روز پنجشنبہ ۱۲۴۳ھ سادات کرام، علماء، مشاہیر اور بڑے بڑے مشائخ اور باحشمت صاحبزادوں اور بلند مرتبت خوانین نے معہ تمام

---

[1] سخاوت مرزا، مکتوبات سیّد احمد شہید، ص ۵۰
[2] ایضاً، ص ۵۵

خاص و عام مسلمانوں کے میرے ہاتھ پر بیعت کر کے، مجھ کو اپنا امام قرار دیا اور میری امامت اور حکومت کو تسلیم کر کے میری اطاعت پر سر تسلیم خم کر دیا اور اُس روز سے اب تک یہ بیعت اس فقیر کے ہاتھ پر جاری ہے اور تمام مسلمانوں میں اس کا چرچا ہے۔" ؎

سلطان محمد خاں والیٔ پشاور کے مشیر و دبیر جناب فیض اللہ خاں مہمند کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے انہیں اسی الہام کا قائل بنانے اور اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی خاطر یوں سیاست بتائی تھی:

"آپ کے ذہن و دماغ پر اس خاکسار کا معاملہ آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر و باہر ہے کہ میں قوم سکھ جیسے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مامور ہوں اور فتح و نصرت کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اُس بادشاہ منان کے وعدوں کے خلاف یہ سب وہم و گمان، کافروں اور گمراہوں کے وسوسے ہیں نہ کہ دینداروں اور اور ایمان والوں کی سمجھ بوجھ ہے۔" ؎

سید صاحب کا اس الہام کی بار بار تشہیر کرنا کہ پنجاب میرے ہاتھ پر ضرور فتح ہو گا نیز پیشگوئی کرنا کہ میرے ہاتھوں جب تک ہندوستان کا شرک، چین کا کفر، ایران کا رفض اور ترکستان کا نفاق نہ مٹ جائے گا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ مجھے موت نہیں دے گا اور میری موت کی کوئی حلفیہ شہادت بھی دے پھر بھی اُسے سچا نہ جاننا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہوں نے موصوف کے خلفاء اور متبعین کو مجبور کیا کہ سید صاحب کی موت کا انکار کر کے غیبوبیت کا سلسلہ کھڑا کر دیں تاکہ لوگ اُن کے الہامات کو محض ایک فراڈ نہ سمجھنے لگیں اور انھیں حقیقت نفس الامری کا پتہ نہ لگ جائے۔ اگر وہابی حضرات سید صاحب کی غیبوبیت کا افسانہ نہ گھڑتے تو وہابی صاحبوں کو سید صاحب کو بزرگ بتانے کی قطعاً گنجائش باقی نہ رہتی تھی بلکہ انھیں

؎ سوانح احمدی، مکتوبات سید احمد شہید، ص ۱۹۱۔

؎ ایضاً، ص ۳۰۳

شروع سے مسلمان مرزا غلام احمد قادیانی کا پیشرو اور قائد جانتے لگ جاتے، اُن کے ارادوں کی حقیقت سے واقف ہو جاتے اور ہندوستان سے جو ان نام نہاد مجاہدین کے لیے امداد پہنچ رہی تھی اُس کا سلسلہ قطعاً بند ہو جاتا۔ یہ تین ضرورتیں تھیں جنھوں نے اُن کے علماء کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ پُر اسرار ڈرامہ پیش کر دیں جو تاریخ کا المناک سانحہ اور وہابیہ کی افسوسناک شرارت کے سوا اور کچھ نہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

دشمنِ مصطفیٰ کی نسل منقطع

سرزمینِ پاک و ہند میں ہزاروں اولیائے کرام آرام فرما ہیں، جنھوں نے اپنی زندگیاں اعلائے کلمۃ الحق کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نے بے شمار غیر مسلموں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا، جس کے باعث آج بھی وہ مرجعِ خلائق ہیں اور مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے خود کو پیکرِ تسلیم و رضا بنا کر رکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل اُن کی جانب جھکا دئے۔ مزاراتِ بزرگانِ دین اُن حضرات کی مقبولیت اور مرجعِ خلائق ہونے کے زندہ ثبوت ہیں لیکن اِس کے باوجود وہابی حضرات کی خواہش ہے کہ اولیاء اللہ کی جانب سے مسلمانوں کی توجہ پھیر کر اپنے آرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی جانب مبذول کرائیں۔ اِسی مقصد کی خاطر مشہور وہابی عالم مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

"مولوی عبداللہ صاحب معرفت جھنڈوڈے سے (جو ایک اولیاء کامل صاحب کشف عثمان میں تھے) کسی نے پُوچھا کہ ہند کے اولیاء اللہ میں سے سب سے برتر مقبولِ خدا ولی کون سا بزرگ ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ عالمِ ارواح کی سیر میں، میں نے دیکھا ہے کہ سب سے بڑا درجہ اولیائے ہند میں مولوی محمد اسمٰعیل شہید کا ہے، کیونکہ میں نے مولانا شہید کو جنت میں ایک چھپر کھٹ پر لیٹے ہوئے اور کتاب صراطِ مستقیم کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"[1]

---

[1] محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۳۰۱، ۳۰۲

قطع نظر اس کے کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی کے نزدیک کشف کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے اور مکار ہیں، جیسا کہ تقویۃ الایمان میں لکھا ہے اور قطع نظر اس کے کہ چبوترے پر بیٹھنے والا اولیاء اللہ کا بزرگ کس طرح ہوگیا اور قطع نظر اس کے کہ قرآن و حدیث کی جگہ صراط المستقیم نامی کتاب کا پڑھنے والا کیونکر سرتاج اولیاء ہوگیا؟ کیا داتا گنج بخش علی ہجویری، خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت فرید الدین شکر گنج، حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم جیسی ہستیاں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی سے کمتر تھیں؟ خدا کے بندو! اگر جھوٹ بولتے ہوئے مخلوق سے شرم نہیں آتی تو کم از کم خالق سے ڈرنا چاہیے۔ اور نہ سہی تو دہلوی صاحب کی قبر کہاں تک مرجع خلائق ہے، اُسی کی جانب توجہ کرکے کوئی عقل کی بات کہہ دیا کیجیے۔ موصوف کی قبر کے بارے میں تھانیسری صاحب رقمطراز ہیں،

"افسوس ہے کہ ایسے شخص کفر و شرک کے قاطع کی قبر پر اب وہاں کے لوگ نسوار چڑھا کر منتیں اور مرادیں آپ سے مانگتے ہیں۔"[1]

تھانیسری صاحب شکوہ تو کرنے بیٹھ گئے لیکن اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟ جناب والا! جیسے وہ بزرگ تھے ویسے ہی اُن پر چڑھاوے چڑھ رہے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ مہلت اور توفیق دے تو کبھی اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر بھی دیکھ لیجیے کہ مخلوقِ خدا کیسے والہانہ انداز میں اُن کی جانب دوڑتی چلی جاتی ہے۔ ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ فیض کے دریا رواں ہیں اور پیاسے جھوم جھوم کر اُن کی جانب دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سعادت مند اُن حضرات کی بدولت فیوض و برکات سے خوب سیراب ہوتے اور عنایات سے مالا مال ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن دہلوی صاحب کی قبر پر اگر نسوار چڑھائی جاتی تو اور کیا چیز چڑھائی جانی چاہیے تھی۔ کاش! موصوف کے محبین و معتقدین کبھی اس جانب بھی توجہ فرمائیں کہ نسل منقطع تو دشمنانِ رسول کی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝ اور جس کی

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۲۱۹

زندہ مثال یہ بھی ہے کہ یزید جیسے دشمنِ اہلِ بیت کی اولاد سے آج ایک فرد بھی دنیا میں موجود نہیں لیکن ساداتِ کرام کا کوئی شمار نہیں۔ اسی طرح توہین و تنقیصِ شانِ رسالت کے باعث موصوف اپنے سارے خاندان ہی کو لے ڈوبے، جیسا کہ تھانیسری صاحب نے بھی لکھا ہے:

"مولوی محمد عمر صاحب آپ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۸۰ھ میں وہ بھی لاولد اس جہان سے رخصت ہو گئے اور اس دنیائے ناپائیدار کی حقیقت پر بڑا افسوس ہے کہ اس خاندان عالی، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ میں، جس میں بیسیوں عالم فاضل موجود تھے، اب ایک شخص بھی نہیں رہا۔ بالکل خاندان بھر کا خاتمہ ہو گیا"[1]

اگر اپنے مولویوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے حضرات کبھی حقیقت کو سامنے رکھ لیا کریں، کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہہ دیا کریں تو اس میں قباحت ہرگز نہیں بلکہ یہ حضرات اس غلط پروپیگنڈے کے باعث گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ گمراہی سے بچ جائیں اور عقیدت و عقیدہ کرنے والوں کے سروں پر کم از کم دوسروں کو گمراہ کرنے کا وبال تو نہ رہے۔

ع اے کاش ترے دل میں اتر جائے مری بات

کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مماثلت

وہابی علماء و مورخ ایک عرصے سے یہی شور مچاتے آ رہے ہیں کہ جب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی جب اپنے قافلے سمیت ۱۲۳۸ھ میں حج بیت اللہ کی غرض سے گئے تھے تو ان کی اصحاب محمد بن عبدالوہاب نجدی سے قطعاً ملاقات نہیں ہوئی تھی اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ۱۲۰۶ھ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس سے وہ حضرات بھولے بھالے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی پر وہابیت کا لیبل لگانا انصاف سے بعید اور برطانوی سازش ہے۔ وہابیت کی نسبت سے وہ حضرات فوراً سیخ پا ہو جاتے ہیں اور تحریر و تقریر میں اس نسبت کو برٹش گورنمنٹ کی شرارت قرار دینا ہی کافی و شافی جواب گردانتے ہیں۔

---

[1] محمد جعفر تھانیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۲۱۶

"بہر صورت اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ دہلوی صاحب اینڈ کمپنی کی قاضی شوکانی
ملاقات ہوئی تھی یا نہیں؟ اس بات سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ لفظ وہابیت کے استعمال
پر گورنمنٹ کی منشاء کو دخل ہے یا نہیں؟ ہمیں صرف یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ محمد بن
وہاب نجدی اور مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے عقاید و نظریات میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے
یہ؟ اسی امر کا جائزہ لینے کی خاطر ہم نجدی امام الوہابیہ کی کتاب التوحید صغیر کی بعض عبارتیں
یہ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) کی تصنیف لطیف
ف الجبار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور اُن کے بالمقابل مولوی اسمٰعیل دہلوی کی
ۃ الایمان سے عبارتیں پیش کرتے جائیں گے۔ ایسا کرنے سے ہماری غرض صرف یہی ہے کہ
ین کرام خود فیصلہ فرمالیں کہ نجدی و ہندی وہابیہ کے مذہبی خیالات اور کتاب التوحید و
ۃ الایمان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے یا پوری پوری مطابقت ہے؟
خیال رہے کہ کتاب التوحید صغیر وہی تصنیف ہے جسے نجدی امام الوہابیہ نے علمائے
ن کی خدمت میں بھیجا تھا اور اُن بزرگوں نے اِس خرافات کے پلندے کا وہی جواب دیا تھا
ی کے خادموں اور علم پیمبر کے وارثوں کو دینا چاہیے تھا۔ اب قارئین کرام دونوں کتابوں کی
لیں اور ان کے تیور ملاحظہ فرمائیں:

(۱)

کتاب التوحید صغیر	تقویۃ الایمان
اعلموا ان الشرك قد شاع في هذا الزمان وذاع والامر قد آل الى ما وعد الله وما آل دونا يومن اكثرهم بالله الا وهم مشركون۔	سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب لیکن اکثر لوگ شرک اور توحید کے معنی نہیں سمجھتے ...... سچ فرمایا اللہ صاحب نے سورۂ یوسف میں وما یومن اکثرھم باللہ

الا وهم مشركون۔[1]

(۲)

وظهر ما قال رسول الله لا تقوم
الساعة حتى تلتحق قبائل من
أمتي بالمشركين وحتى تعبد قبائل
من امتي الاوثان رواه الترمذي
وعن عائشة قالت سمعت رسول
الله يقول لا يذهب الليل والنهار
حتى تعبد اللات والعزّٰى
فقلت يا رسول الله ان كنت
لاظن حين انزل الله هو الذي
ارسل رسوله بالهدٰى و
دين الحق يظهره على الدين
كله ولو كره المشركون ان
ذٰلك سيكون تامًّا قال انه
سيكون ما شاء الله ثم يبعث
الله ريحًا طيبة فتوفى من
كان في قلبه حبة من خردل
من ايمان فيبقى من لا
خير فيه فيرجعون الى
دين ابائهم رواه مسلم

اللہ صاحب نے سورۂ براءۃ میں فرمایا
ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے ہدایت
اور سچا دین دے کر کہ اس کو غالب
کرے سب دینوں پر، اگرچہ مشرک
لوگ بہتیرا ہی برا مانیں، سو حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے سمجھا کہ
اس سچے دین کا زور قیامت تک رہے گا
سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ اس کا زور تو مقرر ہوگا جب تک
اللہ چاہے گا، پھر اللہ ایک ایسی
ایک باؤ (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے
بندے جن کے دل میں تھوڑا سا
بھی ایمان ہوگا مر جائیں گے اور
وہی لوگ رہ جائیں گے جن میں کچھ
بھلائی نہیں۔ یعنی خدا کی تعظیم اور
رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ
باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے
لگیں گے، سو اس طرح شرک میں

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۹، ۳۰

فانا نری عامة مومنی ھذا الزمان مشرکا۔

پڑجائیں گے، کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں۔ جو کوئی اُن کی راہ و رسم کی سند پکڑے، آپ بھی مشرک ہو جاوے[1]

(۳)

فقد ثبت بالنصوص القرآنیہ ان من اعتقد النبی وغیرہ ولیہ فھو و ابوجہل فی الشرک سواء۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی..... مگر یہی پکارنا، منتیں ماننی، نذر و نیاز کرنی، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، اگر اس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہیں۔[2]

(۴)

والشرك الاکبر ھو الاشراك فیما خصصه الله تعالیٰ بنفسه وھو کثیر فکنت نذکر شیئا منه لیقاس علیه غیرہ فنقول ھو اربعة اقسام۔ الاول الاشراك فی العلم یعنی اثبات مثل علم الله لغیرہ بکونه حاضرا

اب یہ بات تحقیق کی چاہیے کہ اللہ صاحب نے کون کونسی چیزیں اپنے واسطے خاص کر رکھی ہیں کہ اُن میں کسی کو شریک نہ کیا چاہیے۔ سو وہ باتیں بہت ساری ہیں مگر کئی باتوں کا ذکر کر دینا اور اُن کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنا ضرور ہے تا اور باقی باتیں اُن سے لوگ سمجھ لیں۔

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۲۸ [2] ایضاً، ص ۳۲، ۳۳

وناظراً في كل مكان ومطلعٌ على كل شيء وفي كل آن بعيدٌ كان أو قريباً خفياً كان أو جلياً فمن اعتقد أنه إذا ذكر اسم نبي فيطلع هو عليه لصار مشركاً وهذا الاعتقاد شرك سواء كان مع نبي أو ولي أو ملك أو جني أو صنم أو وثن وسواء كان يعتقد حصوله له بذاته أو بإعلام الله تعالى بأي طريق كان يصير مشركاً۔

سو اوّل بات یہ ہے کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا اور ہر چیز کی خبر برابر ہر وقت رکھنی، دور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں۔۔۔۔ یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔ سو جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے دور و نزدیک سے پکارا کرے ... اور یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہوں زبان سے یا دل سے۔۔۔ تو وہیں اُس کو خبر ہو جاتی ہے، اُس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔۔۔۔ سو ان باتوں سے مشرک ہو جاتا ہے۔۔۔ خواہ یہ عقیدہ انبیاء و اولیاء سے رکھے، خواہ پیر و شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ بھوت اور پری سے، پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ بات ان کو اپنی ذات سے ہے، خواہ اللہ کے دیے سے۔ غرض اس عقیدے سے ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔[۱]

(۵)

والثاني الاشراك في التصرف أعني إثبات مثل تصرف الله

دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادے سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا۔۔۔

۱؎ اسمعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۵، ۳۶

لغيره سواء اعتقد ان قدرة التصرف له بذاته تعالى او باعطاء الله تعالى۔

کا سا تصرف ثابت کرنا محض شرک ہے پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت ان کو خود بخود ہے خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے ان کو ایسی طاقت بخشی ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے۔[1]

(۶)

والثالث الاشراك فى العبادة اى تعظيم غير الله كتعظيمه اعنى الاعمال التى خصصها الله تعالى لتعظيمه مثل السجود و الركوع و التمثل قائما يقف عنده احدكما يقف فى الصلوٰة له والصوم له وشد الرحل الى بيته والتشكل الخاص بالاحرام والطواف والدعاء الى الله ضمنا والتقبيل والقاء الستور والمجاورة والتبرك بالماء والرجعة القهقرى وتعظيم حرمه وامثال ذلك فمن فعل بنبى او ولى او قبره او آثاره او مشاهده و ما

تیسری بات یہ ہے کہ جتنے کام تعظیم کے اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ اُن کو عبادت کہتے ہیں، جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے نام پر مال خرچ کرنا، اُس کے نام کا روزہ رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے قصد کر کے سفر کرنا...... اور رستے میں اُس مالک کا نام پکارنا، نامعقول باتیں کرنے اور شکار سے بچنا اور اسی قید سے جا کر طواف کرنا، اُس گھر کی طرف سجدہ کرنا، اُس کی طرف جانور لے جانے، وہاں منتیں ماننی، اُس پر غلاف ڈالنا، اُس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی ..... اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجاور بن کر اُس کی خدمت میں مشغول رہنا .....

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۹

يتعلق به شيئا من السجود والركوع وبذل المال له والصلوٰة له والصوم له والتمثل قائما وقصدا لسفر اليه والتقبيل و الرجعة القهقرى وقت التوديع وضرب الخباء وارخاء الستارة والستر بالثوب والدعا من الله ههنا و المجاورة والتعظيم حواليه واعتقاد كون ذكر غير الله عبادةً وتذكره فى الشدائد ودعاءه نحو يا محمد يا عبد القادر يا حداد يا سمان فقد صار مشركا كافرا بنفس هذه الاعمال سواء اعتقد استحقاقه لهذا التعظيم لذاته اولا۔

اس کے کنویں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لے جانا، رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنا ۔۔۔ پھر جو کوئی کسی پیر پیغمبر کو یا بھوت پری کو یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو یا کسی کے تھان کو ۔۔۔۔ سجدہ کرے یا رکوع کرے یا اس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو یا جانور چڑھائے یا ایسے مکانوں میں دور دور سے قصد کر کے جائے ۔۔۔۔ چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ رہے رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلے، وہاں کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے، سو اس پر شرک ثابت ہوتا ہے۔ اس کو اشراک فی العبادہ کہتے ہیں، یعنی اللہ کی سی کسی کی تعظیم کرنی۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اس تعظیم کے لائق ہیں یا یوں سمجھے کہ ان کی اس طرح کی تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اس تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول دیتا ہے، ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے[1]

---

[1] اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۶ تا ۳۸

(۷)

الرابع الاشراك في العادة اعني
تعظيم الشيوخ في افعال عادة
مما يجب لله تعالى مثل الحلف
باسم الله تعالى والتسمية
بعبد الله واخلاص النذور
والصدقات لله وامثال
ذلك فمن حلف بغير الله
او سمى ولده عبد الرسول او
عبد النبي او نذر لغير
الله او تصدق لغير الله او
قال نذر الله ورسوله و
صدقة الى الله ورسوله
فقد صار مشركاً كافراً
وجب[illegible] الاقسام الاربعة
والتي جميعها ذكرت كلها بالآيات
والاحاديث في الفصول الآتية.

چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے
بندوں کو سکھایا ہے کہ اپنے دنیا کے کاموں
میں اللہ کو یاد رکھیں اور اُسی کی تعظیم کرتے
رہیں تاکہ ایمان بھی درست ہو اور اُن کاموں
میں بھی برکت ہو جیسے اڑے کام پر اللہ کی
نذر ماننی، مشکل کے وقت اُسے پکارنا،
ہر کام کا شروع اُس کے نام سے کرنا...
پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں،
شہیدوں کی، بھوت پری کی اِس قسم کی
تعظیم کرے جیسے اڑے وقت پر اُن کی نذر
مانے، مشکل کے وقت اُن کو پکارے....
اپنی اولاد کا نام عبد النبی، امام بخش، پیر بخش
رکھے..... سو ان سب باتوں سے شرک
ثابت ہوتا ہے اور اِس کو الشرک فی العادۃ
کہتے ہیں یعنی اپنی عادت کے کاموں میں
جو اللہ کی تعظیم کرنی چاہیے اسے غیر کی کرے[1]

(۸)

فصل اثنا في رد الاشراك
في العلم

اِس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں
کا ذکر ہے جن سے اشراک فی العلم کی
برائی ثابت ہوتی ہے[2]

---

[1] ...یل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۸، ۳۹ [2] ایضاً، ص ۵۳

(۹)

فمن اثبتہ لغیرہ نبیاً کان او ولیاً صنماً او وثناً ملکاً او جنیاً فقد اشرك باللہ۔

اور جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جن اور فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور شہید کو یا نجومی اور رمال کو ..... یا بھوت اور پری کو ایسا جانے اور اُس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے[1]

(۱۰)

وعن عائشۃ قالت من اخبر لك ان محمداً یعلم الخمس التی قال تعالیٰ ان اللہ عندہ علم الساعۃ الایۃ فقد اعظم الفریہ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: جو کوئی خبر دے تجھ کو کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے وہ پانچ باتیں کہ اللہ نے ذکر کی ہیں ان اللہ عندہ علم الساعۃ (الآیۃ) سو بے شک اُس نے بڑا طوفان باندھا۔[2]

(۱۱)

الفصل الثالث فی رد الاشراك فی التصرف۔

اس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر ہے جن سے اشراک فی التصرف کی برائی ثابت ہوتی ہے۔[3]

(۱۲)

والانبیاء اذا یأمرھم اللہ بشیءٍ یخافون ولا یستطیعون

اُس کے دربار میں ان کا تو یہ حال ہے کہ جب وہ حکم فرماتا ہے، یہ سب رعب میں

---

۱ اسمٰعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۴
۲ ایضاً: ص ۹۱
۳ ایضاً: ص ۹۲

تعنتًا في حكم السؤال عنه ثانيًا۔

آگے بے حواس ہو جاتے ہیں۔ ادب اور دہشت کے مارے دُوسری بار اُس بات کی تحقیق اُس سے نہیں کر سکتے۔ ؎

(۱۳)

فإنها لا تكون الا بان يكون الشفيع وجيها فشفاعة المشفوع اليه من عدم قبول شفاعته فوات مطالب مهمة بوجوه من الشفيع لكونه ظهيرًا ومعاونًا۔

مگر اُس امیر سے دب کر اُس کی سفارش مان لیتا اور چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ امیر اُس کی سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اُس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے۔ سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک جگہ اپنے غصہ کو تھام لینا اور ایک چور سے درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے بڑے امیر کو ناخوش کر دیجئے کہ بڑے بڑے کام خراب ہو جاویں اور سلطنت کی رونق گھٹ جاوے۔ ؎

(۱۴)

وإما بأن يكون الشفيع محبوبًا فيتألم من عدم رضاه وهذان مستحيلان في شأنه تعالى عما يصفون۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہزادوں میں سے یا بیگمات میں سے یا کوئی بادشاہ کا معشوق اُس چور کا سفارشی ہو کر کھڑا ہو جائے اور چوری کی سزا نہ دینے دے۔ بادشاہ اس کی محبت سے

اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان : ص ۶۲

ایضاً : ص ۶۳

لاچار ہو کر اُس چور کی تقصیر معاف کر دے
تو اس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں یعنی
بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش
قبول کر لی اور وہ یہ بات سمجھا کر ایک بار
غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا
بہتر ہے اُس رنج سے کہ جو اُس محبوب
کے رُوٹھ جانے سے مجھ کو ہو گا۔ [1]

(۱۵)

واما الشفاعة بالاذن التي كلا
شفاعة وهو المذكور في
القرآن والحديث فما لها
انها لا تكون لاهل الكبائر
الذين ماتوا بلا توبة ولا
للمصرين۔ ... وحكيمة
الشفاعة ان الحكيم العدل
لما يرى من عبده توبة و
ندامة وانابة اليه لا الى
غيره يرحم عليه و يمكن
حكمه وفعله كله عدل ✓
يشوبه جور وظلم فلا يستقيم
العفو بلا سبب وان عفا عنه

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی چوری تو ثابت
ہو گئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں..... مگر
نفس کی شامت سے قصور ہو گیا۔ جو
اُس پر شرمندہ ہے۔ رات دن ڈرتا ہے
..... بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر وزیر
کی پناہ نہیں ڈھونڈتا..... رات دن اُس
کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھیے میرے حق
میں کیا حکم فرمائے۔ سو اُس کا یہ حال
دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اُس پر ترس
آتا ہے، مگر آئینِ بادشاہت کا خیال
کر کے بے سبب درگزر نہیں کرتا کہ
کہیں لوگوں کے دلوں میں اُس کے
آئین کی قدر گھٹ نہ جائے۔ سو کوئی امیر وزیر

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۶۸، ۶۹

ويغفر له بلا سبب اختل قاعدة العدل وانتقص شان حكمه فی اعين الناظرين ويحاجونه فيأذن لمن يشاء ان يشفع له فيشفع فيعفو الى الحقيقة برحمته وفي الظاهر باسم شفاعة الشفيع حفظاً لقاعدة۔	اُس کی مرضی پا کر اس تقصیروار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اُس امیر کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اُس کی سفارش کا نام کرکے اُس چور کی تقصیر معاف کردیتا ہے ..... سو اللہ کی جناب میں اس قسم کی شفاعت ہوسکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اُس کے معنی یہی ہیں۔ [۱]

—(۱۶)—

الى ان قال يا فاطمة انقذی نفسك من النار سليني من مالي ما شئت فاني لا اغني عنك من الله شيئا انظروا قطع النبي قرابته حتی بنته من نفعه لهم عند الله فالی الاجانب يرجون شفاعته لهم عند الله۔	سو انھوں نے سب کو، اپنی بیٹی تک کو کھول کر سنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اُسی چیز میں ہوسکتا ہے کہ اپنے اختیار میں ہو، سو یہ میرا مال موجود ہے، اس میں مجھ سے کچھ بخل نہیں۔ اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کرسکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔ سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا درست کرے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرے۔ [۲]

—(۱۷)—

الفصل الرابع فی رد الاشراك	سو اس فصل میں مذکور ہے کہ قرآن و

---

[۱] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۶۹، ۷۰
[۲] ایضاً، ص ۷۶

فی العبادۃ۔	حدیث میں اللہ کی تعظیم کے لوگوں کو کون کون سے کام بتائے ہیں تاکہ اور کسی کے لیے وہ کام نہ کیجیے کہ شرک لازم آئے۔ لہ

(۱۸)

ولا یغتر بسجدۃ الملئکۃ لآدم ویعقوب بیوسف کما یقولہ الجاھل فانہ صار منسوخاً کالنکاح مع الاخت۔	جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو تو ہم بھی اگر کسی بزرگ کو کریں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات غلط ہے آدم کے وقت سے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کر لیں۔ لہ

(۱۹)

ثبت بھذہ الآیۃ ان السفر الیٰ قبر محمد ومشاھدہ ومساجدہ و اثارہ وقبر نبی وولی وسائر الاوثان وکذا طوافہ وتعظیم حرمہ وترك الصید والتحرز عن	سو اس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کیلئے نہ کیا چاہئیں۔ کسی کی قبر پر یا چلے پر یا کسی کے تھان پر دور دور سے قصد کرنا سفر کی رنج و تکلیف اٹھا کر، میلے کچیلے ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانور چڑھانے منتیں پوری کرنی، کسی قبر یا مکان کا طواف کرنا

لہ اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۷۷   لہ ایضاً، ص ۸۰

قطع الشجر وغيرها شرك اشركه بان الله تعالى خصص هذه الامور لذاته و نزل هذه الآية لبيانه۔	اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اُکھاڑنا اور اسی قسم کے کام کرنے اور اُن سے کچھ دین و دنیا کے فائدہ کی توقع رکھنا، یہ سب شرک کی باتیں ہیں، اِن سے بچنا چاہیے۔[1]

(۲۰)

الفصل الخامس في رد الاشراك في العادة۔	اِس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دنیا کے کاموں میں جیسا معاملہ اللہ سے رکھتا ہے اُس کی تعظیم طرح طرح سے کرتا ہے ویسا ہی معاملہ اور کسی سے نہ کرے۔[2]

(۲۱)

عن قيس ابن سعد قال اتيت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم فقلت يا رسول الله انت احق ان يسجد لك قال ارأيت لو مررت بقبري اكنت تسجد له فقلت لا قال	ابو داؤد نے ذکر کیا کہ قیس بن سعد نے نقل کیا کہ گیا میں ایک شہر میں جس کا نام حیرہ ہے۔ سو دیکھا میں نے وہاں کے لوگوں کو کہ سجدہ کرتے تھے اپنے راجہ کو۔ سو کہا میں نے البتہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ لائق ہیں کہ سجدہ کیجیے اُن کو۔

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۸۰

[2] ایضاً ص ۹۱

لا تفعلوا اخرجه ابوداؤد انظروا
اعتذر النبی صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وآلہ وسلم بمنع
السجود بکونہ رمۃ فی قبرہ۔

پھر آیا میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے
پاس۔ پھر کہا میں نے، گیا تھا میں حیرہ کو،
سو دیکھا میں نے اُن لوگوں کو کہ سجدہ کرتے
تھے اپنے راجہ کو، سو بہت لائق ہو کہ
سجدہ کریں ہم آپ کو۔ تو فرمایا مجھ کو، بھلا
خیال تو کر جو تو گزرے میری قبر پر کیا
تو سجدہ کرے اُس کو؟ میں نے کہا نہیں
فرمایا تو مت کر ایسا۔ یعنی میں بھی ایک
دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ
کے لائق ہوں۔ [1]

یہ چند عبارتیں بطور نمونہ بالتقابل پیش کر دی ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کے نقطۂ نظر میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ہندی امام الوہابیہ نے نجدی امام الوہابیہ کے عقاید و نظریات ہی کو پیش کیا ہے اور تقویۃ الایمان حقیقت میں کتاب التوحید صغیر ہی کا ترجمہ اور شرح ہے جیسا کہ مذکورہ عبارتوں سے واضح ہے۔ علاوہ بریں تقویۃ الایمان کے باب فصل اور جملہ آیات و احادیث وہی ہیں جو کتاب التوحید صغیر میں ہیں۔ ان حالات میں مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کو مذہب اہلسنت و جماعت کا پیروکار اور اپنے خاندانی بزرگوں مثل شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ/۱۷۱۸ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء)، شاہ عبدالقادر دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) اور شاہ رفیع الدین دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کا متبع سمجھا جائے یا محمد بن عبدالوہاب نجدی کی خارجیت و وہابیت کا مبلغ مانا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسمٰعیل

---

[1] اسمٰعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۱۱۱، ۱۱۲

...یوی کا مذہب اہلسنت وجماعت کو ترک کرنا ایک اٹل حقیقت ہے جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور
...ن کا مبلغ خارجیت ووہابیت ہونا ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ان حالات میں
...ضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی نے فریاد المسلمین کے صفحہ ۹ سے فخر خاندانِ دہلی
...ہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو بیان متعلقہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے نقل فرمایا ہے
...اصل حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب موصوف نقل کرتے ہیں:

"میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو کہ جو کتاب (کتاب التوحید) بمبئی سے
آئی ہے، میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے، اُس کے عقائد صحیح نہیں ہیں بلکہ وہ
بے ادبی اور بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔ میں آجکل بیمار ہوں۔ اگر صحت
ہو گئی تو میں کتاب التوحید کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم (مولوی محمد اسمٰعیل)
ابھی نوجوان بچے ہو، ناحق شور وشر برپا نہ کرو۔"[1]

چونکہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان ایک ہی چیز یا ایک ہی مضمون کے دو نام ہیں،
جو کچھ شاہ عبد العزیز علیہ الرحمہ نے کتاب التوحید کے بارے میں فرمایا یہی آپ کا نظریہ
تقویۃ الایمان کے بارے میں ہونا چاہیے، یعنی:

۱۔ تقویۃ الایمان کے عقاید بھی صحیح نہیں ہیں۔

۲۔ تقویۃ الایمان بے ادبی اور بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔

۳۔ اگر آپ صحت مند ہو جاتے تو کتاب التوحید کی طرح تقویۃ الایمان کے رد کا ارادہ
ظاہر فرماتے۔

۴۔ تقویۃ الایمانی عقاید ونظریات کی نشر واشاعت کرنا حقیقت میں ناحق شور وشر
برپا کرنا ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

الوہابیہ کا اقراری کفر مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے مشکوٰۃ شریف کے باب
لا تقوم الساعۃ الا علیٰ اشرار الناس سے ایک

---

[1] فضل احمد، الفیۃ فتاب صداقت، جلد اوّل، ص ۱۱۵

حدیث نقل کی جس کا ترجمہ موصوف کے لفظوں میں یہ ہے :

"مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہ، سُنا میں نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے، نہیں تمام ہونے کی رات اور دن یعنی قیامت نہ آئے گی یہاں تک کہ پوجیں لات اور عزیٰ کو، سو کہا میں نے اے پیغمبرِ خدا! بیشک میں جانتی تھی کہ جب اتاری اللہ نے یہ آیت هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی الخ کہ بیشک یوں ہی رہے گا آخر تک۔ فرمایا، بے شک ہوگا اسی طرح جب تک چاہے گا اللہ، پھر بھیجے گا اللہ ایک باؤ اچھی، جان نکال لے گی جس کے دل میں ہوگا ایک رائی کے دانہ بھر ایمان، سو رہ جاویں گے وہی لوگ کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ سو پھر جاویں گے اپنے باپ دادوں کے دین پر۔"[1]

اس حدیث پر موصوف نے جو حاشیہ چڑھایا ہے اُس کا درج ذیل حصہ قارئین بغور ملاحظہ فرمائیں دیکھیں کہ اس کی تہ میں کون سا جذبہ کار فرما ہے۔ موصوف نے لکھا ہے،

"سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا زور تو مقرر ہوگا، جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی ایک باؤ (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے بندے جن کے دل میں تھوڑا سا بھی ایمان ہوگا، مر جاویں گے اور وہی لوگ رہ جائیں گے کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں، یعنی نہ اللہ کی تعظیم، نہ رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے لگیں گے۔ سو اس طرح شرک میں پڑ جائیں گے کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں۔ جو کوئی اُن کی راہ و رسم کی سند پکڑے، آپ بھی مشرک ہو جاوے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخر زمانہ میں قدیم شرک بھی رائج ہوگا۔ سو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق ہوا۔"[2]

---

[1] محمد اسمٰعیل دہلوی : تقویۃ الایمان، ص ۸۶، ۸۷
[2] ایضاً، ص ۸۷، ۸۸

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر سامنے آتے ہیں:

۱۔ پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مذکورہ ہوا چل چکی ہے۔
۲۔ جن کے دل میں تھوڑا سا ایمان بھی تھا وہ سارے مر چکے ہیں۔
۳۔ اب صرف وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جن میں بھلائی کا نشان بھی نہیں۔
۴۔ اب مسلمان کہلانے والے بھی شرک میں پڑ چکے ہیں۔
۵۔ باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے کے باعث مسلمانوں میں قدیم شرک بھی رائج ہو گیا ہے۔

موصوف کی اس تصریح و تشریح کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو خود مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی اور ان کے سارے متبعین کو بھی مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اُن کی تحقیق یہی ہے کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان تھا وہ مر گئے اور مشرک ہی مشرک باقی رہ گئے ہیں۔ بہر حالات یہ دہلوی صاحب کا اقراری کفر قرار پاتا ہے۔ پس مولوی اسمٰعیل صاحب کو سچا ماننے کی صورت میں سارے وہابیوں کو امام الوہابیہ سمیت مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے اور انہیں مشرک نہ کہا جائے تو مصنف تقویۃ الایمان کو جھوٹا، دروغ گو اور مکفر المسلمین ماننا پڑ جائے گا۔ یہ وہابی حضرات کی اپنی پسند ہے کہ دونوں میں سے وہ کس راستے کو پسند کرتے ہیں۔

کاش! دہلوی صاحب کے متبعین کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا فرما لیں کہ وہ اور ان کے امام صاحب اس زمین کے پردے کے علاوہ تحت الثریٰ میں تو بستے نہیں تھے کہ اور کہیں رہتے ہیں کہ شرک کے اس عالمگیر فتوے کی زد سے بچ جائیں۔ لامحالہ یہ خود مشرک ہونے کا اقرار ہے۔ مسلمانوں کو بات بات پر بلا وجہ مشرک ٹھہرانے کی قدرت نے یہی سزا دی کہ موصوف نے خود اپنا اور اپنے متبعین کا مشرک ہونا تسلیم کیا جو آج تک مشتہر ہوتا آ رہا ہے۔ كَذَٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

۲۔ فرقہ اہلحدیث کی تخریب کاری

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے محمدی گروہ نے جب حالات کے تحت تین قسم کی ٹولیاں
بنا لیں تو موصوف کی اصل جماعت کچھ عرصہ موحّد کہلاتی رہی لیکن بعد میں اہلحدیث کے نام
مشہور ہونا شروع کر دیا۔ وہابیوں کی تینوں میں سے اِس اوّلین جماعت کی باقاعدہ سرپرستی
اور گروہی تنظیم میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) نے کی۔ مولوی محمد حسین
بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) اُن کے سیاسی اور مذہبی دستِ راست تھے۔ اِس
جماعت کے افراد کا انگلیوں پر گنا جانا وہابیت کے پاک و ہند میں غیر مقبول ہونے کی
بہت بڑی شہادت ہے، جس کے باعث دیگر پُراسرار وہابی جماعتیں کھڑی کی گئیں۔

جماعت کا اہلحدیث نام

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی بانی وہابیت نے اپنی جماعت کا
نام محمدی گروہ رکھا تھا۔ مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ
واقعی یہ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیروکار ہونے کے باعث محمدی ہی تو ہیں۔ وہابی حضرات
نے اس نسبت کو چھپانے کی غرض سے خود کو موحّدین کہنا شروع کر دیا۔ مسلمانانِ اہلسنت و
جماعت کہتے کہ واقعی یہ منکرینِ شانِ رسالت ہونے کے باعث سکھوں کی طرح پُرانے موحّد
ہی تو ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو میاں نذیر حسین دہلوی کی سرکردگی میں مولوی محمد حسین
بٹالوی نے اپنی مہربان سرکار سے درخواست کی کہ مسلمانانِ ہند آپ کے اس خود کاشتہ
نجدی پودے کو وہابی کہتے ہیں۔ انھیں قانونی طور پر اس نام سے روکا جائے اور ہماری
جماعت کا نام سرکاری طور پر اہلحدیث رکھ دیا جائے۔ گورنمنٹ نے جو جواب دیا وہ پروفیسر
محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"انھوں (مولوی محمد حسین بٹالوی) نے ارکانِ جماعتِ اہلحدیث کی ایک
دستخطی درخواست لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے ذریعے سے وائسرائے ہند
کی خدمت میں روانہ کی۔ اس درخواست پر سرِ فہرست شمس العلماء میاں
نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی

تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسب ضابطہ منظوری آ گئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے اہلحدیث کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے اِس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اِسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۱۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۵، اور گورنمنٹ یو۔پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی۔پی۔ کی طرف سے ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف سے ۱۴ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۳۲، اِس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین کو ملی۔[1]

یہ ہے ان حضرات کے اہل حدیث ہونے کی کل کائنات۔ یہ چور دروازہ مسلمانوں کو دو طرح سے دھوکا دینے کی خاطر ایجاد فرمایا گیا تھا۔ اولاً اِس لیے کہ مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ لوگ حدیث سے محبت ہی لگاؤ رکھنے کے باعث خود کو اہلحدیث کہتے ہیں۔ ثانیاً اس غرض سے کہ محدثین حضرات پہلے تصانیفِ علمائے کرام میں لفظِ اہلحدیث بھی عام استعمال ہوتا رہا ہے، لہٰذا ان سے مسلمانوں کو دھوکا دینا آسان ہو جائے گا کہ صاحبو! ہماری جماعت کوئی نوزائیدہ یا انگریز کا خود کاشتہ پودا تو نہیں بلکہ ہمارے گروہ کا نام تو بڑے بڑے علمائے اعلام تصانیفِ عالیہ میں بھی اوائل زمانہ ہی سے مذکور ہوتا آیا ہے۔ یہ ہے ان حضرات کے مذکورہ ل۔ سے

دیکھو تو دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

یازی نشانات

یہ جماعت چونکہ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کے متبعین و معتقدین کی پہلی جماعت ہے اِس لیے موصوف کے تمام عقاید و نظریات

---

[1] محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، ص ۲۶

اور مخصوص افعال پر بڑی شدت سے کاربند ہے ۔ اپنے پیشوا کے فیصلے کو قرآن وحدیث کے
صریح خلاف دیکھتے ہوئے بھی ہرگز اُسے غلط یا قابلِ ترمیم تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے
بلکہ آیات واحادیث کے مفہوم ومطالب میں ہزار کھینچاتانی کر کے اُس کے موافق دکھانے
کی کوشش کریں گے ۔ ان کے مذہب کا اصل ماخذ تقویۃ الایمان ہے ۔ قرآن وحدیث کا
دوسرا اور تیسرا درجہ حاصل ہے جنھیں تقویۃ الایمانی نظریات کی تائید میں پیش کر کے مسلمانوں
اپنی حقانیت کا اعتراف کروانے میں شب وروز کوشاں رہتے ہیں ۔ ان حضرات کے
مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے اپنی تقویۃ الایمان میں جو کچھ لکھا ہے ، اُس میں سے کسی بات
تسلیم کرنا تو ہزاروں منزل دور کی بات ہے ، کسی بات کو قابلِ ترمیم اور کمزور مان لینا بھی گو
نہیں ، خواہ قرآن وحدیث کے کتنے ہی واضح نصوص اُس کے خلاف کیوں نہ پیش کر دیئے
جیسے یہود کے اندر شخصیت پرستی کی یہی مثالیں موجود تھیں ، جن کے بارے میں ارشاد
باری تعالیٰ ہے :

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ [۱]	کو اللہ کے سوا رب بنا لیا

موصوف کو رب کا درجہ دینے کے شرک میں مبتلا ہونے کے باعث ان حضرات کو
مسلمان مشرک ہی نظر آتے ہیں جیسے ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے ۔ جس طرح
سامری کے بچھڑے کی محبت سے بعض یہود کے قلوب لبریز ہوگئے تھے ، اسی طرح دہلوی
موصوف کی عقیدت کا سمندر ہر وہابی صاحب کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے
انتہائی وابستگی کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کے کسی نظریے کے خلاف بیسیوں
آیتیں یا سینکڑوں حدیثیں پیش کر کے کسی وہابی عالم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے
آیات واحادیث کے مفہوم ومعانی میں وہ تاویلیں کرنے اور تقویۃ الایمانی نظریے کے
دکھانے پر تو ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دے گا لیکن امام الوہابیہ کے اُس نظریے کے قابل

---

[۱] پ ۱۰ ، سورہ التوبہ ، آیت ۳۱

ے کا تصور اُس کے دماغ کے کسی بھی گوشے میں پیدا نہیں ہوگا۔ دہلوی صاحب کے نظریات
داخل ہوئے پر اِن کے نزدیک نزاکت و احادیث اثر انداز ہو سکتی ہیں نہ کوئی اور چیز۔ یہ ہے
حضرات کے دلوں کا وہ جذبہ جو انھیں مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے مناہمت کرنے اور
وت کو مٹانے پر کسی بھی وقت آمادہ نہیں ہونے دیتا۔

لی توحید یہ حضرات اپنے امام علی الاطلاق یعنی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی بتائی ہوئی
اسی خارجی توحید کو طرۂ امتیاز بنائے ہُوئے ہیں، جس کی مخالفت کے
ث خوارج نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کافر و مشرک ٹھہرایا تھا۔ زمانۂ
ں کے خارجیت زدہ حضرات کو بچے مسلمان بھی اسی طرح کافر و مشرک نظر آتے ہیں۔ امام
ابیہ نے تو ایضاح الحق وغیرہ میں ایک دو جگہ تجسیم کا نظریہ پیش کیا تھا لیکن اہل حدیث
نے والے حضرات نے اس سبوح و قدوس کو مجسّم منوانا ڈنکے کی چوٹ جاری رکھا ہوا ہے
غیر وہابیہ کے مسلّم عالم مولوی وحید الزمان خاں حیدرآبادی نے اپنے ترجمۂ قرآن میں
وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کے حاشیے پر ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے
لکھا ہے:

جب کرسی پر بیٹھتا ہے تو چار انگل بھی بڑی نہیں رہتی ہے اور اُس کے
بوجھ سے چرچر کرتی ہے۔[۱]

مولوی وحید الزمان خاں صاحب بعض آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔[۲] — پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا اور سات آسمان ہموار کیے۔[۳]

وحید الزمان خاں، مولوی، محشی و مترجم قرآنِ مجید، ص ۶۰

پ ۱ سورہ البقرہ، آیت ۲۹

وحید الزمان خاں، مولوی، تبویب القرآن، ص ۴

اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی[1] وہ بڑے رحم والا تخت پر چڑھا۔[2]

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔[3] پھر تخت پر جا بیٹھا۔[4]

یہ کرسی پر بیٹھنا اور کرسی کا اس کے بوجھ سے چرچر کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ
اللہ رب العزت کو مجسم مانتے ہیں جس کا وزن ہے اور اس کے بوجھ کو کرسی اٹھا لیتی
بلکہ چرچر کرنے لگتی ہے۔ وہ ان حضرات کے نزدیک عرش پر چڑھتا اور بیٹھتا ہے۔ کاش
حضرات کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ ہر مجسم حادث ہوتا ہے اور حادث خدا
ہو سکتا۔ اس طرح یہ حضرات توحید کے ٹھیکیدار بنتے ہوئے بھی شرعاً منکرِ الوہیت قرا
اگر یہی غور فرمالیں کہ جو ذات کرسی و عرش میں سما جاتی ہے اس کا وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ
ہونا کس طرح مانتے ہیں؟

عقیدۂ رسالت یہ حقیقت ہے کہ خارجیت و وہابیت عقیدۂ رسالت کے خلا
کھلا ہوا چیلنج ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بدقسمتی سے تو
کا نام توحید ہے۔ وہابیہ کا مخصوص میدان تنقیص شانِ رسالت ہے۔ ان حالات
دیگر انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی توہین کرنا ضمنی معاملہ ہے کیونکہ جو صفات
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات والاصفات میں تسلیم نہیں کرتے تو ان کا حصول
مقربینِ بارگاہِ الٰہیہ کے لیے کس طرح مان لیں؟ یہ حقیقت ہے کہ وہابی حضرات
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے ہیں
دیگر مذاہب والے غیر مسلموں کو بھی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی نے
میں شانِ رسالت کے خلاف جن انتہائی گستاخانہ نظریات کی تبلیغ کی ہے، ان
دین کا رکنِ اعظم یہی توہینِ مصطفیٰ ہے، جس پر ڈیڑھ سو سال سے ڈٹے ہوئے

---

[1] پ ۱۶، سورۂ طٰہٰ، آیت ۵ [2] وحید الزماں خاں، تبویب القرآن، ص

[3] پ ۱۹، سورۃ الفرقان، آیت ۵۹ [4] وحید الزماں خاں، تبویب القرآن، ص